قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

دسمبر 2021 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ **بچوں کی دنیا** دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

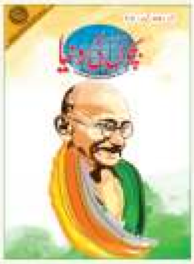

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی–110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: magazines@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ اردو دنیا دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد: 23، شمارہ: 12، دسمبر 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومت ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔ 110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in

شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔ 500002

فون: 040-24415194

سرورق خطاطی: محمد احرار ہندی

مشمولات

اداریہ

ہماری بات — 4

خطوط

ربط والتفات — قارئین کے خطوط — 5

ادب: زاویے اور جہات

مچھلی شہر کی علمی شہریاری دلی کا ایک گمنام شاعر — عبدالحق — 8

منوہر لال ہادی تمل ادب کا خلیل جبران — کرامت علی کرامت — 12

کوی کو عبدالرحمٰن — حیات افتخار — 16

اردو میں بین العلومی تنقید — نیاز سلطانپوری — 19

زبان و تعلیم

ہمارا تعلیمی اور نظام بدلتا ہوا تکنیکی منظرنامہ — محمد احسن — 21

مساوات پر مبنی تعلیم اور قومی تعلیمی پالیسی 2020 — بختیار احمد — 23

پریم چند اور تعلیم و تدریس — محمد عظمت الحق — 27

اٹل جی کی یاد میں

بھارت رتن اٹل بہاری واجپئی — پی پی سریواستو رند — 31

اٹل بہاری واجپئی: دانش ہند کا شاعر — جگموہن سنگھ — 33

نگر نگر اردو

ودربھ کی خواتین افسانہ نگار — محمد اسد اللہ — 36

سلسلۂ صحافت

مہر نیم روز — پرویز عادل ماحی — 40

یاد رفتگاں

آہ بلبل دکن فاطمہ پروین — نشاں زیدی — 42

اپنی ذات میں انجمن: خلیق انجم — تجمل حسین — 44

شمس و قمر

ل احمد اکبر آبادی — ارشاد احمد خان — 47

فائز دہلوی کے کلام میں مقامی رنگ — نفاست کمالی — 50

خصوصی گفتگو

موجودہ تحقیقی نظام نہایت لچر ہے: ابرار رحمانی — غلام علی اخضر — 53

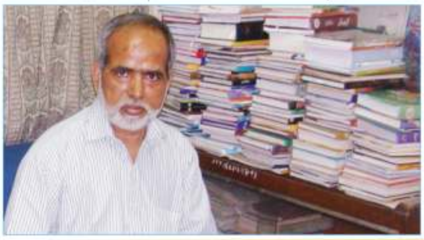

نیا آسمان نئے ستارے

تذکرہ حسینی کی ادبی اور انتقادی ارزش و اہمیت — غزالہ حفیظ — 57

اردو شاعری میں جذبہ امن و انسان دوستی — پھلیل سنگھ — 60

حامدی کاشمیری کی اکتشافی تنقید نظری اساس — مسعود احمد — 63

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ — 67

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ — 80

ہماری بات

2021 بھی ادبی دنیا کے لیے کرب انگیز سال رہا۔ کورونا کی وجہ سے پوری کائنات متاثر رہی، افراد کی زندگی اور معاشرے پر اس کے منفی اثرات پڑے۔ مگر اسی منفیت سے ایک مثبت طرزِ فکر اور رویے نے بھی جنم لیا، بہت سے متبادل راستے بھی نکل آئے۔ خاص طور پر جدید ٹیکنالوجی کی اہمیت اور افادیت کا ایک وسیع تر تصور سامنے آیا۔ آن لائن تعلیم و تدریس کی راہیں ہموار ہوئیں اور مشکل حالات میں بھی جینے کا ایک نیا ہنر ہاتھ آیا۔ گو کہ کورونا عہد میں گلیاں ویران اور شہر سنسان تھے مگر بہت سے تخلیقی ذہنوں کی دنیا آباد اور شاداب رہی۔ انھوں نے کورونا جیسے مشکل حالات میں وقت کا صحیح استعمال کیا جس کے نتیجے میں بہت سی فکر انگیز تحریریں وجود میں آئیں۔ یقینی طور پر کورونا کی وجہ سے ایک بہت بڑے المیے نے جنم لیا جس کا اثر صرف ایک ملک، ایک قوم، ایک معاشرے پر نہیں بلکہ پوری دنیا پر پڑا اور دنیا نے یہ محسوس کیا کہ اس طرح کی وبائیں انسانی زندگی کے لیے کتنی خطرناک ہوتی ہیں۔ سوان وباؤں سے نجات کی صورتیں بھی تلاش کی گئیں اور اس کے نتیجے میں صحت کے تئیں بیداری کا ایک نیا جذبہ بھی پیدا ہوا۔ ہمیں دوسروں کی زندگی کے درد و کرب کا بھی صحیح طور پر پتہ چلا کہ اس کورونا عہد میں کس کرب سے لوگوں نے زندگی بسر کی اور کس طرح انھوں نے اپنے اعزا و اقربا کی وفات پر اپنی آنکھوں میں آنسو جذب کیے۔ ہر ایک شخص غم زدہ تھا، صرف اپنا غم نہیں دوسروں کے غم نے بھی لوگوں کو اداس رکھا اور اس طرح لوگ ایک دوسرے سے دوریوں کے باوجود جذباتی اور ذہنی قربت محسوس کرنے لگے۔ شاید قدرت بھی اس طرح کی وباؤں کے ذریعے انسانوں کو آزماتی ہے اور اس کی انسانیت کو پرکھتی ہے۔ شکر ہے کہ اس اندوہناک موقعے پر بہت سے لوگوں نے انسانیت پسندی کا ثبوت دیا اور یہ احساس دلایا کہ چاہے دنیا مختلف ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہو، مگر مجموعی طور پر پوری دنیا کا درد ایک جیسا ہے، کورونا نے پوری دنیا کو درد کے ایک رشتے میں جوڑ دیا۔ باہمی تنازعات کے باوجود اکثر ممالک نے ایک دوسرے کی طرف دستِ تعاون بڑھایا اور انسانی ہمدردی کا ثبوت دیا۔ یقیناً اسی انسانیت کی بقا ہمارے لیے سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے۔

کورونا نے ہماری آنکھوں کو آنسوؤں کا سمندر بنا دیا۔ یقیناً یہ ایسا منظر تھا جو ناقابلِ برداشت تھا، اس منظر نے نہ جانے کتنی داستانوں کو جنم دیا، کتنے افسانے لکھے گئے، کتنی تحریریں وجود میں آئیں مگر حقیقت میں کوئی بھی داستان، کوئی بھی افسانہ، کوئی بھی تحریر شاید ہی اس منظر کو صحیح طور پر قید کر سکے جس کو ہماری آنکھوں نے دیکھا اور روح نے محسوس کیا۔

کورونا کے عہد میں ایک بڑا المیہ یہ بھی ہوا کہ بہت سی اہم شخصیتیں اس دنیا کو الوداع کہہ گئیں۔ وہ شخصیتیں جو خوشبو، روشنی اور تحرک کا استعارہ تھیں، جن سے کائنات میں روشنی تھی، جن کے افکار و خیالات ہمارے لیے مشعلِ راہ تھے، جنھوں نے انسانی زندگی پر بہت مثبت اثرات مرتب کیے تھے، جن کی تحریروں میں قلب و نظر کو تبدیل کرنے کی بڑی قوت تھی اور جن کے تصور سے صحیح معنوں میں زندگی کو جلا ملتی تھی، وہ چہرے گم ہو گئے تو یقینی طور پر اس کا افسوس پوری دنیا کو ہوا کیونکہ یہ محض چہرے نہیں تھے بلکہ ان سے بہت سی ادبی، تہذیبی، ثقافتی اور علمی قدریں بھی جڑی ہوئی تھیں، ان شخصیات نے معاشرت اور ثقافت کو نئے آداب اور طور و طرز سکھائے تھے، ان کے ذہنوں میں تمام بنی نوعِ انسان کی فلاح و بہبود تھی اور عوامی درد و کرب سے ان کا سروکار تھا، اسی لیے وہ اپنی تحریروں میں انسانی زندگی سے جڑے ہوئے مسائل پر اظہارِ خیال کرتے تھے اور مشکل حالات میں انسانیت کی رہنمائی بھی۔ اب جب کہ وہ شخصیتیں روپوش ہو گئی ہیں تو ہمیں ایک اندھیرا سا محسوس ہوتا ہے، ایسا لگتا ہے جیسے ہر سو تاریکی سی پھیل گئی ہو۔ انھی شخصیتوں نے ہمیں زندگی اور روشنی کی صحیح قدر و قیمت بتائی تھی۔ ایسی روشنیوں کا غائب ہونا بہت بڑی ٹریجڈی ہے۔ 2020-21 کے درمیان ادب، ثقافت سے جڑی ہوئی جو شخصیتیں جدا ہوئی ہیں ان میں بیشتر اپنی ذات میں انجمن تھیں۔ انھوں نے اپنے اپنے میدانوں میں وہ کارنامے انجام دیے ہیں جنھیں تاریخ فراموش نہیں کر سکتی۔ وہ اگر اور زندہ رہتے تو شاید کچھ اور شاہکار ہماری نظروں کے سامنے ہوتے۔ آج انسانی زندگی جس بحران سے گزر رہی ہے اس بحران سے نکلنے کے بہت سے راستے ان کی تحریروں میں موجود ہیں۔ ضرورت ہے کہ ہم ان تحریروں سے روشنی حاصل کریں کیونکہ یہ وہ شخصیتیں تھیں جن کی جسمانی طور پر موت ہوئی ہے مگر ان کے آثار و افکار تابندہ ہیں اور وہ ہمارے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط و التفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'ربط و التفات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

آج رسائل میں انقلابی تبدیلی آئی ہے۔ اکیسویں صدی میں 'اردو دنیا' نے اپنا ایک مقام بنایا۔ اس نے الیکٹرانک میڈیا اور انفارمیشن ٹکنالوجی کے لیے دوسرے رسائل کو بھی ایک راہ دکھائی۔ ہندوستان میں ملٹی کلر آرٹ پیپر پر جہازی سائز میں شائع ہونے والا مکمل رسالہ اردو دنیا ہے۔ مدیر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، مشیر حقانی القاسمی اور معاونین نے اسے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے کیونکہ یہ واحد رسالہ ہے جو نثری ادب کو پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے یونیورسٹی سطح اور خاص طور پر تحقیق و تنقید میں اس کا منفرد مقام ہے۔

ادب پر مدیر کا شاندار اداریہ ہے۔ آخر میں وہ لکھتے ہیں:

''انٹرنیٹ کے تفریحی پروگرام نے شاید انھیں کتابوں سے بیزار کردیا ہے جس کی وجہ سے مقصدی اور افادی ادب کا بہت خسارہ ہو رہا ہے، اس لیے ہماری نئی نسل کے مستقبل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ لازمی ہے کہ وسیع تر پیمانے پر کتاب کلچر کے احیا کی کوشش کی جائے کیونکہ اگر کتابیں نہیں رہیں تو ہمارا پورا سماج ایک شہر خموشاں یا قبرستان میں تبدیل ہوجائے گا۔''

اردو ادب میں سائنسی موضوعات کو اہمیت دی جارہی ہے جو ایک خوش آئند اقدام ہے۔ دارالترجمہ حیدرآباد نے سائنسی موضوع پر بے شمار کتابیں شائع کی ہیں۔ ان کی دوبارہ اشاعت کے لیے کوشش ہونی چاہیے۔ ایم بے وارثی نے اس موضوع پر خوب جوابات لکھے، اس کے علاوہ صنفی مساوات کی ضرورت واہمیت پر بھی آواز اٹھ رہی ہے۔ آمنہ تحسین کا مضمون 'صنفی مساوات کا فروغ اردو میں معلوماتی ادب کی ضرورت واہمیت' ایک ایسا تجزیہ ہے۔

ناموران نومبر کے تحت: اس ماہ میں پیدا ہونے والی شخصیتوں، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ سر محمد اقبال اور اکبر الہ آبادی کو بھرپور خراج ہے۔ ہر ماہ اسی طرح ناموران پر مضمون شامل کریں بلکہ ان کی تصاویر پورٹریٹ کی شکل میں شائع کریں تاکہ طلبہ اس سے استفادہ کرسکیں۔

دانش گاہیں: کتب خانے پر خدا بخش خاں بہادر اور ان کی لائبریری اور شعبہ اردو سیوا سدن کالج برہانپور کی ادبی خدمات پر مضمون نگاروں نے اچھا جائزہ لیا۔ آج ہماری دانش گاہوں اور کتب خانوں سے اردو زبان و ادب کو نظرانداز کیا جارہا ہے، آصفیہ لائبریری موجودہ اسٹیٹ سینٹرل لائبریری میں اردو کا شعبہ زبان حال سے اپنی کسمپرسی کا رونا رو رہا ہے۔ کوئی پرسان حال نہیں ہے جسے ساتویں نظام نے قائم کیا تھا۔ ایسی دانش گاہوں اور کتب خانوں پر بھی قلم اٹھانا ہوگا۔ یادرفتگاں میں جن جن شخصیتوں کو خراج پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ ایک یادگار رہے گا۔ خراج عقیدت کے عنوان سے 'ہلال سیوہاروی اور شبلی' پر اچھے مضامین ہیں۔ اس کے تحت ان ادیبوں کو شائع کریں جو گوشۂ گمنامی میں ہوں۔

عالمی ادبیات کے ذریعے ہم کو نئی معلومات ملتی ہے۔ کتاب دریچہ ایک اچھا کالم ہے اور اس میں لکھنے کا سب کو موقع ملے گا اور اس کے ذریعے دوسرے ادیبوں میں بھی لکھنے کی خواہش پیدا ہوگی۔ ماحولیاتی انحطاط پر شازلی حسن خاں کا مضمون خوب ہے۔

فلم میں بالی ووڈ فلمیں اور مشاہیر اردو پڑھ کر ذہن کے پردوں پر وہ ساری فلمیں رقص کرنے لگیں جس میں بامقصد گانے تھے جس کو آج بھی سن کر ذہن مسحور ہوجاتا ہے اس کے لیے محمد عارف مبارکباد کے مستحق ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی کی نثر کا جواب نہیں۔ ایسے ادیب مشکل سے ہی پیدا ہوتے ہیں۔ اکیسویں صدی کی شاعرات کا مع تصاویر تعارف خوب ہے۔ جاپان میں اردو تاریخ و تدریس تاریخوں کا تضاد ہے۔ ایک مقام پر اسکول آف فارن لینگویج کا قیام 1899 اور دوسرے مقام پر 1883 تھا یا مضمون میں بعض چیزیں ایسی ہیں جس میں تکرار ہے مگر مجموعی اعتبار سے ٹھیک ہے۔ 'تبصرہ تعارف' میں نت نئی کتابوں پر تبصرے پڑھنے کو ملتے ہیں۔ اس بار کلیات، تعلیم و تدریس، تحقیق و تنقید، مضامین، عربی ادبیات، فکشن اور شاعری کی کتابوں پر تبصرے شامل ہیں۔

20 سے زائد صفحات پر قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں کے علاوہ اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں۔ اعزازات وغیرہ شامل ہیں۔

ڈاکٹر م ق سلیم: صدر شعبہ اردو، شاداں کالج، حیدرآباد، تلنگانہ

ماہنامہ اُردو دُنیا کا تازہ شمارہ (نومبر 2021) اپنی چمک دمک اور جاذبیت سے آنکھوں کو چکا چوند دل کو مسرور کر گیا۔ ایم جے وارثی کے جوابات اُردو زبان ادب اُردو میں سائنسی سماجی موضوعات سے منسلک کئی تلخ حقائق پر روشنی ڈالتے ہیں نیلوفر حفیظ کا مضمون 'امیر خسرو دہلوی کی نقد نگاری' بھی خوب ہے۔ یادرفتگان کے تحت سید احمد ایثار پر رؤف خیر کا مضمون، پروفیسر بیگ احساس پر بشیر احمد لون کا مضمون مندرجہ بالا مضامین میں قلمکاروں نے اپنے موضوع سے نہ صرف انصاف کیا ہے اپنی منفرد طرز تحریر سے قارئین کی دلچسپی کو برقرار رکھا ہے۔ 'نیا آسمان نئے ستارے' کے تحت نئے قلم کار سعدیہ صدف، محمد تنظیم عالم اور معراج الاسلام کی قلمی کاوشیں قابل ستائش ہیں۔ 'فلم' عنوان کے تحت محمد عارف کا 'بالی ووڈ فلمیں اور مشاہیر اُردو' اس شمارے کا سب سے عمدہ مضمون ہے۔ محمد عارف نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ مضمون کو قلمبند کیا ہے مضمون میں سعادت حسن منٹو، مجروح سلطان پوری، ساحر لدھیانوی، ندا فاضلی، شہریار، کیفی اعظمی شکیل بدایونی، حسرت جے پوری، گلزار اور نوشاد جیسے بلند پایہ فلمی نغمہ نگاروں کے اُردو فلمی نغموں کا مختصر مختصر مگر جامع انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں اُردو ادب شاعری اور فلم کی مقناطیسی شخصیت اختر الایمان کی اردو فلمی مکالمہ نگاری کا بھی اعتراف کیا ہے۔ مضمون ہذا میں محمد عارف اپنے وقت کے معروف اردو فلمی نغمہ نگار راجہ مہدی علی خان، عزیز کشمیری، قمر جلال آبادی، اسد بھوپالی، شلیندر، انجان گلشن باورا اور اُردو فلمی مکالمہ نگار راہی معصوم رضا، ابرار علوی، سورج سینم اور قادر خاں کا ذکر بھی کرتے تو مضمون کی اہمیت میں مزید چار چاند لگ جاتے۔ کیونکہ ان پہ فنکار بھی اُردو فلمی نغموں اُردو فلمی مکالموں کے ذریعے اُردو شاعری اور ادب کی مقبولیت میں اضافہ کرنے میں اہم رول ادا کر چکے ہیں۔

کالم 'تبصرہ و تعارف' کے تحت اس بار 9 عدد تصانیف اور ایک سہ ماہی رسالہ انتساب عالمی پر تبصرے شامل ہیں۔ مبصرین کے نام ہیں عبدالرشید، محمد قمر سلیم، ڈاکٹر محمد آصف حسینی، ڈاکٹر منور حسن کمال، احسن ایوبی، ریحانہ فاطمہ، امتیاز احمد، ابراہیم افسر، ابوالبشر اور منظور وقار ہر ماہ اُردو دُنیا کو بنا سنوار کر منظر عام پر لانے کے لیے میں اُردو دُنیا سے منسلک پوری ٹیم کو مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

❖ **منظور وقار**: بڈا لا کالونی گلبرگہ، کرناٹک

اکتوبر ماہ شمارہ مہاتما گاندھی کی خوبصورت تصویر اور اُن کی چار ترجمہ شدہ کتب کے سرورق سے مزین دستیاب ہوا ہے۔ مہاتما جی کے پیدائشی ماہ میں انھیں پر مبنی دونوں مضامین معیاری اور مناسب خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ مستزاد، یہ قوم کو آزادی دلانے والے سربراہ کے عمیق و دقیق مطالعے، تجربات اور بے پناہ 'حب الوطن' (یہی صحیح املا ہے، نہ کہ 'حب الوطنی') کو بھی بخوبی نشان زد کرتے ہیں۔

ایک غیر ملک میں ایک بار ٹرین میں گاندھی جی غلطی سے غلط ڈبے میں سوار ہو گئے تھے۔ تب ٹی۔ ٹی نے قانون کا حوالہ دیتے ہوئے ان کو ڈبے سے نکال دیا تھا۔ اس بے چارے ٹی۔ ٹی کو کیا معلوم تھا کہ یہی وہ منکسر المزاج شخص ہے جو کہ مستقبل میں پورے برٹش ایمپائر (Empire) کو ہی ہندوستان سے نکال کر باہر پھینک دے گا۔

ساحر لدھیانوی پر ڈاکٹر عمران عراقی کا اچھا مضمون ہے۔ یہ ناچیز چند متنازع باتوں کی بابت اپنی رائے ظاہر کر رہا ہے۔ صفحہ 30 پر شعر 'غزالاں تم تو واقف ہو...' کے خالق کا نام راجہ رام نارائن 'موزوں' تاحال مستند نہیں ٹھہرایا جا سکا ہے۔ خلیق الزماں نصرت نے اپنی کتاب 'برمحل اشعار اور ان کے ماخذ' میں اور 'شاعر' جریدے کے جنوری تا جون کے مشترکہ اور تازہ شمارے کے تحت بھی اپنے مضمون 'برمحل اشعار' میں راجہ رام نارائن 'موزوں' کو ہی اس شعر کا خالق درج کیا ہے۔ 'اردو دنیا' کے مئی سنہ 2011 کے شمارے میں (ص 5-6) شائع

اپنے خط میں تمنا مظفر پوری نے پہلی بار شاعر کا صحیح نام (شاید بنارس کے باشندے) مرزا ابراہیم مشتاق درج کرنے کی جرأت کی تھی۔ میں ان کے خیال سے صدفی صد متفق ہوں۔ دراصل راجہ صاحب اپنے ہی تخلص 'موزوں' کے مطابق دوسرے نومشق شعرا کے اشعار کو ہی فقط 'موزوں' کیا کرتے تھے اور وہ از خود کوئی بلند پایہ شاعر قطعی نہ تھے۔

اسی مقالے میں زبان و املا سے متعلق معدودے چند اغلاط چلے گئے ہیں۔ مثلاً ص 31 پر اول کالم میں دوسری بار مستعمل لفظ 'حیثیت' کے بعد 'سے' لفظ مفقود ہے۔ اسی طرح عربی زبان کے 'جہت' مونث لفظ کا جمع لفظ 'جہات' بھی مونث ہی ہوتا ہے، نہ کہ مذکر۔ اسی طرح ص 33 پر تیسرے کالم میں مستعمل لفظ 'عوام' بھی مذکر ہوتا ہے، نہ کہ مونث۔ عربی زبان کے صفت لفظ 'عام' کی جمع 'عوام' بھی مذکر ہوتا ہے، نہ کہ مونث۔ لہٰذا، 'کی عوام' ان غلط الفاظ کی بجائے 'کے عوام' لکھنا درکار تھا۔

جب ساحر صاحب ساہتیہ اکادمی کا خاص اعزاز حاصل کرنے کے مقصد سے اپنی والدہ کے ہمراہ دہلی کی عمارت کا زینہ چڑھ رہے تھے، عین اسی وقت امرتا پریتم بھی پاس ہی زینہ طے کرتی ہوئی نظر آئی، تبھی اس کی جانب کنایہ کرتے ہوئے ساحر نے اپنی والدہ سے کہا تھا۔ "یہ بھی آپ کی بہو بن سکتی تھی۔" اس کے جواب میں ان کی والدہ نے کہا تھا۔ "بیٹا، اب تو تم کسی کو بھی بہو بنا کر لے آؤ۔"

سالک جمیل برار صاحب نے ساحر کی شاعری کے ضمن میں اپنے معیاری مضمون میں عموماً بچوں سے متعلق اپنی ادبی واقفیت کا قابل مدح ذخیرہ پیش کیا ہے۔ چند اغلاط توجہ طلب ہیں: ص 33 پر اول کالم کے اول پیرا کی 6ویں سطر میں 'ساحر بچوں' ان دو الفاظ کے درمیان 'کی' لفظ درکار تھا۔ ص 34 پر 'سات' (ساتھ) اور ص 53 پر 'جھوٹے' لفظ کی جگہ 'جوٹھے' لفظ کا استعمال چاہیے تھا۔ آخری کالم میں نظم 'انسان کی اولاد' اگرچہ بلاشک شاندار ہے، تاہم یہی ایک نغمے کی صورت میں کس ہندی فلم میں بھی داخل تھی، اُس فلم کا نام دینا بھی بہتر ہوتا۔

بانو سرتاج اردو ادب کی بلند پایہ افسانہ نگار و مضمون نگار ہیں۔ انھوں نے نہایت عرق ریزی سے لبریز مقالے میں اردو شاعری کے ضمن میں قومی یک جہتی و وحدت کی جو متعدد مثالیں پیش ہیں، وہ ان کے عمیق مطالعے کی صحیح خط کشی کرتی ہیں، وہ بھی لائق صد ستائش ہیں۔

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاوک**: کوٹھی نمبر A-201، گورونانک نگر گلی نمبر K-18، A-201، پٹیالہ (پنجاب)

'اردو دنیا' اکتوبر 2021 کا شمارہ میرے سامنے ہے۔ سرورق پر معنویت کے اعتبار سے گاندھی جی کی تصویر اہمیت کی حامل ہے۔ معیاری مشمولات کو پڑھنے کے بعد دل مسرت سے لبریز ہو گیا۔ اس شمارے میں جن قلمکاروں نے حصہ لیا ہے ان کے مضامین قابل ستائش ہیں۔ اداریے سے لے کر خبرنامہ تک بار بار پڑھنے کی چیز ہے۔ بانو سرتاج کا 'اردو اور ہندوستانیت'، اسلم جمشید پوری کا 'اردو میں مکتوب نگاری' خوب ہے۔ اداریے میں شیخ عقیل احمد نے مہاتما گاندھی سے متعلق کافی تفصیلی روشنی ڈالی ہے جو قاری کے لیے از حد مفید ہے۔ موصوف نے فرمایا ہے کہ ہمارے ملک کے جن قائدین نے اپنے افکار، آثار اور اقدار سے اجتماعی شعور کو متاثر کیا اور ذہنوں پر گہرا نقش قائم کیا ہے ان میں مہاتما گاندھی کا نام سرفہرست ہے۔ بلاشبہ انھوں نے کہا تھا "میں ایسا ہندوستان بناؤں گا جس میں تمام فرقے شیر و شکر ہو کر رہیں گے، ایسا ہندوستان جس میں چھوت چھات کی لعنت نہ ہوگی، ہندو مسلمان سکھ اور عیسائی سبھی اتفاق و اتحاد سے رہیں گے۔" یہ شمارہ جس آب و تاب سے شائع ہو رہا ہے ہوتا رہے اور قاری اردو دنیا کو خرید کر پڑھتا رہے۔ یہی میری دعا ہے۔

❖ **معین الدین شمسی**: گریڈیہہ، جھارکھنڈ

■

ماہنامہ اردو دنیا کے کالم ’زبان اور زمینی صورت حال‘ کے لیے سوال نامہ

ماہنامہ’اردو دنیا‘ میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذرا سی تبدیل کردی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہوسکیں۔

- زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟
- زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟
- زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟
- کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟
- کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟
- موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟
- اردو کا مستقبل کیا ہے؟
- زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہورہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟
- کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟
- کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟
- آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟
- آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟
- آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟
- آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟
- اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟
- دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟
- کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟
- آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟
- غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟
- آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟
- ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟
- سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ’اردو دنیا‘ میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورت حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں:

➢ editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in

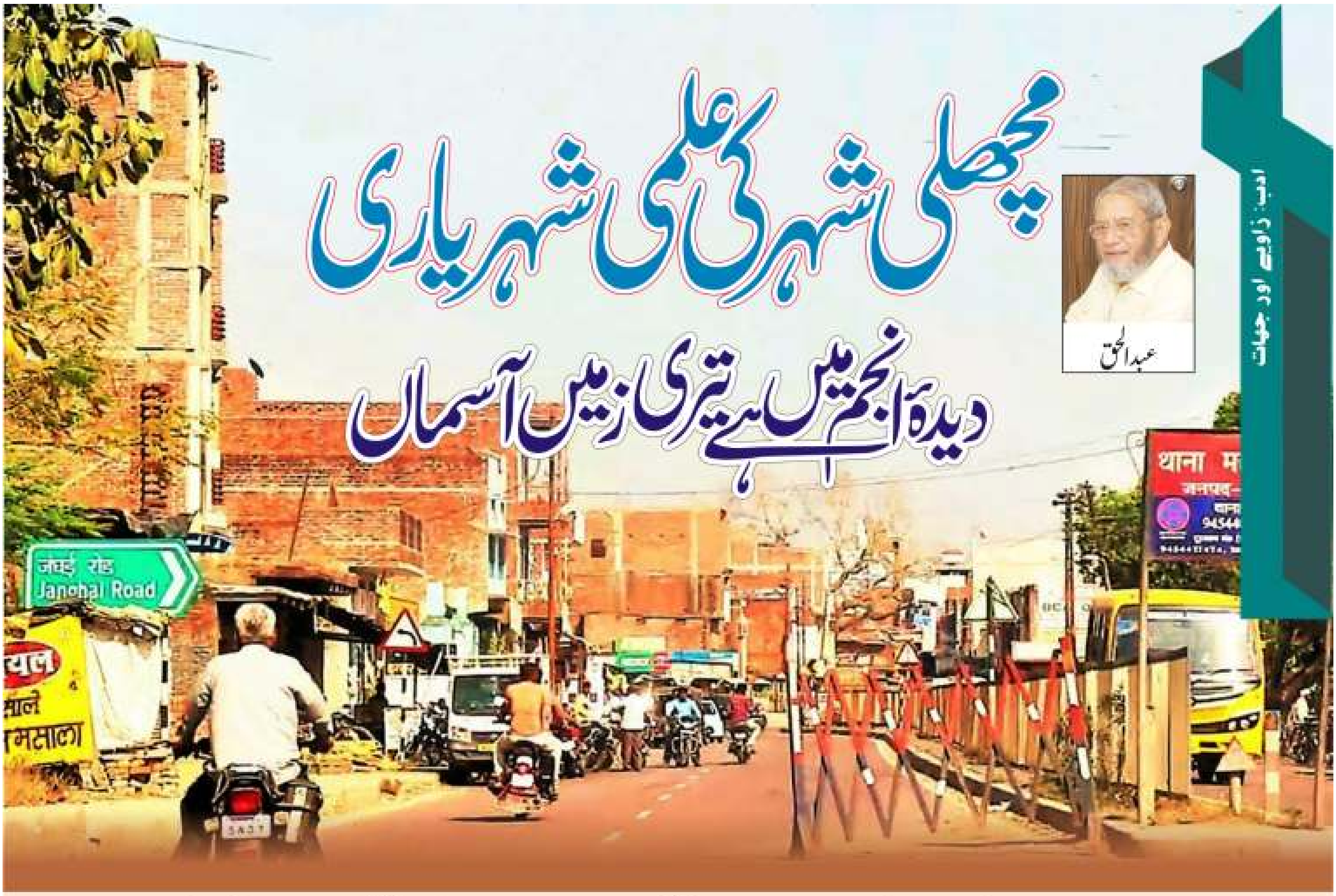

مچھلی شہر کی علمی شہر یاری

دیدۂ انجم میں ہے تیری زمیں آسماں

عبدالحق

دنیائے اسلام میں جون پور کو جو امتیاز حاصل ہے وہ کرۂ ارض کے کسی حصے کو شاید حاصل ہی ہو۔ یہاں غرناطہ و بغداد کے زوال کے بعد علم و دانش کا بے مثل و بے نظیر جہاں تاب چراغ روشن ہوا۔ دیارِ دہلی کو بھی اس نورفشانی پر رشک آیا۔ عالم اسلام کے مایۂ ناز مفکر اور مجددِ وقت شاہ ولی اللہ دہلوی نے بڑی کشادہ دلی کے ساتھ اس خطۂ زمین کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے ان کے عربی قصیدے کا شعر ہے۔

من جونفورِ اذا ھبّت ریاحُ رِضی
منھا تعطرتِ الدنیا ومافیھا

یعنی جون پور سے جہاں کہیں ہوائے دل پسند چلی کہ دنیا اس سے معطر ہوگئی اور دنیا میں جو کچھ ہے سب پر اس کی خوشبو چھا گئی۔ خداداد بصیرتوں کے طفیل شاہانِ شرقی نے اس علاقے کو جلوہ گہ جبرئیل کے نور و سرور سے آشنا کیا۔ علم و عرفاں کی ایک کہکشاں سے یہ بستی آباد ہوئی۔ تقریباً ڈیڑھ سو سال کی قلیل مدت میں عظیم آباد سے علی گڑھ تک پوری فضا دانش نورانی سے منور ہوئی۔ صاحب نظراں کی صحبت سے فیض رسانی کے کئی رہ گزر روشن ہوئے۔ یہ علاقہ مختلف قبیلہ و خانوادوں کی تربیت گاہ سے معمور ہوا۔ عرفان و آگہی کا یہ ہجوم ناز کہیں اور نہیں دکھائی دیتا۔ یہاں چشتیہ، قادریہ، سہروردیہ، نقش بندیہ، مداریہ، شطاریہ، صابریہ، قلندریہ وغیرہ صوفی سلسلے اور ان کے مبلغین کا ہجوم نظر آتا ہے۔ ان میں ایک سے ایک عالم اور صاحب کشف و کمال کے پیکر بھی موجود ہیں۔

دوسری طرف مذہب و مسلک کی کثرت آرائی بھی امتیاز کی حامل ہے۔ اسلام، بدھ، ہندو، کبیر پنتھ، رام بھگتی، کرشن بھگتی، گورکھ ناتھ، شیعیت، مہدویت وغیرہ عقائد کی نوع بہ نوع صورتیں یہاں موجود ہیں۔ روٹی روزی کے مختلف پیشے خواب و خورد آرام کے ساتھ زندگی کے مختلف اسالیب میں تکثیریت کی رنگ برنگ شان نظر آتی ہے۔ ان عقائد سے متعلق ادبیات کا بڑا ذخیرہ حیرت خیز ہے ان پر تخلیق اور تخلیق کار دونوں کو ناز بے جا بھی سزاوار ہے ملا محمود جون پوری کا شمس بازغہ اسلامی الٰہیات کی بے مثل کتاب ہے۔ دوسری طرف اسی دیار میں ملک محمد جائسی کی پدماوت عالمی ادب میں بے نظیر تخلیق ہے۔ تلسی داس کی رامائن جیسی شعری تخلیق کو مذہبی تقدس میں افتخار حاصل ہے۔ کبیر داس کے شعری مجموعے کبیر گرنتھاولی کو بھی بلند مقام حاصل ہے۔ عبدالرحیم خان خاناں کے ہندی کلام کو بھی ادب میں بڑے احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان حوالوں کے ساتھ یہ بات بہت اہم ہے کہ اردو ہندی کی ابتدائی تخلیق کا اعزاز اسی علاقے کو حاصل ہے۔ مولانا محمد داؤد کی چندائن اردو کی پہلی شعری تخلیق ہے۔ ہندی والے بھی اسے اپنی زبان کی پہلی کتاب تسلیم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر محمد اسماعیل آزاد مبارک باد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بہت ہی جانفشانی کے ساتھ اس کتاب پر تحقیق کی ہے۔ ان سے پہلے ڈاکٹر محمد انصار اللہ نظر اس کا تفصیلی تعارف کرا چکے ہیں۔ اس کتاب کے مطالعے سے خسرو کا تمام کلام مسترد ہو جاتا ہے جسے ناقدوں نے قیاس کی بنیاد پر خسرو کا کلام باور کرانے کی کوشش کی ہے۔ دورِ اول کے کئی شعرا کا تعلق جون پور سے ہے۔ مولانا عبدالقدوس گنگوہی، شیخ قطب علی قطبن، منجھن، ودیاپتی وغیرہ اسی دیار میں داخل ہیں۔ مولانا کرامت علیؒ کی کتاب 'مفتاح الجنت' ہے جو 1827 میں پہلی بار شائع ہوئی تھی اور 1860 میں اس کی چوتھی اشاعت ہوئی۔ اس سے اس کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالباً یہ اردو میں پہلی فقہی کتاب ہے۔ یہ وہی سرفروش عالم ہیں جو تحریک آزادی میں انگریزی اقتدار کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ یہ تبلیغ دین کے داعی اور انقلابی مجاہد بھی ہیں جنھوں نے بنگال و برما تک حق کی دعوت دی۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

جون پور کے علماء کبار کی ایک روشن کہکشاں ہے ان کی علمی

و دینی خدمات بے مثل و بے نظیر ہیں۔ انھیں کی بدولت دہلی میں علم کا چراغ روشن ہوا۔ یہیں کے عالم ہیں جنہوں نے اکبر کے دینِ الٰہی کے خلاف بغاوت کی اور جمنا میں ڈبونے کی سزا کو قبول کیا۔ انھیں کی بدولت جون پور کے قاضی کا محاورہ وجود میں آیا۔

یقین وثبات کے ساتھ تسلیم کرسکتے ہیں کہ مچھلی شہر کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ قرائن کہتے ہیں کہ گوتم بدھ کی پیدائش سے پہلے آس پاس کی بستیاں آباد تھیں۔ بنارس میں سارناتھ کے آثار و باقیات سے یقین ہوتا ہے کہ اس کے گرد و نواح میں گاؤں و بازار موجود تھے۔ ان کی جو بھی صورت رہی ہو۔ ہندوؤں کے دو مقدس مقامات پریاگ اور وارانسی عہد قدیم سے عوامی زیارت گاہ رہے ہیں۔ ویدک ادب میں ان کے تذکرے موجود ہیں جو عہد عتیق کی یاد دلاتے ہیں۔ اس عہد کے ماہ و سال کا صحیح تعین مشکل ہے۔ پریاگ یعنی الہ آباد اور بنارس کے درمیان مچھلی شہر واقع ہے۔ مچھلی شہر سے الہ آباد پینتالیس میل دور مغرب میں ہے اور بنارس پچاس میل کے فاصلے پر مشرق میں واقع ہے۔ جب ان دو شہروں کی تاریخ مذہبی اساطیر میں موجود ہے تو درمیان کی انسانی بستیوں کا وجود یقینی امر ہے، الہ آباد سے بنارس تک سفر طے کرنے کی دو شاہ راہیں ہیں، شمالی راستے میں مچھلی شہر اور جون پور سے ہوتی ہوئی بنارس کی گزرگاہ ہے۔ جنوب میں گوپی گنج ہوتے ہوئے بنارس سے ملانے والی دوسری شاہراہ ہے جسے گرینڈ ٹرنک روڈ کہا جاتا ہے۔ دونوں شاہراہوں پر نئی بستیاں آباد ہوئیں۔ شمالی راہ پر دو تحصیلی شہر الہ آباد ضلع کا پھول پور تحصیل اور جون پور کا مغربی تحصیل مچھلی شہر واقع ہے۔ جون پور کے علاوہ تمام تحصیلوں میں مچھلی شہر کا مقام قابل ذکر ہے۔ اس کی علمی تاریخ بھی قابل فخر ہے۔ فتاویٰ عالمگیری کے مرتبین میں ایک نام مولوی محمد جمیل ولد ملا صادق ولد ملا شمس نور کا ہے، جو مچھلی شہر کے رہنے والے تھے۔ ان کی آخری آرام گاہ جون پور میں ہے۔ یہاں چار قدیم عمارتیں ہیں جو آج بھی محفوظ ہیں، قلب شہر میں بلندی پر جامع مسجد ہے جس کا طرز تعمیر اور صحن و در کی کشادگی شیراز شرق کے فن تعمیر کی دلیل ہے۔ شہر کے مغرب میں الہ آباد شاہ راہ پر بہت قدیم عید گاہ اور تالاب ہے، اسی سڑک پر امام باڑہ بھی ہے۔ چوتھی عمارت شاہی مسجد ہے جو شہر کے مشرق میں منڈیا ہوں سڑک پر نئی توسیع کے ساتھ باقی ہے۔ جس کے در و بام پر وادیِ ایمن کا نور برستا ہے شہر کی کوئی تاریخ مرتب نہ ہوسکی اور نہ ہی اہل نظر کا تذکرہ مرتب ہوا۔ فتاویٰ عالمگیری کے مرتب کے ذکر سے یہاں کی علمی برگزیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ غالب کے شاگرد شاکر مچھلی شہری کے نام خطوط کی موجودگی سے شعری و ادبی ماحول کا بھی علم ہوتا ہے۔ یہ بات بڑے وثوق سے کہی جاسکتی ہے کہ یہاں شعری سرگرمیاں عروج پر تھیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اپنے مقالے میں مچھلی شہری ادیب کا حوالہ دیا ہے۔ داغ کے شاگردوں کا بھی سراغ ملتا ہے ہادی اور متین کا نام قابل ذکر ہے۔ صفی لکھنوی کے شاگرد بھی یہاں موجود تھے۔ 1901 میں حاجی محمد لطیف کے السفر اللطیف الی بیت اللہ شریف کے نام سے مطبع مجتبائی لکھنؤ نے حج کا سفرنامہ شائع کیا تھا، یہ اردو میں حج کے ابتدائی سفرناموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ عہد حاضر میں مولانا محمد عمر جعفری کے خانوادے کی ہمہ جہت خدمات نے قصبے کو امتیازات سے نوازا۔ ان کا بیش بہا علمی کتب خانہ بہت ہی قابل فخر اثاثہ تھا جو ان کے بزرگوں نے جمع کیا تھا۔ یہ کتب خانہ نوادرات کا انمول ذخیرہ تھا جس کے بارے میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے اپنے مقالے میں ذکر کیا ہے۔

''مچھلی شہر کے ایک بزرگ قاضی شاہ الدین جعفری کے پاس بھی ایک کتب خانہ تھا۔ جسے قاضی صاحب کے اسلاف نے بڑی ترقی دی۔ آخر میں اس کا اکثر حصہ فروخت پاکر ہندوستان کے دوسرے کتب خانوں میں پہنچ گیا۔ کتب خانہ رام پور میں بھی اس کی بہت سی کتابیں پائی جاتی ہیں۔ تاہم اب بھی اس خاندان میں کئی ہزار نسخے موجود ہیں۔'' (مقالات مولانا عرشی، ص 3)

1972 میں ناچیز نے اس کتب خانے کی زیارت کی۔ شہر کے رئیس اور خطیب مولانا محمد عمر جعفری اس کتب خانے کے مالک تھے۔ وہ بڑی وجیہ شخصیت رکھتے تھے۔ ان کا ضلع میں بڑا دبدبہ اور وقار تھا۔ ان کے کتب خانے میں کسی کی باریابی نہیں تھی۔ ان کا کرم تھا کہ انہوں نے مجھے استفادے کی اجازت دی وہ میرے بڑے مشفق سرپرست تھے۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ اس کتب خانے کی اہمیت کا اندازہ لگائیے کہ امام بخاری کے دادا استاد عبدالرزاق کے مجموعہ احادیث المصنف کے قدیم نسخے کی جلدیں یہاں محفوظ تھیں۔ جسے شیخ الحدیث مولانا حبیب الرحمان اعظمی نے مرتب کر کے بیروت سے شائع کیا۔ اسی ذخیرے سے فارسی کا دوسرا مخطوطہ اور بہت اہم تذکرہ ناچیز کو حاصل ہوا۔ جسے راقم نے 'تذکرۂ الٰہی' کے نام سے دو جلدوں میں شائع کیا۔ اب تک کی دریافت کے مطابق اس تذکرے کا دنیا میں کہیں دوسرا نسخہ موجود نہیں ہے۔ مولانا محمد عمر جعفری مرحوم نے دوسرے نسخے بھی فراہم کیے جیسے دیوان شاکر ناجی، زبدۃ الفقہ، دیوان جامی، دیوان بیدل وغیرہ۔ مرحوم کے ذخیرے میں اور بہت سے نایاب قلمی نسخے تھے جن کی زیارت سے ناچیز سرشار ہوا۔ فارسی کے مشہور تذکرہ ہفت اقلیم کا بیش قیمتی نسخہ بھی تھا۔ جو بڑے اہتمام سے تیار کیا گیا تھا۔ یہاں قرآن پاک کا ایک قدیم مخطوطہ تھا جو غالباً مکمل نہیں تھا۔ مولانا فرماتے تھے کہ ان کے کتب خانے میں کسی اندلسی ماہر فلکیات کا ایک نادر نسخہ تھا جس کے لیے ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ نے بہت خطیر رقم خریداری کے لیے پیش کی تھی مگر مولانا نے بزرگوں کی امانت کو الگ کرنا پسند نہیں کیا، مزید تفصیلات معلوم نہ ہوسکیں۔ اس دیار کی علم نوازی کا اندازہ لگائیں کہ خانقاہ رشیدیہ جون پور سے دیوان حافظ کا سب سے قدیم نسخہ استاذی پروفیسر محمود الٰہی کو ملا تھا، تذکرۂ شورش کا خطی نسخہ بھی اسی دیار کی دریافت ہے جسے استاذی محمود الٰہی نے مرتب کر کے شائع کیا اور راقم کے نام معنون کیا۔

تذکرۂ الٰہی کا ذکر تھا، یہ فارسی شعرا کا ناتمام تذکرہ ہے جو متقدمین اور متوسطین شعرا و علما کے ذکر پر مبنی ہے۔ 1065ھ میں میر الٰہی ہمدانی کا انتقال سری نگر میں ہوا، یہ تذکرہ بھی 1065ھ کا لکھا ہوا ہے اور بیگم نور جہاں (جہانگیر کی بیگم) کے کتب خانے کی زینت بھی رہا یہ مچھلی

عصر حاضر میں شعروادب کے تعلق سے سلام مچھلی شہری نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ وہ ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر ابھرے اور اس دیار کو شہرت بخشی۔ ان پر ڈاکٹر عزیز اندوری نے تحقیقی مقالہ لکھا اور وہ کتاب بھی شائع ہوئی۔ بہار سے اختر حسن نے ایک مختصر کتاب قلم بند کی ہے۔ راقم پر اب تک تین تحقیقی مقالے لکھے جاچکے ہیں۔ ایک شائع ہوچکا ہے۔ دو زیر اشاعت ہیں گویا اس بستی کی سلام، سروش اور ناچیز تین شخصیتوں کی ادبی خدمات پر ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی۔ راقم الحروف پر تین تحقیقی مقالے تحریر کیے جاچکے ہیں۔ ایک ہندوستان اور دو پاکستان میں داخل کیے گئے۔

شہر میں کیسے پہنچا؟ حیرت ہے، لیکن یہ تو طے ہے کہ اس شہر میں علم کی قدر دانی تھی، شکر ہے کہ وہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ عصرِ حاضر میں شعروادب کے تعلق سے سلام مچھلی شہری نے بڑی مقبولیت حاصل کی۔ وہ ایک ترقی پسند شاعر کے طور پر ابھرے اور اس دیار کو شہرت بخشی۔ ان پر ڈاکٹر عزیز اندوری نے تحقیقی مقالہ لکھا اور وہ کتاب بھی شائع ہوئی۔ بہار سے اختر حسن نے ایک مختصر کتاب قلم بند کی ہے۔ راقم پر اب تک تین تحقیقی مقالے لکھے جا چکے ہیں۔ ایک شائع ہو چکا ہے۔ دو زیر اشاعت ہیں گویا اس بستی کی سلام، سروش اور ناچیز تین شخصیتوں کی ادبی خدمات پر ڈاکٹریٹ کی سند تفویض کی گئی۔ راقم الحروف پر تین تحقیقی مقالے تحریر کیے جا چکے ہیں۔ ایک ہندوستان اور دو پاکستان میں داخل کیے گئے۔

یہ بات بھی دل چسپ ہے کہ علامہ اقبال پر سب سے زیادہ کتابیں تصنیف کرنے والا اسی شہر کا پروردہ ہے، اس شہر میں علامہ سے شعری وابستگی رہی ہے۔ عبداللہ جعفری مرحوم علامہ کے ہی انداز میں شعر کہتے تھے۔ سروش صاحب کا انداز مزاحیہ تھا۔ عصر حاضر میں مچھلی شہر کی مایۂ ناز علمی شخصیت مولانا سراج الحق مچھلی شہری کی ہے، جو گورنمنٹ کالج الہ آباد میں معروف استاد تھے۔ علم وادب کے ساتھ ان کا تبحر علمی قابل رشک تھا۔ خاص طور پر تفسیر دینی میں وہ بے مثال تھے۔ ان کی کئی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ وہ ایک بڑی فکر کے ترجمان تھے۔ اقبال کے فارسی اشعار کا اردو ترجمہ کیا اور علامہ کو خراج بھی پیش کیا۔ مسلکی مسائل میں انھیں بڑا درک حاصل تھا، ان کے مضامین اس کی دلیل ہیں۔ ان کے وجود میں ایک دبستانِ علم کی نمود تھی، درسیات کے لیے کئی نصابی کتابیں ان کی یادگار ہیں۔

حافظ سراج الدین کاشف مچھلی شہری اقبال کے سراپا فکری ترجمان تھے۔ شہر میں ہر چھوٹا بڑا ان کو بڑے احترام سے دیکھتا اور عزت کرتا تھا۔ انھوں نے قرآن پاک کی کئی سورتوں کا منظوم ترجمہ کیا۔ وہ پاک نفس اور پاک دل و پاک باز تھے۔ فکر وخیال کی پاکیزگی ان کی شاعری کا جوہر تھا۔ مرحوم نے ناچیز کے لیے بھی ایک نظم رقم کی۔ ان کی بے پایاں محبت کے بار احسان کا خیال اکثر مضطرب اور مغموم کرتا ہے۔ اس نظم کے یہ چند اشعار میرے لیے سرمایۂ سعادت ہیں۔

خدا کا شکر ہے معمورۂ صفاتِ اہم
شعاعِ نور سحر مہر وماہ کا پیکر
ترا ضمیر ہے آئینہ سازِ حسنِ کلام
ستیزہ کار ہے کسبِ کمال علم وہنر
تمھاری کاوشیں مرہونِ مرجعِ اقبال
حدیثِ شرحِ محبت متاعِ قلب ونظر
خلوص وعجز کا پیکر فروغِ شعر وادب
عیاں ہے کاشفِ دل گیر پر ترا جوہر

وہ دینی معاملات میں سخت گیر تھے مگر ان کی کشادہ دلی اور وسیع النظری قابل رشک تھی، وہ خوش مزاج اور دل نواز بھی تھے۔ حیرت ہوتی ہے کہ کسی دینی مدرسے سے فراغت کے بغیر ذاتی جدوجہد کی اور علوم دینی میں درجۂ کمال تک پہنچے۔ سرکاری ملازمت میں فرض شناسی کے بعد بھی ان کے مطالعے کی محویت پر رشک آتا، وہ مچھلی شہر کی جامع مسجد کے خطیب بھی تھے، ان سے پہلے حافظ مہدی امام تھے جو انٹر کالج میں وائس پرنسپل بھی تھے، ان سے قبل مولانا محمد عمر جعفری جمعہ کے خطیب اور امیر شہر تھے، ان کی غیر موجودگی میں حافظ پھوئی مرحوم خطبہ وامامت کی ذمے داری نبھاتے۔ حافظ سراج الدین ایک صاحب نظر امام تھے، ان کی خطابت میں عزم جواں کو بیدار کرنے کا پیغام ہوتا، انداز بیان میں خطابت کا شکوہ اور جلال کا پہلو غالب ہوتا۔ غور وفکر کا اسلوب بھی کردار وعمل کے تابع تھا۔ نسل نو کی نگہبانی پر ان کی خاص توجہ تھی۔ میرے مڈل اسکول کے استاد عبدالرحیم مرحوم کے یہ بڑے بیٹے تھے۔ راقم ان سے متعارف نہ تھا، ڈاکٹر عبدالسلام کے حلقۂ یاراں میں شرف یابی کے بعد ان سے شناسائی ہوئی جو عمر بھر کی جگر تابی میں تبدیل ہوگئی، جب بھی جون پور جاتا حافظ صاحب سے ملاقات ضرور کرتا، چہار سو کے چوراہے کے قریب ان کی رہائش تھی، دہلی رہ کر بھی ان سے دوری کا احساس نہ ہوا، فون اور خط وکتابت جاری رہتی، گھر سے نکلتے شیروانی ٹوپی میں نظر آتے کوئی نہ کوئی کتاب ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہتی، ہم دونوں مولانا ظفر احمد صدیقی کے گھر بھی حاضر ہوتے، مولانا بشاش نظر آتے، گھنٹوں علمی ودینی معاملات پر دونوں کی بزم گفتگو سے راقم مسرور و مستفیض ہوتا۔

حافظ سراج الدین مرحوم بہت اچھا شعری ذوق رکھتے تھے، زبان وبیان پر حکیمانہ قدرت تھی، بہت لکھا مگر جمع نہ کرسکے اور نہ خیال آیا، کاشف تخلص تھا، ہنگامی واقعات پر کئی نظمیں قلم بند کیں، آج بھی شعروسخن کے سلسلے جاری ہیں، اب قلم دان نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے، ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی مرحوم نے زمانۂ حال کے معروف مزاح نگار سروش مچھلی شہری کی خدمات پر پی۔ ایچ ڈی کی ڈگری میرٹھ یونیورسٹی سے حاصل کی تھی، وہ زود گو شاعر تھے۔ کئی نظمیں بے نقط لکھیں اور ایک مجھے سنائی بھی تھی، قرآن پاک کی چند سورتوں کا منظوم ترجمہ کیا تھا، ان کا نعتیہ کلام گلستانِ رحمت شائع ہو چکا ہے، عبرت مچھلی شہری سنجیدہ شاعری کی علامت بن گئے ہیں۔ ان کا یہ شعر ان کی شناخت اور شہرت کا سبب بن گیا ہے۔

ہم لوگ تو سچائی کاغذ پہ نہیں لکھتے
کچھ لوگوں نے نیزوں پر تاریخ لکھی کیسے؟

ان کی غزلوں کا مجموعہ 'آنسوؤں کی بارات' شائع ہو چکا ہے، دوسرے قابل ذکر حوصلوں کے نوجوان شاعر فیروز مچھلی شہری ہیں جن کا یہ شعر مجھے پسند ہے۔

خود ہی امیرِ فوج نے تلوار پھینک دی
الزام ہار جانے کا لشکر پہ رکھ دیا

اور بھی کئی اہم شعرا قابل توجہ ہیں جن تک راقم کی رسائی نہیں ہو سکی، شہیر مچھلی شہری کا دیوان بہت پہلے شائع ہوا تھا، ناچیز نے 1954 میں اسے پڑھا تھا اب اس کا دوسرا ایڈیشن بھی شائع ہو چکا ہے۔ یہ شہر فرزانوں کی بستی ہے، علمی فراست اس کا امتیاز ہے، اس شہر علم میں حصول تعلیم کی روایت رہی ہے، اندازہ لگائیے کہ سید زین العابدین نے بی۔ اے کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کلکتہ سے ایل۔ ایل۔ بی۔ کی ڈگری حاصل کی، وہ اس شہر کے پہلے ایل ایل بی ہیں اور ایک سرکاری منصب پر فائز ہوئے اور دنیائے اسلام کے سب سے بڑے علمی مرکز مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کے قیام میں معاون ہوئے۔

موسیٰ جعفری مرحوم جدید تعلیم سے بہرہ ور ہوئے، میں نے لڑکپن میں موسیٰ جعفری کو جامع مسجد میں خطاب کرتے دیکھا ہے، نرم لہجے کی بڑی ہی عالمانہ خطابت سحر آفریں ہوتی تھی، اس شہر میں پہلے ہائی اسکول کے وہ بانی ہیں، اندرونِ شہر ان کی رہائش گاہ کے قریب ایک پرانی عمارت میں یہ اسکول تھا، وہ پرنسپل بھی تھے، مالی بحران اور اختلاف سے عاجز آکر وہ پاکستان چلے گئے۔

جعفری خاندان کا عظیم الشان ادارہ محمد حسن پی جی کالج ہے جو شاہ گنج روڈ پر جون پور میں واقع ہے، یہ پہلے اٹالہ مسجد میں قائم تھا، رشید احمد صدیقی کے چھوٹے بھائی نیاز احمد صدیقی اس کے پرنسپل تھے، اب نئے شان وشکوہ کے ساتھ نئی عمارت اور نئے کیمپس میں آباد ہے، یہ بھی حیرت کی بات ہے کہ اس کی تعلیمی بیداری میں ایک انقلاب آیا ہے، اتر پردیش ہی نہیں ملک کا شاید ہی کوئی ضلع ہو جس میں مسلمانوں کے قائم کردہ پانچ ڈگری کالج ہوں، خود جون پور شہر میں محمد حسن کالج کے علاوہ شیعہ کالج اور ساجدہ گرلس کالج ہیں، دو کالج اور ہیں، یہ بھی اس شہر کی خوش نصیبی ہے کہ پوروانچل یونی ورسٹی اس کی یادگار ہے جس میں سیکڑوں کالج ہیں، مچھلی شہر کالج کے علاوہ پرتاپ

گنج، بادشاہ پور میں دو کالج اور سجان گنج میں ڈگری کالج ہے، جو اس دیار کے باشندوں کے حوصلۂ علم کی مثال ہے، ہائی اسکول اور انٹر کالج کے ساتھ نرسری اسکولوں کی بھی خاصی تعداد ہے، دو قابل ذکر دینی ادارے بھی ہیں، مدرسہ صدیقیہ اور فیضان العلوم۔ دینی اداروں کا ایک سلسلہ ہے جو شہر کے نواحی بازار و مضافات میں درس و تبلیغ میں مصروف ہیں۔ بادشاہ پور، براواں، پہاڑ پور، سجان گنج وغیرہ آبادیوں میں ان کی عمارتیں اور نظامِ تعلیم سے تعلیمی بیداری کا ایک عام شعور پیدا ہوا ہے۔ سیاسی تاریخ میں بھی اس شہر کا ایک بڑا امتیاز یہ ہے کہ 1952 میں ملک کے پہلے عام انتخاب میں ملک کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ حلقہ انتخاب تھا۔ جہاں سے وہ الکشن میں کام یاب ہوتے رہے۔ میرے گاؤں کے قریب الہ آباد ڈسٹرکٹ کے کنارے ان کی پہلی تقریر ہوئی تھی ان کے لیے ایک اونچا چبوترا بنایا گیا تھا جہاں سے انھوں نے خطاب کیا تھا۔ پنڈت نہرو مولانا محمد عمر جعفری کے گھر تشریف فرما ہوئے تھے۔ ان کے عزیز عبدالرؤف جعفری مرحوم صوبائی اسمبلی میں وزیر رہے۔ یہ گھرانا سیاسی معاملات میں بھی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔

ہر سماج میں پیشہ ورانہ قابلیت اور مہارت رکھنے والوں کی کارکردگی پر معاشرے کی خوش حالی اور اس کی سربلندی کا انحصار ہوتا ہے، ملک میں علاج و معالجے سے وابستہ فن کاروں کو دانش وری کا معراج سمجھا جاتا ہے، مختلف زمانوں میں یہاں معالجوں کی موجودگی سے شہر کو شہرت حاصل تھی، جس میں حکیم بھی تھے، ہومیو پیتھ اور ایلو پیتھ شامل تھے، شہر میں سب سے پہلے مولانا کلیم جعفری کے صاحب زادے ڈاکٹر احسن جعفری ایم ڈی تھے، غالباً وہ پورے ضلعے میں پہلے مسلم ایم ڈی ڈاکٹر تھے، جون پور میں ان کا مطب ہے ان کی مسیحائی شہرت عام کی حیثیت رکھتی ہے، ان کے صاحب زادے ڈاکٹر اظہر احسن جعفری بھی جواں بخت اور جواں سال ایک ماہر معالج ہیں، تیسرے ڈاکٹر محمد اسامہ جعفری ہیں، جو الہ آباد میں مقیم ہیں، بہت بااخلاق، دستِ شفا کے مالک اور مروتوں کے پیکر ڈاکٹر مقصود احمد ہیں، یہ نیک خو اور نیک جو نبض شناس ہیں، ان کے بعد ایک اور معتبر خوش مزاج، بااخلاق اور قدر شناس ڈاکٹر محمد امجد ہیں جو اعظم گڑھ میڈیکل سے وابستہ ہیں۔ وہ ایم۔ڈی ڈگری کے لیے بھی کوشاں ہیں۔ شہر کو ان سے بڑی امیدیں ہیں۔ ان تمام معالجین سے شہر کے باشندوں کو صحت عام سے متعلق ہر طرح کی سہولت میسر ہے۔ پانچویں ڈاکٹر محمد شاداب ہیں جو دہلی میں سرکاری خدمت پر مامور ہیں، شہر میں بی یو ایم ایس بھی ہیں، ڈاکٹر اعجاز جراحی کے لیے معروف ہیں، پورے شہر میں ڈاکٹر پھول چند گپتا کو سب سے زیادہ عزت اور شہرت ملی، وہ بڑے خدا ترس اور ذی فکر انسان تھے وہ پیغمبر اسلام کا بڑا احترام کرتے تھے، ذاتِ گرامیؐ سے ایسی محبت رکھنے والا غیر مسلم میری نظر میں نہیں۔ حدیث کا مجموعہ ناچیز سے منگوایا اور 'حدیث سوربھ' (ہندی ترجمہ) کا باقاعدہ مطالعہ کرتے تھے، ان کے گرو کی لکھی ہوئی کتاب 'اسلام پرسنگ' انھیں بہت عزیز تھی، اس شہر کے یہ مشترکہ اقدار تھے۔ اسی سبب ان کا تذکرہ کیا گیا، وہ میرے سب سے اچھے دوست اور قدر دان تھے، بستر مرگ پر انہوں نے مجھے یاد کیا اور سلام بھیجا۔

ترا حسن دستِ عیسیٰ تری یاد روئے مریم

ڈاکٹر وصی الحسن کی روح کو آفریں ہو کہ ان جیسا جیالا اور آتش نفس ڈاکٹر ناچیز کی نظر میں نہیں، وہ علی گڑھ کے بی یو ایم ایس تھے۔ یہاں کے تعلیمی شعور کا نتیجہ ہے کہ شہر میں چھ اردو فارسی میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے والے اہل علم موجود رہے ہیں۔ ڈاکٹر عبدالقادر جعفری مرحوم ان کے بھائی ڈاکٹر اسامہ جعفری اور ان کی صاحب زادی ڈاکٹر سعدیہ الہ آباد یونیورسٹی سے وابستہ ہیں ڈاکٹر عبدالقیوم گورنمنٹ کالج میں ہیں۔ ڈاکٹر شکیل احمد اور ڈاکٹر رحمت اللہ قریشی مرحوم

یہ شہر کی علمی روایت کا ایک سرسری جائزہ ہے، سیاسی قیادت وسیادت کا تذکرہ قصداً نہیں کیا گیا معاشرت ومسلک کو بھی زیر بحث نہیں لایا گیا، تہذیبی وثقافتی زندگی کے روز وشب کے معمولات سے بھی گریز کیا گیا ہے، رسم ورواج یا بودوباش یا معیشت ومملکت کے پہلو کا بھی ذکر نہیں ہے، صرف ایک پہلو پر توجہ دی گئی ہے۔وہ شیراز ہند کے سیاق میں مچھلی شہر کے علمی امتیاز کو نمایاں کیا گیا ہے سماج کی تشکیل وترقی کے بیشتر اہم عناصر کا یہاں ایک اجتماع رہا ہے۔

کے نام قابلِ تحسین ہیں۔ ڈاکٹر عنایت اللہ قریشی نے ایم ٹیک کے بعد پی۔ ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ یہ شہر کے لیے بڑا اعزاز ہے۔ مچھلی شہر کے نواحی مضافات کو شامل کر لیں تو اس تعداد میں سات کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ میرا گاؤں پہاڑ پور ہے یہ پہلا گاؤں ہے جہاں پانچ اہل علم ڈاکٹریٹ کی سند رکھتے ہیں۔ راقم اس شہر کا پہلا پی۔ ایچ ڈی ہے جسے 1965 میں ڈگری دی گئی۔ میری تین بیٹیوں نے بھی یہ سند حاصل کی ہے اور دہلی میں برسرکار ہیں۔ تینوں نے دنیا کے کئی ملکوں میں اپنے تحقیقی مقالے پیش کیے ہیں جیسے چین، جرمنی، فرانس، امریکہ، کیوبا، تھائی لینڈ، اسپین، کمبوڈیا وغیرہ۔ شہر کے قریبی بازار براواں میں ڈاکٹر منیر عالم فریدی اور توقیر عالم فریدی مرحوم نے علی گڑھ سے ڈگری حاصل کی، یہ دہلی یونی ورسٹی اور جامعہ اسلامیہ سے وابستہ ہوئے۔ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ میرے تایا اشرف علی مرحوم کو سرکاری ملازمت کی بہترین کارکردگی کے لیے 1945 میں خاں صاحب کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان کے صاحب زادے سعید احمد مرحوم شاید مچھلی شہر کے پہلے ایم ایس سی ہیں جو اسلامیہ کالج گورکھپور میں لکچرر تھے۔ شکر ہے کہ عزیزم نسیم احمد کی بیٹی روشنی نے ایم ایس سی کی سند حاصل کی ہے، جو سائنس میں پہلی سند یافتہ خوش مزاج اور ذی شعور خاتون ہیں۔ میرے علم میں کئی نوجوانوں نے اردو میں ایم اے کیا۔ محمد یوسف قریشی، فیروز احمد، عظمیٰ بانو اور نعمت اللہ قریشی قابل ذکر ہیں۔ وہ حافظ قرآن بھی ہیں، ایل ایل ایم کی سند حاصل کرنے والے ہیں۔ وہ ذی شعور اور فلاحی کاموں میں سرگرم ہیں۔ جناب سیف الاسلام شہر کے ایک مشہور قانون داں مسلم ایڈوکیٹ ہیں، اور اچھی نظر کے مالک ہیں۔

یہ شہر کی علمی روایت کا ایک سرسری جائزہ ہے، سیاسی قیادت وسیادت کا تذکرہ قصداً نہیں کیا گیا۔ معاشرت ومسلک کو بھی زیرِ بحث نہیں لایا گیا، تہذیبی وثقافتی زندگی کے روز وشب کے معمولات سے بھی گریز کیا گیا ہے، رسم ورواج یا بود وباش یا معیشت ومملکت کے پہلو کا بھی ذکر نہیں ہے، صرف ایک پہلو پر توجہ دی گئی ہے۔ وہ شیراز ہند کے سیاق میں مچھلی شہر کے علمی امتیاز کو نمایاں کیا گیا ہے سماج کی تشکیل وترقی کے بیشتر اہم عناصر کا یہاں ایک اجتماع رہا ہے۔ علمائے دین کے ساتھ ادیب و دانشور، ڈاکٹر، انجینئر، وکیل، سیاسی رہنماؤں کی ایک کہکشاں کی موجودگی اس علاقے کی خاص پہچان بن گئی ہے۔ ان کے تذکرے کا مقصد ہے کہ نئی نسل ماضی وحال کے آئینے میں اپنی تصویر اور تقدیر دیکھ سکے اور وہ بزرگوں کی بیش بہا خدمات اور ان کے آثار سے متعارف ہو سکیں۔ علامہ اقبال کی تاکید ہے۔

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

■

Prof. Abdul Haq
Ex. Profesoor
2315, Hudson Line kingsway camp,
Delhi-110009
Cell:9350461394

دلی کا ایک گمنام شاعر
منوہر لال ہادی

کرامت علی کرامت

رٹائرمنٹ کے بعد موصوف اردو شعر و ادب کی خدمت میں منہمک ہوگئے۔ گویا ساری زندگی کے پختہ تجربات کا نچوڑ صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کا تہیہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی کم عرصے میں تقریباً دو سو سانیٹ اور چار سو غزلیں لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ 1978 تک ان میں سے صرف چھپن غزلوں اور چھپن سانیٹ کا انتخاب ایک مجموعۂ کلام کی شکل میں مرتب کرلیا جس کا نام انھوں نے 'بصیرت کی بوند' رکھا تھا۔ اس سچے عاشق اردو کی یہ آخری خواہش تھی کہ ان کا یہ چھوٹا سا شعری مجموعہ منظر عام پر آجائے۔

منوہر لال ہادی کے نام اور کارناموں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ اس کا سبب یہ ہے کہ وہ ترقی پسندوں اور حلقۂ ارباب ذوق کے شاعروں کا ہمعصر ہونے کے باوجود کسی گروہ سے وابستہ نہیں رہے اور انھوں نے اپنا کلام بھی بہت کم رسائل میں چھپوایا۔ ان کی کوئی کتاب بھی نہیں چھپی تو انھیں کسی نقاد کی پشت پناہی بھلا کیسے حاصل ہوتی؟

انھوں نے 17 جون 1913 کو بمقام لاہور اس عالمِ خیر و شر میں آنکھیں کھولیں۔ اس وقت کے پنجاب سے بی اے اور ادیب فاضل تک کی تعلیم حاصل کی۔ وہاں سے وہ دہلی چلے آئے۔ نئی دہلی میونسپل کمیٹی میں 1934 تا 1958 اور میونسپل کارپوریشن آف دہلی میں 1958 تا 1971 تک ملازمت کی۔ 5 جولائی 1971 کو انھوں نے ملازمت سے سبک دوشی اختیار کی۔ دورانِ ملازمت انھوں نے شاعری کی مگر نہ کے برابر۔ انھوں نے چند نظمیں لکھیں جن میں سے دو 'ہمایوں' لاہور کے 1938 کے دو مختلف شماروں میں، پریت لڑی، امرتسر کے 1939 کے کسی شمارے میں 'شعاعیں' دہلی کے 1948 کے کسی شمارے میں شائع ہوئیں۔ اس زمانے میں چند سانیٹ بھی لکھے جو 'ساقی' دہلی میں چھپے لیکن (جیسا کہ انھوں نے راقم الحروف کے نام اپنے ایک خط میں اعتراف کیا ہے) ریٹائر ہونے سے قبل انھوں نے صنف غزل میں کبھی طبع آزمائی نہیں کی۔ یعنی ان کی غزل گوئی کی تاریخ 1971 کے بعد کے عرصے کو محیط ہے۔ حنیف کیفی نے اپنی کتاب 'اردو شاعری میں سانیٹ' کے صفحہ 177 میں منوہر لال ہادی کا نام 'اتفاقی سانیٹ نگاروں' کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ عنوان چشتی نے اپنی کتاب 'اردو شاعری میں ہیئت کے تجربے' کے صفحہ 184 میں بھی سانیٹ نگار کی حیثیت سے منوہر لال ہادی کا ذکر کیا ہے۔

رٹائرمنٹ کے بعد موصوف اردو شعر و ادب کی خدمت میں منہمک ہوگئے۔ گویا ساری زندگی کے پختہ تجربات کا نچوڑ صفحۂ قرطاس پر بکھیرنے کا تہیہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت ہی کم عرصے میں تقریباً دو سو سانیٹ اور چار سو غزلیں لکھنے میں کامیاب ہوگئے۔ 1978 تک ان میں سے صرف چھپن غزلوں اور چھپن سانیٹ کا انتخاب ایک مجموعۂ کلام کی شکل میں مرتب کرلیا جس کا نام انھوں نے 'بصیرت کی بوند' رکھا تھا۔ اس سچے عاشق اردو کی یہ آخری خواہش تھی کہ ان کا یہ چھوٹا سا شعری مجموعہ منظر عام پر آجائے۔ غالب نے سچ کہا ہے۔

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

منوہر لال ہادی سے میرا سب سے پہلا غائبانہ تعارف اس وقت ہوا جب انھوں نے 'شاخسار' کٹک کے لیے اپنا کلام بھیجنا شروع کیا۔ میں اس وقت حضرت امجد نجمی کے زیر سرپرستی، کٹک سے دو ماہی 'شاخسار' نکالتا تھا۔ غالباً 1971 کی بات ہے ہادی کے کلام سے بے حد متاثر ہوا۔ ہم نے موصوف کی بہت سی تخلیقات شائع کیں۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ بہت بزرگ شاعر ہیں مگر ان کے کلام میں کہیں بھی بڑھاپے کے آثار نہیں تھے۔ ان کے ہر شعر سے تازگی، توانائی اور شگفتگی ابلتی تھی۔ ہادی صاحب کی نو بہ نو تازہ بہ تازہ تخلیقات نظر سے گزرتی رہیں اور دامن دل کو اپنی جانب کھینچتی رہیں۔ میں نے محسوس کیا کہ اردو شعر و ادب کے اس خاموش خدمت گزار سے ضرور ملنا چاہیے۔ دہلی جانے کا اتفاق ہوا تو میں 137 سیکٹر III آر کے پورم کو ان سے ملنے کے لیے گیا۔ گھر والوں نے بتایا کہ وہ فٹ پاتھ میں چہل قدمی کے لیے گئے ہیں۔ جب ان کی تلاش میں گیا تو تھوڑی ہی دور میں مل گئے۔ گھٹنے میں بے حد درد تھا۔ اس لیے ایک ایک قدم چلنے کے لیے ایک ایک منٹ لیتے تھے۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد گھر پہنچے۔

گھر میں کچھ دیر تک ادبی گفتگو ہوئی۔ اس کے بعد وہاں سے میں چلا آیا۔ بعد ازاں جب بھی مجھے دہلی جانے کا اتفاق ہوتا، ان سے میں ضرور ملاقات کا شرف حاصل کرتا۔ وہ مجھ سے بہت بڑے تھے۔ اس لیے میں انھیں اپنا بزرگ سمجھتا تھا۔ وہ بھی مجھے اپنا عزیز سمجھتے تھے۔ ہر ہفتے دو ہفتوں میں مجھے خط لکھتے۔ چاہے میری طرف سے جواب دینے میں کوتاہی ہی کیوں نہ ہو، لیکن وہ ضرور خط لکھتے رہتے۔ انھوں نے جب اپنا شعری مجموعہ 'بصیرت کی بوند' مرتب کرلیا تو اس کا مسودہ میرے پاس بھیج دیا۔ میں نے ان کو لکھا کہ میں ہریانہ کے گورنر عالی جناب سید مظفر حسین برنی سے اس کا مقدمہ لکھوا رہا ہوں۔ اس کے جواب میں انھوں نے مجھے لکھا ''اول تو برنی صاحب عدیم الفرصت ہیں۔ پھر مجھ سے ناچیز کے مسودے پر کچھ لکھنا ان کے شایانِ شان نہ ہوگا۔ ایک تو سرکاری شان۔ ایک ادبی شان۔ نتیجتاً میں پریشان ہوتا رہوں گا۔ ازراہِ کرم مسودہ واپس منگانے کے لیے کچھ کیجیے۔'' لیکن برنی صاحب نے میری خواہش کی تکمیل کرکے 'پیش لفظ' لکھ دیا اور منوہر لال ہادی کو براہِ راست دہلی بھیج دیا۔ اسے پاکر ہادی صاحب بہت خوش ہوئے۔ انھوں نے مجھے خط کے ذریعے یوں اطلاع دی ''ابھی ابھی ڈاک سے ہریانہ سے ایک پیکٹ آیا ہے جس میں میرا مسودہ مع آپ کا تحریر کردہ تعارف اور برنی صاحب کے تحریر کردہ 'پیش لفظ' ہیں۔ دل کی اس گہرائی سے ممنون ہوں کہ زیادہ لکھ نہیں سکتا۔''

منوہر لال ہادی نے 'بصیرت کی بوند' کا مسودہ مع پیش لفظ 'فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی' کو مالی امداد کے لیے بھیج دیا۔ وہاں سے مالی امداد کی رقم منظور ہوگئی۔ ہادی صاحب تو جسمانی طور پر اپاہج تھے۔ اس کو چھپوانا ان کے بس کی بات نہیں تھی۔ انھوں نے پھر میرے پاس وہ مسودہ بھیج دیا کہ اشاعت کے سلسلے میں کچھ کرسکوں۔ میں نے مخمور سعیدی سے مشورہ کیا کہ کیا کیا جائے۔ انھوں نے مشورہ دیا کہ شریف الحسن نقوی، سکریٹری دہلی اردو اکادمی کو خط لکھیے کہ ''منوہر لال ہادی بوڑھے آدمی ہیں۔ ان کا مجموعہ دہلی اردو اکادمی کی طرف سے چھپوا دیں۔'' میں نے شریف الحسن نقوی کو خط لکھا کہ 'بصیرت کی بوند' کو اکادمی کی طرف سے چھپوا دیں۔ سید مظفر حسین برنی نے بھی ان کو فون پر کہا تھا لیکن میرے نام نقوی صاحب کا خط آیا کہ ''ہادی صاحب کو کہیے کہ فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی کے مالی تعاون سے کتاب چھپوالیں۔'' یہاں تو مالی تعاون کا سوال نہیں تھا۔ انھیں پہلے سے اس مالی تعاون کی اطلاع مل چکی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد منوہر لال ہادی کی طرف سے خط آنا بند ہوگیا۔ ایک دن اچانک ان کے بیٹے (جو ایک آئی اے ایس افسر تھے) کا خط آیا کہ والد صاحب کی آنکھوں میں 'گلاکوما' ہوگیا ہے اور وہ لکھ پڑھ نہیں سکتے۔ اب وہ اپنا شعری مجموعہ چھپوانے میں دلچسپی نہیں رکھتے۔ مسودہ واپس کردیجیے۔ لہٰذا ان کا مسودہ میں نے واپس کردیا۔

مظہر امام کا جب دہلی تبادلہ ہوا تو میں نے انھیں منوہر لال ہادی کے بارے میں پتہ لگانے کے لیے لکھا۔ انھوں نے پتہ لگایا کہ وہ لوگ اب وہاں نہیں رہتے۔ پھر مجھے جنوری 1991 میں لال قلعے کے مشاعرے میں شرکت کرنے کے لیے دلی جانا پڑا۔ مظہر امام صاحب کے یہاں چند دنوں کے لیے مجھے مہمان بن کر ٹھہرنا پڑا۔ ایک روز میں اور مظہر امام منوہر لال ہادی کے بارے میں تحقیق کرنے کے لیے نکلے۔ ان کے پرانے ٹھکانے پر پہنچے۔ گھر والوں نے کہا کہ وہ لوگ 'منیرکا' چلے گئے ہیں۔ ان سے منیرکا کا پتہ لے کر ہادی کے نئے مکان پر پہنچے۔ وہاں ان کی اہلیہ اور بہو تھیں۔ بڑے تپاک سے ملیں۔ معلوم ہوا کہ ہادی صاحب دو ڈھائی سال ہوئے گزر گئے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ 1988 کے لگ بھگ ان کا انتقال ہوگیا ہوگا۔ جب ان سے دریافت کیا گیا کہ ان کے شعری مجموعے کا مسودہ کہاں ہے تو ان لوگوں نے کہا کہ ان کے ایک دوست لے گئے ہیں۔ وہ لوگ دوست کا نام بتا نہیں سکے۔ البتہ اتنا کہا وہ کبھی کبھی ٹی وی میں نظر آتے ہیں۔ اس روز ہم لوگ گھر واپس آگئے۔ اس کے بعد بھی میرا تجسس جاری رہا کہ اردو ادب کا یہ بیش بہا خزانہ آخر گیا کہاں۔ ہادی کی زبانی میں نے ان کے ملنے والوں میں محسن زیدی کا نام سنا تھا۔ اس وقت محسن زیدی دلی چھوڑ کر لکھنؤ جاچکے تھے۔ ان سے میں نے خط کے ذریعے ان مسودوں کے بارے میں دریافت کیا۔ انھوں نے کہا کہ شاید کہ سیماب سلطانپوری کے پاس ہو۔ اب سیماب صاحب کا پتہ میرے آشناؤں میں سے کسی کے پاس نہیں تھا۔ البتہ مظہر امام کے ایک مضمون میں سیماب سلطانپوری کا ذکر پڑھا، تو سیماب صاحب سے ربط قائم کرنے کی امید بندھی۔ دسمبر 2009 میں مجھے غالب اکادمی کے سمینار اور مشاعرے میں شرکت کی غرض سے دلی جانے کا اتفاق ہوا۔ سمینار اور مشاعرے میں سیماب سلطانپوری سے ملاقات ہوئی۔ دریافت کرنے پر پتہ چلا کہ منوہر لال ہادی کے مجموعۂ کلام 'بصیرت کی بوند' کا مسودہ ان کے پاس محفوظ ہے۔ اب بھی یہ سوال رہ جاتا ہے کہ اس مسودے میں چھپن غزلیں اور چھپن سانیٹ شامل ہیں، باقی غزلیں اور سانیٹ کہاں ہیں؟ بہرکیف کوئی محقق یا کوئی ادبی ادارہ ان تمام چیزوں کو یکجا کرکے شائع کرسکے تو اردو کی بڑی خدمت انجام ہو پائے۔

> **منوہر لال ہادی کی سخن وری نصف صدی پر محیط ہے۔ ان کے زبان و بیان میں رعنائی اور زیبائی ہے۔ انھوں نے مغربی شاعری کی مقبول صنف سانیٹ (Sonnet) کو اظہار خیال کے لیے انتخاب کیا۔ اردو میں کئی اور شاعروں نے بھی سانیٹ لکھے ہیں۔ گو بیشتر نے محض منہ کا مزہ بدلنے کی خاطر سانیٹ لکھی ہیں۔ اس کے برخلاف جناب ہادی نے ایمان داری اور استواری کے ساتھ اس صنفِ سخن سے انصاف کیا ہے۔**

سید مظفر حسین برنی کے 'پیش لفظ' کا اقتباس تبرکاً درج ذیل کیا جارہا ہے (جو ہنوز غیر مطبوعہ ہے)، ملاحظہ فرمایئے:

''ہمعصر اردو شاعری کے مطالعے سے کبھی کبھی محسوس ہوتا ہے جیسے ہمارے شاعر صرف غزل گوئی تک محدود ہوکر رہ گئے ہیں۔ مشاعروں کے علاوہ رسائل و جرائد کے شعری ایوان میں بھی غزل کی ہی حکمرانی نظر آتی ہے۔ غزل یقیناً ایک شیریں اور شگفتہ صنفِ سخن ہے اور اس مقام و مرتبے کی ضرور حقدار ہے، لیکن اردو شاعری کی شہرت و مقبولیت میں دیگر اصنافِ سخن کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔

یہی حال شاعروں کا بھی ہے۔ چند خوش نصیب نظم گو اردو شعرا کو چھوڑ کر، جو درخشندہ آفتاب کی مانند تھے، اکثر گمنام اور غیر معروف رہے۔ یہ بات نہیں کہ ان کے کلام میں گہرائی و گیرائی کا فقدان تھا یا پھر ان کا کلام عوام کے جذبات کی ترجمانی نہیں کرسکا بلکہ انھیں وہ ذرائع حاصل نہ ہوسکے جن سے ان کی تشہیر ہوتی۔ ان شاعروں نے خودنمائی کو کبھی جائز نہیں سمجھا۔ جناب منوہر لال ہادی کا نام صرف اسی لیے گوشۂ گمنامی میں رہا کہ وہ شعر کو شعر سمجھتے رہے اور اسے سماجی وقار کے حصول کا وسیلہ بنانے سے ہمیشہ گریز کیا۔

جناب منوہر لال ہادی کی سخن وری نصف صدی پر محیط ہے۔ ان کے زبان و بیان میں رعنائی اور زیبائی ہے۔ انھوں نے مغربی شاعری کی مقبول صنف سانیٹ

(Sonnet) کو اظہارِ خیال کے لیے انتخاب کیا۔ اردو میں کئی اور شاعروں نے بھی سانیٹ لکھے ہیں۔ گو بیشتر نے محض منہ کا مزہ بدل لینے کی خاطر سانیٹ لکھی ہیں۔ اس کے برخلاف جناب ہادی نے ایمان داری اور استواری کے ساتھ اس صنفِ سخن سے انصاف کیا ہے۔ مثال کے طور پر یہ سانیٹ ملاحظہ فرمائیں۔

سوچتا ہوں کیوں حبابوں کے تعاقب میں ہے دل
چھیڑتے ہی بھاگ جاتے ہیں نظر آتے نہیں
لیکن فوراً گرم آنسو بن کے آتے ہیں قریں
بے نیازی سے بھرے ہیں ان کے جامِ آب و گِل

سوچتا ہوں کیوں سرابوں کے تعاقب میں ہیں لوگ
نکہتِ مہر و مروت تو انھیں بھاتی نہیں
اور یک طرفی محبت ان کو خوش آتی نہیں
آ کے شہر بھر سے لوگوں کو ڈس جاتا ہے روگ

سوچتا ہوں کیوں حوالوں کے تعاقب میں ہے عقل
جانے کیوں ہے ان کو خیرہ کُن سوالوں سے گریز
جستجو زادہ خیالوں کے غزالوں سے گریز
روشنی سے ڈرنے والی رات کی کرتے ہیں نقل

سوچتا ہوں ہم سمجھتے کیوں نہیں اپنی کمی
کیوں سمجھتے ہیں کہ آنکھوں میں نہیں کچھ تیرگی

انھوں نے علامہ اقبال اور فراق گورکھپوری کے علاوہ امنِ عالم اور فلاحِ بشری کے بہترین علم برداروں، مہاتما گاندھی اور مدر ٹریسا (Mother Teresa) کی بے حد ستائش کی ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ایسے مضامین کے لیے اگر تنگنائے غزل بقدرِ ظرف نہیں تو ان کے لیے سانیٹ کے وسیع دامن میں بے حد گنجائش ہے۔

غزلوں میں بھی ہادی صاحب نے اپنی جولانیٔ طبع کے جوہر دکھائے ہیں۔ ان کی غزلوں میں الفاظ کی حسین مرصع کاری ہے اور اس کے ساتھ ساتھ انفرادی شعری آہنگ کو بھی برقرار رکھا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار اس کی روشن مثالیں ہیں۔

کیا بات کہ تصویر نہ کھینچی گئی ہادی
وہ شکل خیالی بھی تھی، محرومِ بدن بھی
کوئی چراغ تو اب اس کے سامنے رکھ دو
کہ دل یگوں سے رہِ وصلِ ذات میں گم ہے

(دستخط: سید مظفر حسین برنی)

منوہر لال ہادی کے سانیٹوں میں موضوعات کا تنوع ہے۔ خیالوں میں تازگی ہے۔ ترسیل و ابلاغ کے دوران جذبات کی اضافی فراوانی پائی جاتی ہے۔ زندگی کے تجربات میں وسعت بھی ہے اور گہرائی بھی۔ بڑی بات یہ ہے کہ ان سانیٹوں کو پڑھتے وقت قاری کے ذہن میں ابھرتی ہوئی کیفیات و احساسات کی موجیں آپس میں مل کر ایک سالم کلیت (Totality) کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی صورتِ حال ان کی غزلوں اور رباعیوں میں بھی نظر آتی ہے۔

موصوف کا ایک اور سانیٹ ملاحظہ فرمائیے جو انسانی نفسیات کی صحیح مرقع سازی کرتا ہے۔ یہ سانیٹ ماہنامہ جامعہ، دہلی (مدیر ضیاء الحسن فاروقی، بابت ماہ اپریل 1986 ص6) پر شائع ہوا تھا۔ ملاحظہ فرمائیے۔

سوچتا ہوں لوگ جس تصویر کو کہتے ہیں خواب
وہ سحابِ آرزو کا سایۂ رنگیں نہ ہو
کاوشِ بے کیف کا اجرِ طلسم آگیں نہ ہو
یا کہیں ضدی سوالوں کا نہ ہو دلکش جواب

سوچتا ہوں لوگ جس غنچے کو کہتے ہیں گلاب
اس میں ان کی صورتِ دلبر نظر آتی نہ ہو
اس کی خوشبو ان پہ کوئی یاد برساتی نہ ہو
اور جگا دیتی نہ ہو بیتے ہوئے لمحوں کا باب

سوچتا ہوں لوگ کہتے ہیں جسے کارِ ثواب
اس کے رنگِ شوخ میں رنگِ غرض شامل نہ ہو
ماتموں کا ظاہری چہرہ کہیں باطل نہ ہو
ان کو آسانی نہ ہو خلدِ بریں کی آب و تاب

سوچتا ہوں جس کو کہتے ہیں سخن ور اضطراب
ہو نہ ان کی نارسائی کا عطا کردہ عذاب

سانیٹ 14 لائنوں پر مبنی ایک نظم ہوتی ہے جن میں پہلی آٹھ لائنوں کو Octet اور بعد والی چھ لائنوں کو Sestet کہا جاتا ہے۔ تمام لائنیں ہم وزن ہوتی ہیں۔ ہم قافیہ مصرعوں (لائنوں) کے الگ الگ پیٹرن کے مطابق الگ الگ سانیٹ کے الگ الگ نام دیے جاتے ہیں۔ مثلاً

شیکسپیئری سانیٹ: اب اب/ ج د ج د/ ہ و ہ و/ ز ز
اسپنسری سانیٹ: اب اب/ ب ج ب ج/ ج د ج د/ ہ ہ
پٹرارچن یا اطالوی سانیٹ: اب ب ا/ اب ب ا/ ج د ج د/ ہ ہ

پٹرارچن سانیٹ میں بڑے رد و بدل کی گنجائش ہوتی ہے اس کے Sestet میں (i) ج د ج د ج د (یا) (ii) ج د ہ ج د ہ (یا) (iii) د ہ ہ د ہ ہ وغیرہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ممکن ہے منوہر لال ہادی نے مختلف قسم کے سانیٹ لکھے ہوں، لیکن اس بابت حتمی طور پر کچھ کہا نہیں جا سکتا، کیونکہ ان کے تمام سانیٹ ہمارے پیشِ نظر نہیں ہیں۔ ہمارے سامنے ان کے سانیٹ کی جو مثالیں ہیں، ان کی حیثیت اطالوی سانیٹ کی یہ شکل ہے۔

اب ب ا/ ج ب ب ج/ د ج ج د/ ہ ہ

جہاں تک ہادی کی لفظیات کا تعلق ہے، یہ نہ تو ہماری کلاسیکل شاعری کی طرح گل و بلبل، ساغر و مینا جیسی لفظیات کو قبول کرتی ہے: ترقی پسندوں کی طرح دار و رسن، تیغ و تبر، آنچل اور پرچم جیسی لفظیات کو راہ دیتی ہے، اور نہ ہی جدیدیوں کی طرح آسمان، دریا، سمندر، بادل، پیاس انا وغیرہ لفظیات کو استعمال میں لاتی ہے۔ موصوف کی لفظیات انسانی نفسیات سے وابستہ غیر مرئی (Transcendental) الفاظ کے اردگرد گھومتی رہتی ہے اور انھیں اضافت کے ذریعے جوڑ کر اشارے، کنائے کی مدد سے نئے نئے پیکر تراشنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ مثلاً ہادی نے ادراک، جبلت، فراست، ذوق، تشکیک، ضمیر، دل، خواب، فکر، تغافل، یقین، عزم، تمنا، اغراض، صداقت، تحیر، امکان جیسے تجریدی (Abstract) الفاظ کا بکثرت استعمال کیا ہے۔ ان غیر مرئی الفاظ کو مرئی الفاظ سے جوڑ کے وہ کس طرح پیکر تراشی کا عمل انجام دیتے ہیں، اس کی مثالیں درج ذیل ہیں:

چشمِ ادراک، بتِ تشکیک، در و بامِ ضمیر، بحرِ دل کی موج، شہرِ دل، راسخ یقیں کی مشعلیں، وادیٔ عزمِ جواں، خلاءِ دلِ زار کی وسعتیں، بتِ تمنا کی انگڑائیاں وغیرہ۔

مصدر پر ختم ہونے والی ترکیبوں کی مثالیں بھی درج ذیل ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ شاعر کا بال و پر اسے کتنی اونچی اڑان بھرنے پر مائل کرتا ہے:

پیکرِ اغراض کو جامِ زہرآب پلانا، صداقت کے شرر سے حسنِ باطل کو جلانا، بارانِ تحیر میں شرابور ہونا، دامانِ وقت میں حادثات کا دریا ہونا، لمحوں کی فوج کا ڈٹ کر مقابلہ کرنا، چہرۂ اسرار سے چادر کا سرکنا، ذات کے گلزار میں چلنا، پیوندِ قبا کا ہنسنا، حیاتِ ایوانِ امکاں کا بچھڑے دوستوں کو آواز دینا وغیرہ۔

سانیٹ اور غزل کے علاوہ موصوف نے رباعیاں بھی کہی ہیں۔ تینوں اصناف میں مذکورہ بالا خصوصیات بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔

ان کی آواز ایک الگ تھلگ آواز ہے جو ان کے ہمعصروں یا ان کے بعد آنے والی پیڑھی کے شاعروں

میں سے کسی کی آواز سے نہیں ملتی۔ ان کی شاعری کی فکری لے بہت کم کہیں اور نظر آتی ہے۔ بعض معنوں میں انھیں مابعدالطبیعی (Metaphysical) شاعر کا لقب دیا جانا زیادہ مناسب ہوگا۔ ان کی شاعری میں کہیں کہیں تصوف کی چاشنی بھی پائی جاتی ہے۔

ان کی غزلوں میں تغزل (یعنی حسن وعشق کی زبان میں گفتگو) نامی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ اس شے کا وجود ہوتا بھی تو کیسے؟ انھوں نے سانیٹ نگاری اور نظم گوئی پر اپنی جوانی وقف کردی۔ بڑھاپے میں غزل گوئی کی طرف متوجہ ہوئے جب کہ انسان ہر وقت ماضی کے تاسف، موت وحیات کے تسلسل اور اپنی غیر معین عاقبت کی فکر میں مبتلا رہتا ہے۔ ایسی صورت میں ہادی کا مابعدالطبیعیات کی طرف مائل ہونا، نہایت فطری تھا۔ ہادی کی غزلوں کے چند منتخب اشعار ملاحظہ فرمائیے۔

زندگی! یا تو کوئی فرہادِ نو ایجاد کر
یا بتا اس عہد میں لائے گا جوئے شیر کون
گردشِ ایام ہے یا خامیِ عقل و شعور
کون جانے کون دیتا ہے سزا، تعزیر کون

دکھا سکی نہ معانی کی شکلِ ہوش ربا
شعاعِ حرف و بیاں غیر معتبر نکلی

چشمِ ادراک کو ہر راز عیاں لگتا ہے
ایک دریا سا ہر اک شے میں رواں لگتا ہے
جس کو بھی دیکھیے پرواز پہ مائل ہے یہاں
ذرّے ذرّے میں کوئی ذوق نہاں لگتا ہے
وہ جو رقصاں ہے چمن میں بت تشکیک نہ ہو
ایک اک پھول ہی تصویرِ گماں لگتا ہے
تم نے کیا سوچ کے ڈھائے ہیں در و بامِ ضمیر
ہم کو اس بات میں امکانِ زیاں لگتا ہے

چھٹ کے یہ قیدِ مکاں سے لامکاں تک جائے گی
بحرِ دل کی موج بحرِ بے کراں تک جائے گی
آرزو کتنا سفر کر پائے گی، مجھ سے نہ پوچھ
چل کے شہرِ دل سے ایوانِ زیاں تک جائے گی
اک ذرا مہمیز کر پھر دیکھ اس کے بال و پر
فکر کی پرواز بامِ آسماں تک جائے گی
پوچھتا پھرتا ہوں میں ہر راہ سے دیوانہ وار
زیست آئی ہے کہاں سے اور کہاں تک جائے گی

منوھر لال ھادی اپنے ھم عصر شاعروں سے ھٹ کے الگ تھلگ آواز رکھنے والے، فکری لے سے معمور مابعداطبیعیاتی، فلسفیانہ اور متصوفانہ شعور سے ھم آھنگ شاعری کے خالق اور انسانی نفسیات کے دروں میں واقع ھونے والی واردات کے باھمی رشتوں پر گھری نظر رکھ کر ان کو شعری پیکر میں ڈھالنے والے ایک بلندپایہ شاعر تھے۔ ایسے اھم شاعر کا گوشۂ گمنامی میں چلا جانا، اردو کے شعر و ادب کی بدقسمتی نھیں تو اور کیا ھے؟

کون کہتا ہے کہ محروم اثر ہے فطرت
ذوق کی شرط ہے فردوسِ نظر ہے فطرت
سیکڑوں روپ ہیں اس کے، کوئی کیا سمجھے گا
پھول ہے، خار ہے، سبزہ ہے، ثمر ہے فطرت

تو ہے سورج، میں ہوں ذرّہ، تو ہے ساگر بوند میں
دوں عقیدت کے سوا کس چیز کا نذرانہ میں

کب سے تیرے شہر میں کرتا ہوں دریوزہ گری
پھر بھی تیری شکل سے ہوں آج تک بیگانہ میں

زمیں کی بات چھوڑو کہکشاں جس سے ہوئی تعمیر
کہاں گوندھی گئی وہ گِل نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے
کبھی گرویدۂ خواہش، کبھی ہے ترکِ ہر شیدا
تضاداتِ دلِ غافل نہ تم سمجھے نہ ہم سمجھے

بارانِ تحیر میں شرابور ہوئے ہیں
جو دل تجھے آئینے میں پہچان رہے ہیں
جلتا ہوں اگر آتشِ غم میں تو نہیں غم
اس آگ میں کیا کیا دلِ معصوم جلے ہیں

کوئی دریا کبھی بہتا نہیں پانی کے بغیر
جینا پڑتا ہے مگر ہم کو جوانی کے بغیر
کتنے افسانے سنے، کتنے مناظر دیکھے
یاد کچھ بھی نہ رہا اپنی کہانی کے بغیر
جانے کیا بات ہے کیوں زندگی لافانی
رہ نہیں سکتی کہیں عالمِ فانی کے بغیر
آرزوؤں کے دیے، جہد و تجسس کے چراغ
تو نہیں دیتے کبھی سوزِ نہانی کے بغیر

تصویر کے دو رخ تھے مگر دونوں تھے دھندلے
پہچانی گئی شکل اِدھر کی نہ اُدھر کی
یہ ایک کرن نور کی، وہ ہلکی سی جھلمل
اک شمع ہے وجدان کی، اک علم و ہنر کی
یہ سوچ کے کرتا ہوں کتابوں سے محبت
ہوتی رہے تسکین ذرا عقل و نظر کی

غزل کی طرح ان کی رباعیوں میں بھی فکری لے ایک حاوی رجحان بن کر ابھرتی ہے جس کی تعقل پسندی ان کی شاعری کو مابعدالطبیعاتی شعرا کی تخلیقات کا ہم پلہ بنا دیتی ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے (یہ تمام رباعیاں 'مفعول مفاعلن مفاعیلن فع' یا 'مفعول مفاعلن مفاعیل فعل' کے وزن پر لکھی گئی ہیں۔''

عرفاں کی تلاش میں پریشاں کیوں ہو
پرچھائیں کی جستجو میں حیراں کیوں ہو
عرفاں کے بنا بھی زندگی ہے مسعود
اس رازِ سعید سے گریزاں کیوں ہو

روتا ہوں زوالِ آدمِ خاکی پر
مبنی یہ ہوس خرد کی چالاکی پر
معکوس مفاد کی پری ہنستی ہے
اس بے کس و نابکار نم ناکی پر

غرض کہ منوہر لال ہادی اپنے ہم عصر شاعروں سے ہٹ کے الگ تھلگ آواز رکھنے والے، فکری لے سے معمور مابعدالطبیعیاتی، فلسفیانہ اور متصوفانہ شعور سے ہم آہنگ شاعری کے خالق اور انسانی نفسیات کے دروں میں واقع ہونے والی واردات کے باہمی رشتوں پر گہری نظر رکھ کر ان کو شعری پیکر میں ڈھالنے والے ایک بلند پایہ شاعر تھے۔ ایسے اہم شاعر کا گوشۂ گمنامی میں چلا جانا، اردو کے شعر و ادب کی بدقسمتی نہیں تو اور کیا ہے؟ ضرورت اس بات کی ہے کہ کوئی سچا عاشقِ اردو ایسا نکلے جو ہادی کی بکھری ہوئی گم شدہ تمام تخلیقات کی بازیافت کرے اور اردو کا کوئی ادارہ ایسا نکلے جو ان سب کی طباعت کا انتظام کرے تا کہ اردو کے ادبی سرمایے میں ایک اور قابلِ قدر اضافہ ہو سکے۔

■

Prof. Karamat Ali Karamat
Rahmat Ali Building, Devan Bazar
Cutteak - 753001 (Odisha)
Mob.:9861579171
Email.: karamatalikaramat@yahoo.com

تمل ادب کا خلیل جبران کوی کو عبدالرحمٰن

حیات افتخار

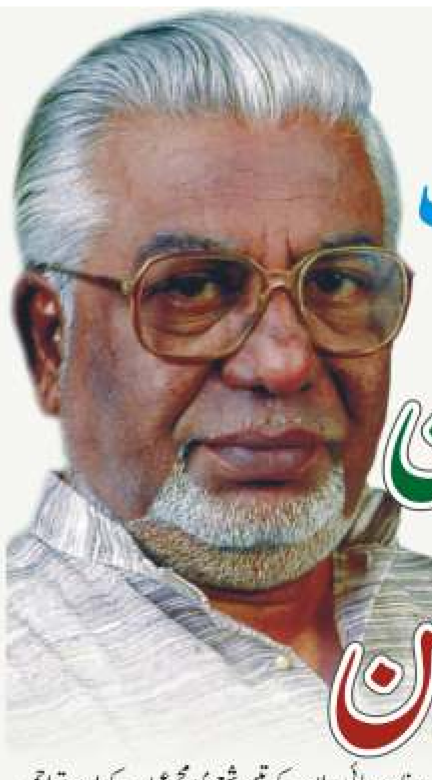

عصری تمل شاعری کے ملک الشعرا کہلانے والے کوی کو عبدالرحمٰن کا شمار تمل زبان کے ان جدید شعرا میں ہوتا ہے جو رجحان ساز بھی ہیں اور عہد ساز بھی۔ تمل زبان میں جدید نظم یا جدید شاعری کے علمبردار ہونے اور اس کو رجحان کے طور پر فروغ دینے کی وجہ سے بھی آپ رجحان ساز قرار پائے اور عہد ساز اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ جدید تمل شاعری میں بیسویں صدی کا نصف آخر آپ ہی سے منسوب ہے جدید تمل شعرا میں آپ کا نام سرفہرست رکھا جاسکتا ہے۔ تمل زبان کے عام اور سنجیدہ قاری دونوں کے درمیان یکساں طور پر مقبول ہونے کا اعزاز آپ کو حاصل ہے۔ اسی وجہ سے آپ کو تمل کے ادب نواز طبقے نے 'کوی کو' کے لقب سے نوازا جس کے معنی ہیں ملک الشعرا جو آپ کے نام کا جزو لاینفک بن گیا۔

بعض نقادوں نے ان کی فکر انگیز شاعری سے متاثر ہو کر یہاں تک کہہ دیا کہ اگر ان کی شاعری کا انگریزی میں ترجمہ شائع کیا جائے تو ممکن ہے کہ انھیں نوبل انعام سے نوازا جائے۔

تمل زبان کے ایک اور ممتاز شاعر اور فلمی نغمہ نگار کنا داسن نے ایک جگہ تحریر کیا ہے کہ ''خلیل جبران کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے اس بات کا احساس ستاتا تھا کہ تمل زبان میں اس طرز کا ادیب کوئی نہیں ہے لیکن جب کوی کو عبدالرحمٰن کو پڑھنا شروع کیا تو ایسے لگا کہ تمل زبان میں بھی عبدالرحمٰن کی صورت میں ایک ایسا مفکر شاعر کا ظہور ہو چکا ہے جن کی نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کیا جائے تو دنیا حیرت سے پوچھے گی کہ یہ کون شاعر ہے؟''

کوی کو سید عبدالرحمٰن کی پیدائش مدورائی میں 9 نومبر 1937 کو ہوئی اور وفات 2 جون 2017 کو چینئی میں ہوئی۔ اس طرح انھوں نے تقریباً 80 سال کی عمر میں وفات پائی۔ ان کے تین شعری مجموعوں کے اردو تراجم ہوئے جن میں ایک شعری مجموعہ 'جگنوؤں سے ایک خط' اور دوسرا مجموعہ 'کلام مجذوب' تھا۔ اول الذکر کا ترجمہ مرحوم سجاد بخاری نے کیا تھا۔ آخر الذکر کا ترجمہ مظفر شہ میری نے کیا تھا۔ اس سے قبل کوی کو کے تمل کلام کا ترجمہ 'کہکشاں' کے نام سے مظفر شہ میری کر چکے تھے۔ اس طرح اردو میں کوی کو کے کل تین مجموعہ ہائے کلام دستیاب ہیں۔

مذکورہ تینوں تراجم خود اصل شاعر کوی کو عبدالرحمٰن کی خاص دلچسپی کی وجہ سے ان کی نگرانی میں کیے گئے تھے۔ ان کی ہمیشہ یہ تمنا رہتی تھی کہ ان کا کلام اردو قارئین تک بھی پہنچے۔ اس کے مختلف اسباب تھے ایک تو خود ان کی مادری زبان اردو تھی، اس کے علاوہ آپ کے والد محترم سید احمد (1947-1928) مدورائی میں اردو کے مدرس رہ چکے تھے۔ انھیں شاعری کا ذوق تھا اور انھوں نے علامہ اقبال کے منتخب کلام کا تمل میں ترجمہ بھی کیا تھا۔ اس طرح اردو ان کے گھر میں بول چال کی زبان ہی نہیں تھی بلکہ ان کی مادری اور پدری زبان بھی تھی۔ ان سب سے بڑھ کر سونے پر سہاگہ جب انھیں اسلامیہ کالج، وانمباڑی (تملناڈو) میں تمل پروفیسر کی حیثیت سے خدمات انجام دینے کا موقع ملا تو وہاں انھیں اردو کا ماحول ملا۔ اسی زمانے میں وہاں اردو کے معروف نقاد و شاعر، مظفر شہ میری بھی شعبۂ اردو سے وابستہ تھے۔ اس لحاظ سے خوب گزری جو مل بیٹھے دیوانے دو والا معاملہ ہے۔ اسی زمانے کا ذکر کرتے ہوئے مظفر شہ میری نے لکھا ہے:

''مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے ان کے ساتھ علامہ اقبال کے سو اشعار کا تمل میں ترجمہ کیا ہے جو چھپ چکا ہے۔ غالب کی تیس غزلوں کو تمل میں منتقل کیا جو ہنوز شائع نہ ہو سکا۔ ڈاکٹر موصوف نے اردو غزل کو تمل میں متعارف کرایا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج تمل میں سو سے زیادہ غزلوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ اہل اردو کو یہ جان کر حیرت و مسرت ہوگی کہ اردو غزل کا جادو تمل فلموں اور گیتوں پر بھی پڑا ہے جس کا سہرا ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی کے سر ہے۔'' (مجذوب، مقدمہ، ص 37-36)

جہاں تک کوی کو عبدالرحمٰن کے تمل زبان میں غزل کے مجموعوں کی اشاعت کا تعلق ہے ان کی تمل غزلوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ تمل غزلوں کا پہلا مجموعہ 'من منی گلال اور وکنڈیدم' ہے جس کا اردو میں ترجمہ جناب سجاد بخاری نے 'جگنوؤں سے ایک خط' کے نام سے کیا۔ تمل غزلوں کا دوسرا مجموعہ 'رگسیہ پو' (پراسرار پھول) ہے جس کا اردو میں ترجمہ نہیں ہوا۔

مظفر شہ میری کو ان کے دو مجموعوں کا ترجمہ کرنے کا اعزاز حاصل ہے جن میں ایک مجموعہ 'کہکشاں' (تمل نام- پالویدی) اور دوسرا مجموعہ 'مجذوب' (پتّن) ہے۔ مظفر شہ میری نے نہ صرف ایک عمدہ مترجم کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی ہے بلکہ ایک صاحب طرز ممتاز نقاد اور قابل قدر پروفیسر کے طور پر بھی وہ اردو دنیا میں مشہور و معروف ہیں۔ آندھرا پردیش کے ضلع کرنول میں واقع عبدالحق اردو یونیورسٹی کے وائس چانسلر کے باوقار عہدے پر وہ فائز رہ کر حال ہی میں وظیفہ یاب ہوئے ہیں۔

مظفر شہ میری کا اردو ترجمہ 'مجذوب' میرے پیش نظر ہے۔ یہ دراصل اس کا پہلا ایڈیشن ہے جس میں تقی عابدی کا اس پر تاثراتی مضمون شامل نہیں ہے جسے دوسرے ایڈیشن میں شامل کیا گیا ہے۔ اس کتاب کا انتساب انھوں نے سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام مرحوم کے نام کیا ہے اور اپنے مقدمہ میں اعتراف کیا ہے کہ اس کے نوک پلک کوی کو ہی کی دیکھ ریکھ میں سنوارے تھے۔ اس کے علاوہ اردو اور تمل دونوں زبانوں سے بخوبی واقف شاعر و ادیب، فیض قادری نے بھی ان کے ترجمے پر نظر ثانی کی ہے۔ اس طرح انھوں نے حتی الامکان اپنے ترجمے کو اصل سے قریب اور اردو کے لیے قابل قبول صورت میں ڈھالنے کی سعی کی ہے اور اس میں ماشاءاللہ کامیاب بھی نظر آتے ہیں۔ کوئی اور ہوتا تو مجموعے کا نام ہی پاگل، دیوانہ یا مجنوں وغیرہ رکھ دیتا کیونکہ 'پتّن' سے یہی مراد ہے لیکن اردو والوں کے لیے یہ نام عجیب وغریب دکھائی دیتے۔ یہاں ایسا پاگل مراد ہے جو اپنی منفرد سوچ اور فکر رکھتا ہے۔ کسی الہامی کیفیت نے مترجم کو 'مجذوب' نام سجھایا، آخر کار انھوں نے اسی کو مناسب سمجھا۔

اصل شاعر نے مجموعے کی ابتدا منظوم دیباچے سے کی ہے جس کے پہلے بند کا ترجمہ اس طرح ہے۔

'الاپ' (1) کا نغمہ سرا / ہاں کا شیدائی تھا
لیکن یہ مجذوب / نا کا ہے پرستار

یہاں پر کوی کو کی پچھلی کتاب 'الاپ' کا ذکر ہے جس پر انھیں ساہتیہ اکادمی انعام سے نوازا گیا تھا۔ یہ انعام انھیں 1999 کے لیے عطا کیا گیا۔ یہ شعری مجموعہ 'پتن' کی اشاعت سے قبل شائع ہوا تھا اور اس کے بعد ہی 'پتن' منظر عام پر آیا۔ پتن کا 'الاپ' سے گہرا تعلق ہے۔ 'الاپ' کے بعد 'پتن' کا مطالعہ کریں تو 'پتن' کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے یعنی ہر ایک طرح سے جڑواں شعری مجموعے ہیں جن کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھا نہیں جا سکتا ہے جس کا خود شاعر نے اعتراف کیا ہے کہ یہ ان کے تخلیقی وجود کے دو حصے ہیں چنانچہ وہ اپنے تمل مجموعہ 'الاپ' کی ابتدا میں لکھتے ہیں:

میرے اندر ہیں / دو وجود
ایک ہے نغمہ سرا / دوسرا ہے مجذوب (پتن)
نغمہ سرا، کسی نہ کسی / راگ کو الاپ رہے گا
وہ سروں کے الاپ سے / نہیں ہے بنا
مجذوب کسی ندی میں / مخالف سمت میں غوطہ لگا تا رہے گا
نغمہ سرا سچائی کا ہے، شیدا
مجذوب (پتن) اختلاف کا ہمنوا
دونوں میں مفاہمت ہے مشکل امر
کیونکہ دونوں میں ہے بعد المشرقین
نغمہ سرا سچائی کا روشن رخ دیکھے
اس سے ہم آغوش ہو کر وہ چلے
اس کی ذات کا ہے / یہ روشن عنصر
اس کے برعکس / مجذوب (پتن) / سچائی کا تاریک رخ دیکھے
وہ پراسرار گلوں کو سونگھے
وہ ہے اس کے پنکھوں میں / پوشیدہ تاریکی کا زرگل

(ترجمہ از حیات افتخار)

اپنے اس مجموعے کے اختتام میں انھوں نے مخالف رخ یا اضداد کو پیش کرنے کا مقصد یہ بتایا ہے کہ ان پر غور کرو، اضداد صرف تکنیک ہی نہیں، راز ہائے کائنات ہیں اور اضداد دشمن نہیں، جوڑی ہیں، جڑ کر پیدا ہوئے جڑواں بچے ہیں۔

'پتن' کی اشاعت سے پہلے ہی شاعر نے طے کر لیا تھا کہ وہ اپنے تخلیقی وجود کے دوسرے حصے کو یا اس کے دوسرے رخ کو بھی منظر عام پر لائیں گے۔ چنانچہ میری ناچیز رائے میں 'پتن' کے ساتھ 'الاپ' کا بھی اردو ترجمہ ہو جاتا اور وہ منظر عام پر آ جاتا تو ایک دوسرے کے سلسلے کو جوڑ کر پڑھنے میں قاری دلچسپی محسوس کرتا اور اردو میں ترجمہ شدہ ادب پڑھنے والے شائقین کے لیے یہ ایک عظیم ادبی تحفہ ہوتا۔

تمل شعری مجموعہ 'پتن' کے آخری صفحے (Wrapper) پر شاعر نے پتن کا تعارف اس طرح کرایا ہے جو غالباً اردو ترجمے میں شامل نہیں ہے۔

'پتن' الاپ کے نغمہ سرا / کا ہے ہمزاد
لیکن وہ ہے علامت اضداد
سچائی دوسرے رخ کا تماشائی
اختلاف کا وہ ہے شیدائی
کسی بھی شے کا وہ تاریک رخ دیکھے وہ
تیرگی سے روشنی پائے وہ / نغمہ نگار کو حاصل ہے
'پتن' سے اتمام

(ترجمہ از حیات افتخار)

شعری مجموعے کے تمل متن کی ابتدا میں تمل ناڈو کے سابق وزیر اعلیٰ ایم کرونا نیدھی کا تحریر کردہ پیش لفظ بھی شامل ہے جس میں انھوں نے اس کتاب کے فکر انگیز بندوں کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہوئے اعتراف کیا ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد وہ خود ان کے گرویدہ بن گئے ہیں۔ اس کو ترجمہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے، ہو سکتا ہے یہ خود مترجم کا فیصلہ ہو یا خود اصل شاعر نے منع کر دیا ہو۔

نظموں کے تراجم سے پہلے مترجم نے 'مجذوب سے ملیے' کے عنوان سے مقدمہ تحریر کیا ہے جس کے مطالعے سے اس مجموعے کی نظموں کے مرکزی خیال کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ یہ نظمیں اپنے اندر تسلسل رکھتی ہیں۔ ان نظموں میں دنیا و مافیہا کے مختلف پہلوؤں پر مجذوب کے انوکھے اور منفرد خیالات کو پیش کیا گیا ہے جیسا کہ ابتدا میں اس کا تعارف کراتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ 'نا' کا پرستار ہے۔ پچھلی تصنیف 'الاپ' کا نغمہ نگار 'ہاں' کا شیدائی تھا۔ اس کے برعکس ان نظموں کا مرکزی کردار کسی بھی شے کا مخالف رخ دیکھنے والا انسان ہے وہ روشنی کی بجائے اندھیرے کا پرستار ہے۔ دریا کے مخالف سمت تیرنے والا فرد ہے وغیرہ اور ان کی جو فلسفیانہ توجیہات پیش کی گئی ہیں وہی دراصل اس مجموعے میں شامل تمام نظموں کا موضوع ہے۔

اس طرح یہ نظمیں مجذوب کے پردے میں اصل مصنف اور شاعر کوی کو عبدالرحمٰن کے فلسفیانہ خیالات کا پرتو ہیں اور دنیا کے مختلف مظاہر کے متعلق شاعر کے افکار کا عکس ہیں۔ مجذوب کی طرح وہ زندگی کے حقائق کے سمندر میں ڈوب کر اپنے افکار کے گوہر نایاب کو قاری کے سامنے بکھیر دیتے ہیں۔ وہ خود انجذاب کے تجربے سے دوچار ہوتے ہیں اور قاری کو بھی اس انوکھے تجربے میں شامل کرنا چاہتے ہیں۔ مجذوب بظاہر خلاف عقل باتیں ہی کرتا ہے۔ اسی وجہ سے اردو میں مجذوب کی بڑ کا محاورہ رائج ہے۔ ان نظموں کا مرکزی کردار مجذوب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ وہ بظاہر خلاف عقل نظر آنے والی حقیقتوں کو بباطن موافق عقل بنا کر پیش کرتا ہے اور اس ضمن میں اس کی توجیہات اور دلائل ہمیں دعوت فکر دیتے ہیں۔ دراصل وہ ہماری آنکھوں سے اوجھل حقائق کا انکشاف کرتا ہے جو بصیرت افروز ہیں اور یہی شاعر کا اصل مقصد اور منشا بھی ہے۔ شاعر اس مقصد میں کامیاب نظر آتا ہے اور مترجم نے بھی اپنے رواں ترجمے کے ذریعے اصل کا عکس من و عن پیش کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

عام طور پر بندھی ٹکی سوچ رکھنے والے یا لکیر کے فقیر کہلانے والے انسان زندگی کی سچائیوں کا ایک ہی رخ دیکھتے ہیں اور دوسرے رخ کو دیکھنے کی سعی نہیں کرتے لیکن مجذوب جو زندگی کے حقائق کے سمندر میں ڈوب کر ابھر بھی آتا ہے وہ مظاہر حیات کے دوسرے رخ کو بھی دیکھتا ہے جس طرح زندگی کا روشن پہلو قابل قدر ہے۔ اسی طرح اس کا تاریک پہلو بھی قابل اعتنا ہے۔ اس طرح شاعر مجذوب کا روپ دھار کر زندگی کے نشیب و فراز اور دنیا کی پستی و بلندی کو آئینہ دکھاتا ہے۔

اس شعری مجموعہ میں کل اٹھائیس نظمیں ہیں جنھیں ایک مخصوص شعری ہیئت میں پیش کیا گیا ہے جو تمل شاعری کی روایتی ہیئت سے مختلف ہے۔ ہر نظم کے ابتدائی بند میں عنوان کا منفی تصور پیش کیا گیا ہے جو حیران کن ہے اور اس کے بعد اس کا مثبت جواز اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ قاری مسرت سے دوچار ہوتا ہے اور اس مسرت میں بصیرت بھی شامل ہے، مثلاً ایک نظم کا عنوان ہے 'اندھیرا'

جب لوگ / شام کو / دیے جلا رہے تھے
تب مجذوب نے دیا بجھا دیا
میں نے اس سے پوچھا
تو نے دیا کیوں بجھا دیا؟
اس نے کہا / دیکھنے کے لیے

مختلف عنوانات کے تحت شاعر متکلم 'میں' اور مخاطب 'مجذوب' کے درمیان مکالمے کی صورت میں مظاہر زندگی کے دوسرے رخ کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا گیا ہے 'مجذوب' اپنے ہر منفی عمل کا فلسفیانہ جواز اس طرح بیان کرتا ہے کہ وہ اہل بصیرت کے لیے انکشاف حقیقت کے مصداق ہے۔ شاعر نے ابتدا ہی میں اس کا تعارف کراتے ہوئے کہہ دیا ہے کہ وہ قید عقل سے آزاد، نا کا پرستار ہے، نہیں کا پیامبر اور 'نہیں' اس کا اسم اعظم ہے۔

ایک جگہ متکلم مجذوب سے سوال کرتا ہے کہ وہ مجذوب کیسے بنا تو اس کا جواب یہ ہوتا ہے کہ میں نے سچ کا پچھلا رخ دیکھ لیا تو میری راتوں کی سحر ہو گئی یعنی زندگی کے

راز روزِ روشن کی طرح عیاں ہوگئے، ایک اور نظم ملاحظہ ہو۔

میں نے پوچھا/ تم قمیص کیوں پھاڑ رہے ہو
اس نے کہا/ اگر خط کو پڑھنا ہو تو
چاک کرنا ہی پڑتا ہے/ بند لفافے کو

میری ناچیز رائے میں کوی کو عبدالرحمٰن کے یہاں بعض مقامات پر مشہور و معروف لبنانی فلسفی شاعر، خلیل جبران کے فلسفہ/ افکار کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کا مطالعہ کافی وسیع تھا وہ ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادبیات کے علاوہ عالمی ادب پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ ان کے ہمعصر رفیق شعرا نے اعتراف کیا ہے کہ جب وہ ان سے ملاقات کرتے تو ان کی گفتگو کے دوران عالمی ادیبوں سے بھی ملاقات ہو جاتی۔ اسی طرح خلیل جبران کا بھی وہ ذکر کرتے۔ یہ کسی بھی شاعر کے لیے جس کا مطالعہ وسیع ہو فطری بات ہے کہ ان کے اثرات اس کی شاعری میں در آئیں چنانچہ اس مجموعے میں شامل کلام پر خلیل جبران کے واضح اثرات نظر آتے ہیں۔

خلیل جبران کی مشہور کتابوں میں Prophet کے علاوہ Mad Man بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں کہ ایک دن جب وہ گہری نیند سے بیدار ہوئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ان کے چہرے کے تمام مکھوٹے چوری ہوگئے ہیں۔ انھوں نے سات جنموں میں سات مکھوٹے پہنے تھے جب وہ چور چور پکارتے ہوئے دوڑتے ہیں تو عورتیں اور مرد ان پر ہنستے ہیں اور بازار میں ایک نوجوان انھیں پاگل آدمی کہہ کر پکارتا ہے اور سورج ان کے ننگے چہرے کو پہلی مرتبہ چومتا ہے اور ان کی روح، سورج کے تئیں محبت کے لیے مشتعل inflamed ہو جاتی ہے اور اب وہ کوئی مکھوٹا نہیں چاہتے اور ان چوروں کو دعائیں دیتے ہیں جو ان کا مکھوٹا چرا لے گئے وہ لکھتے ہیں کہ اس طرح میں پاگل آدمی بن جاتا ہوں۔ میں خود کو آزاد اور تنہا محسوس کرتا ہوں۔ وہ ایک جگہ کہتے ہیں۔

میں نے بدتمیز لوگوں سے تمیز سیکھی
باتونی لوگوں سے خاموشی سیکھی
اور بے ادب لوگوں سے ادب سیکھا

ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

میرے دوست! میں وہ نہیں ہوں جو نظر آتا ہوں
جو نظر آتا ہے وہ میرا پہنا ہوا لباس ہے
اے دوست! میرے اندر جو 'میں' ہے وہ خاموشی
کے مکان میں رہتا ہے
اور وہاں وہ ہمیشہ رہے گا نظر سے پوشیدہ اور ناقابل رسا

خلیل جبران کا ایک اور قول ہے۔

جو جتنی مشکلات سے گزرتا ہے
اس کی روح اتنی مضبوط ہو جاتی ہے
جس کا کردار جتنا مضبوط ہوتا ہے
اس کے گھاؤ اتنے زیادہ ہوتے ہیں

خلیل جبران کے مذکورہ اقوال کی بازگشت کوی کو عبدالرحمٰن کے یہاں ملاحظہ کیجیے۔

کپڑوں کی حاجت/ جھوٹ کو ہوتی ہے/ سچ کو نہیں
پھول اور پرندے تو لباس نہیں پہنتے
جلد بھی ایک لباس ہی ہے
اور یہ راز جانتا ہے سانپ/ تم نہیں جانتے

(لباس)

زخم کھانے والا پتھر ہی مجسمہ بنتا ہے
زخم کھانے والا بانس ہی نغمہ سرا ہوتا ہے
جن تاڑ کے پتوں پر زخم لگتے ہیں وہی کتاب بنتے ہیں
زخموں ہی سے شاعری پھوٹتی ہے

(زخم)

ایک مرتبہ میں نے/ دیکھ لیا تھا/ سچ کا پچھلا رخ
اس وقت/ میری تمام راتوں کی/ سحر ہوگئی
سارے پردے اٹھ گئے/ میں نے دیکھا
اضداد/ ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے/ ناچ رہے تھے
میں نے یہ بھی دیکھا/ اضداد/ اپنے اپنے مکھوٹے اتار کر
ایک دوسرے کو چوم رہے تھے
وہ بھیس بدل بدل کے جیتے ہیں
اسی میں ان کو آسانی ہے/ ان کا جو بھیس اتر جائے گا
وہ منچ سے اتر جائیں گے

(عریانیت)

خلیل جبران کے علاوہ ان کے یہاں بعض مقامات پر غالب کے افکار کی بازگشت بھی محسوس کی جا سکتی ہے، مثلاً جب وہ کہتے ہیں۔

کیوں! اکیلے بیٹھے ہوئے ہو؟
میں نے مجذوب سے پوچھا
ایک مجذوب ہی/ نیچے اتر رہا تھا
میں نے اس سے پوچھا/ تم کیوں نیچے اتر رہے ہو
اس نے کہا/ اوپر جانے کے لیے
مزید اس نے کہا/ نیچے گرنے والا بیج ہی
اوپر جاتا ہے
عورت/ دور ہی سے خوبصورت لگتی ہے
مزید اس نے کہا: جنت اور جہنم کے مزے کو
دھرتی ہی پر/ چکھنے کے لیے
خدا نے عورت کو بنایا ہے

(عورت)

تمھاری کتابیں/ چراغوں کی طرح ہیں
سورج کو دیکھنے کے لیے/ چراغوں کی ضرورت نہیں پڑتی

(کتاب)

زندگی تماشہ ہے/ رسی پر چلنے کا
جو توازن کھودے گا/ وہ گر پڑے گا

(زندگی)

مذکورہ بالا کلام کے نمونوں سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے سوچنے کا انداز عامیانہ نہیں تھا۔ وہ بصارت کے نہیں بصیرت کے قائل تھے، یہی بصیرت قاری کو منتقل کرنا چاہتے تھے۔

اس مجموعے کی آخری نظم کا عنوان ہے 'جوڑی' جس میں انھوں نے مخالف رخ یا اضداد کو پیش کرنے کا مقصد مجذوب کی زبانی یہ بتایا ہے کہ ان پر غور کرو کیونکہ ان میں رازہائے کائنات پوشیدہ ہیں۔ اس کے علاوہ کسی بھی شے کے دو رخ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اضداد دشمن نہیں جوڑ ہیں۔ جڑ کر پیدا ہوئے جڑواں بچے ہیں۔ اس سے یہ بھی نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ ان کے دونوں مجموعوں کو جڑواں اولاد کی طرح پڑھا جا سکتا ہے یعنی پہلا مجموعہ 'الاپ' اور دوسرے مجموعے 'پتن' میں وہی تعلق ہے جو جڑواں اولاد میں ہوتا ہے اور دراصل ان کے تخلیقی وجود کے یہ دو حصے ہیں جس کا ذکر انھوں نے اپنے پہلے مجموعے 'الاپ' میں اس طرح کیا تھا۔

میرے اندر ہیں/ دو وجود
ایک ہے نغمہ سرا (الاپ)
دوسرا ہے 'مجذوب' (پتن)

بہرحال ان مجموعوں کے مطالعے سے ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ وہ ایک مفکر شاعر ہیں اور ان کی فکر منفرد اور ممیز ہے، اسی لیے انھیں تمل ادب کا خلیل جبران بھی قرار دیا گیا ہے اور انھیں غالب کی طرح تمل شاعری کا نیا ذہن اور نیا انداز عطا کرنے والا شاعر بھی تسلیم کیا گیا۔ اردو ادب کے قاری کو ان کی فکر انگیز شاعری سے ترجموں کے ذریعے متعارف کرانے کا سہرا مظفر شہ میری کے سر ہے اور یہ ادبی خدمت انھوں نے پوری دیانت داری سے انجام دی ہے۔ چنانچہ 'مجذوب' کی صورت میں ان کا یہ ترجمہ تخلیق در تخلیق یعنی ازسرنو تخلیق کا درجہ رکھتا ہے اور اردو کے ترجمہ شدہ ادب میں اسے ایک بیش بہا اضافے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔

■

Dr. Hayath Iftekhar
Former Head, Dept. of Urdu
Quaide Millath College, Medavakam
Chennai- 600100 (Tamilnadu)
Mob.:9884733619

اردو میں بین العلومی تنقید

نیاز سلطانپوری

بین العلومی تنقید سے مراد تنقید کی وہ شاخ ہے جس میں مختلف علوم وفنون کے ذریعے شعر وادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں بھی کہہ سکتے ہیں مختلف علوم وفنون کے اثرات شعر وادب میں تلاش کیے جاتے ہیں مثلاً علم حیوانات، علم طب اور علم زراعت وغیرہ کے اثرات شعر وادب میں تلاش کرنے کے عمل کو اس قسم کی تنقید میں برتا جاتا ہے۔

اردو میں بین العلومی تنقید پر ابھی تک کوئی مستقل تصنیف نہیں ملتی البتہ اس کے نمونے مختلف مضامین میں جہاں تہاں بکھرے پڑے ہیں۔ امداد امام اثر صاحب کاشف الحقائق کو اس کا بانی یا موجد قرار دیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں مختلف علوم کی روشنی میں ادب وشعر کا جائزہ لیا ہے۔ بطور نمونہ ان کی معرکۃ الآرا تصنیف 'کاشف الحقائق' سے یہ اقتباس پیش کیا جاتا ہے۔ اثر لکھتے ہیں:

''جن صاحب نے اس شعر پہ

درختوں کی کچھ چھاؤں اور کچھ وہ دھوپ
وہ دھانوں کی سبزی و سرسوں کا روپ

یہ اعتراض فرمایا ہے کہ دھانوں اور سرسوں کا ایک وقت نہیں ہوتا، ان کا اعتراض یا فن باغبانی یا فن زراعت کے اصول پر وارد کیا جاسکتا ہے۔ ان دونوں پہلوؤں کے سوا اور کوئی پہلو سے اس شعر پر اعتراض وارد نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر زبان کی بدترکیبی پر اعتراض وارد کیا جائے تو راقم کو اس میں مجال گفتگو نہیں ہے لیکن کس واسطے کہ یہ ناچیز زبان داں ہے اور نہ اہل زبان سے ہے بہرکیف فن باغبانی کی رو سے یہ اعتراض کیا گیا ہوگا، کس واسطے یہ دھان اور سرسوں بدر منیر کے باغ کے اندر واقع تھے جہاں وہ گانا سن رہی تھی۔ ظاہر ہے مترشتی کے لیے زراعتی کھیتوں میں وہ نہیں گئی تھی پس اس کا جواب باغبانی کی رو سے یہ کہ امرا کے باغوں میں مجرد بندی کے خیال سے دھان اور جو بوئے جاتے ہیں ان سے پیداوار کی غرض نہیں ہوتی۔ جس فصل میں جو کوئی چاہے سبزی کی غرض سے دھان یا جو بوکر دیکھ لے۔ پس ہر وقت میں دھان یا جو کا سبز تختہ تیار کیا جاسکتا ہے۔ تو پھول سرسوں کے ساتھ دھان کے تختے کا موجود رہنا خلاف امکان کیا ہے۔''[1]

دوسری مثال: بدر منیر ہجر بے نظیر میں یوں تو برابر بے قرار تھی مگر جب پورا مہینہ گزر گیا اور بے نظیر، نہ آیا تب اس کا قلق بڑھنے لگا۔ عشق نے انداز جنوں پیدا کیا۔ بقول حضرت مصنف:

محبت کا سودا سا ہونے لگا
جنوں تخم وحشت کا بونے لگا
سرکنے لگا پاس ناموس و ننگ
لگی عقل اور عشق میں ہونے جنگ

> اردو میں بین العلومی تنقید پر ابھی تک کوئی مستقل تصنیف نہیں ملتی البتہ اس کے نمونے مختلف مضامین میں جہاں تہاں بکھرے پڑے ہیں۔ امداد امام اثر صاحب کاشف الحقائق کو اس کا بانی یا موجد قرار دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے اپنی تنقید میں مختلف علوم کی روشنی میں ادب و شعر کا جائزہ لیا ہے۔

واضح ہو کہ عشق ایک وسواس مرض ہے اگر اس کا علاج وقت پر نہیں کیا جائے تو جنوں کی طرف منتقل ہوجاتا ہے۔ عشق کا بہترین علاج وصل معشوق ہے مگر یہ علاج دشوار صورت ہے۔ ظاہر ہے کہ بحالت موجودہ اس طور پر بدر منیر کے علاج کی کوئی شکل نہ تھی۔ اگر اس کے عشق سے آثار جنوں نمایاں ہونے لگے تو امر تمام تر قرین فطرت تھا۔''[2]

بین العلومی تنقید کو فروغ دینے میں ایک اہم نام حسن عسکری کا بھی ہے۔ بقول علی حماد ''عسکری کی نظر تنقید کا ایک خاص امتیاز یہ ہے کہ وہ کسی بھی نظریے کے بطلان کے لیے ایک نہیں مختلف طریقے اپناتے ہیں۔ اگر کسی نظریے کی وہ وجدانی کیفیت اور تاثراتی سطح پر تردید نہیں کر پاتے تو اپنی کاوش میں وہ فرائڈ کے تحلیل نفسی سے لے کر فرانس کے زوال پرستوں کے نظریوں کا سہارا لینے سے نہیں چوکتے۔''[3]

انجینئر محمد عادل اپنے مضمون 'اردو غزل اور سائنسی حقائق' میں رقمطراز ہیں:

''مرزا غالب کو یہ علم تھا کہ خلاؤں میں اجرام فلکی مسلسل گردش کر رہے ہیں۔ اس لیے ہم کو ان آسمانی گردش پر رات، دن نظر رکھنے کی ضرورت ہے، تاکہ ہم ہر لحظہ ہونے والی تبدیلیوں سے آشنا ہوسکیں۔ ان کا یقین تھا کہ خلاؤں میں کچھ نہ کچھ تبدیلیاں رونما ہوتی رہیں گی اس لیے ہم کو اس گردش سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ اس پر ہمارا زور نہیں چلتا ہے۔ غالب اس شعر میں اسی بات کو بیان کرتے ہیں۔

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

رات کی تاریکی میں جب ہم آسمان کا مشاہدہ کرتے ہیں تو ہمیں ستاروں سے منور ایک حسین منظر نظر آتا ہے۔ بے شمار ستاروں کی جھرمٹ دکھائی دیتی ہے جن کو ہم شمار میں بھی نہیں لا سکتے ہیں۔ اجرام فلکی کا یہ جھرمٹ کہکشاں (Milkyway) کے نام سے جانا جاتا ہے۔

ستارے زمین سے کافی دور ہیں۔ کچھ ہمیں دکھائی دیتے ہیں اور کچھ نہیں دکھائی دیتے۔ غالب بھی اس حقیقت سے آشنا تھے کہ ستارے حقیقت میں ہوتے کچھ اور ہیں اور دکھائی کچھ اور دیتے ہیں اگرچہ یہ بہت بڑے ہیں لیکن دور ہونے کی وجہ سے چھوٹے معلوم ہوتے ہیں مختلف رنگ کے ہوتے ہیں لیکن ایک جیسے رنگ کے نظر آتے ہیں، اس لیے غالب انھیں بازیگر کہتے

ہیں کیونکہ ان کے ظاہر و باطن میں فرق ہوتا ہے:

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا غالب"[4]

بین العلومی تنقید کو فروغ دینے میں ایک اہم نام ڈاکٹر سلام سندیلوی کا ہے۔ سلام سندیلوی اودھ کے تاریخی قصبہ سندیلہ کے مضافاتی گاؤں کرنا میں 25 فروری 1919 کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد بختاور علی محکمۂ پولیس میں ملازم تھے۔ انھوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے 'اردو رباعیات' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری حاصل کی۔ 1959 میں ایم اے فارسی کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ بعدہ 1964 میں 'اردو شاعری میں منظر نگاری' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈی لٹ کی ڈگری حاصل کی۔ 1959 میں ان کا شعبۂ اردو، گورکھپور یونیورسٹی میں بہ حیثیت لیکچرار تقرر ہوگیا اور یہیں سے بہ حیثیت ریڈر سبکدوش ہوگئے اور تا حیات گورکھپور میں رہے۔ 17 ستمبر 2000 بروز اتوار سلام سندیلوی کا انتقال ہوگیا اور گورکھپور کی خاک کے پیوند ہوگئے۔

سلام سندیلوی بسیار نویس تھے۔ انھوں نے تقریباً چار درجن سے زائد کتابیں تصنیف کر کے اردو شعر و ادب کے دامن کو وسعت بخشی جن میں ساغر و مینا، ادب کا تنقیدی مطالعہ، ادبی اشارے، اردو رباعیات، اردو شاعری میں منظر نگاری، غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ، مراثی انیس میں جذباتی تاویل، گورکھپور کی تاریخ، مطالعہ و مشاہدہ، اردو شاعری میں نرگسیت، اردو شاعری میں خودداری، تاریخ ادبیات گورکھپور اور اردو شعرا کی بے خوابی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر سعید سندیلوی نے ان کی تنقید پر بجا طور پر خامہ فرسائی کی ہے:

"بہ حیثیت نقاد ڈاکٹر سلام سندیلوی کا مرتبہ بلند ہے۔ انھوں نے اردو ادب کو بعض نئے تنقیدی خیالات دیے ہیں اور ایک نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ 'اردو شاعری میں نرگسیت' اور 'اردو شعرا کی بے خوابی' کے موضوع پر نئے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ بے خوابی کے وہ خود بھی شکار رہے ہیں جس سے بے خوابی کے تمام محسوسات اور کیفیات کا انھیں ذاتی طور سے تجربہ رہا تھا۔ نرگسیت کے مفہوم میں خودداری، خودشناسی، خود پرستی اور خودآرائی شامل ہے۔ اردو شاعری میں منظر نگاری کے موضوع پر بھی منفرد انداز سے تنقید کی ہے۔ ان کی تنقید کے متعلق ڈاکٹر کرامت علی کرامت سابق ریڈر شعبۂ ریاضی گورنمنٹ کالج سندر گڑھ اڑیسہ لکھتے ہیں:

"سلام صاحب کی تنقید چھنا چھپلی قسم کی تنقید نہیں ہے جسے آج کل سکۂ رائج الوقت کا درجہ دیا جاتا ہے لیکن یہ سوچنا غلط ہے کہ ان کی تنقید ہمیں غور و فکر کا مواد مہیا نہیں کرتی۔ ان کی تحریروں سے ہماری تنقید کو کچھ نہیں سمتیں نہیں ملی ہیں۔ موصوف نے فن کو اکھاڑہ بننے کی اجازت نہیں دی۔۔ ادب کا تنقیدی مطالعہ، ادبی اشارے اور اردو شاعری میں منظر نگاری، غالب کی شاعری کا نفسیاتی مطالعہ، مراثی انیس میں جذباتی تاویل اور اردو شاعری میں نرگسیت سلام صاحب سندیلوی کے ایسے وقیع کارنامے ہیں کہ ادب کا سنجیدہ قاری ان سے ہمیشہ لطف اندوز ہوتا رہے گا۔"[5]

بین العلومی تنقید نگاروں میں ایک اہم نام سید احتشام حسین کا بھی ہے۔ یوں تو آپ کو مارکسی نقاد کی حیثیت سے شہرتِ دوام حاصل ہوئی لیکن ان کی ادب کے علاوہ جملہ سماجی علوم بالخصوص تاریخ، سیاست، اقتصادیات اور عمرانیات وغیرہ پر بھی گہری نظر ہے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں ان علوم سے بھی بڑا کام لیا ہے۔ تنقیدی جائزے، روایت اور بغاوت، ادب اور سماج، تنقید اور عملی تنقید، ذوقِ ادب اور شعور، افکار و مسائل، عکس اور آئینے اور اعتبارِ نظر موصوف کی اہم تصنیفات ہیں۔

محمد حسن عسکری بین العلومی تنقید کا اہم نام ہے۔ موصوف انگریزی ادب کے معلم تھے، لہٰذا انھیں بطور خاص انگریزی ادب کے مطالعے کا موقع ملا۔ انھوں نے فرانسیسی ادب کا بھی عمیق مطالعہ کیا لیکن وہ مغربی ادب کی چکاچوند سے مرعوب نہ ہوسکے۔ بقول پروفیسر نورالحسن نقوی "ان کے نظامِ تنقید میں تہذیب کو مرکزیت حاصل ہے۔ وہ مشرقی تہذیب کی برتری کے قائل ہیں اور ادب میں اس کی کارفرمائی کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔"[6]

ڈاکٹر وزیر آغا کا شمار برصغیر ہند و پاک کے ممتاز اہل قلم میں ہوتا ہے۔ انھوں نے روشِ عام سے ہٹ کر اپنی تنقید کا راستہ ڈاکٹر نورالحسن نقوی کے الفاظ میں "تہذیب اور کلچر کے علاوہ نفسیات اور دیومالا وہ اہم زاویے ہیں جن سے انھوں نے اردو ادب کو دیکھا اور پرکھا لیکن تنقید کے باقی حربوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ مذہبیات اور انتھروپولوجی سے بھی مدد لی۔ فن پارے کو وہ مرکزی حیثیت دیتے ہیں اور جس زاویے سے دیکھے جانے کا وہ مطالبہ کرتا ہے اسے پورا کرتے ہیں ان کا اندازِ بیان شگفتہ اور مدلل ہے۔ نتیجہ یہ کہ ان کی تحریریں دلچسپ، پراثر، فکر انگیز اور ساتھ ہی عالمانہ سنجیدگی سے معمور ہیں۔ اردو ادب میں طنز و مزاح، نظم جدید کی کروٹیں، اردو، شاعری کا مزاج، تخلیقی عمل، تنقید اور احتساب، تصوراتِ عقل و خرد، اقبال کی نظر میں ان کی اہم کتابیں ہیں۔"[7] نئے تناظر، نئے مقالات، تنقید اور مجلسی تنقید جیسی کتابیں ان کے رشحاتِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کا یہ کہنا بجا ہے کہ وزیر آغا کی تنقید تحت شعوری، اساطیری، داخلی اور قدیمی محرکات کی روشنی میں ادب کا مطالعہ کرتی ہے۔ اس میدان میں ان کا کوئی حریف اس وقت نہیں۔"[8]

سلیم احمد کا شمار اردو کے اہم نقادوں میں ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں علم نفسیات سے بہت فائدہ پہنچایا ہے۔ اس لیے ان کا ذکر نفسیاتی نقادوں کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ بقول پروفیسر نورالحسن نقوی "جنس کی طرف ان کا رجحان بہت زیادہ ہے۔ ان کے اندازِ بیان کو غیر علمی، غیر سنجیدہ بلکہ زہرناک جیسے نام بھی دیے گئے۔ کہا گیا کہ وہ تنقید نہیں کرتے، فقرے بازی کرتے ہیں، پھبتیاں کستے ہیں۔ ان کی تنقید میں طنز نگاری کا عنصر بھی شامل ہے اور جن تخلیقات کو وہ پسند نہیں کرتے۔ ان کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔"[9]

متذکرہ نقادوں کے علاوہ پروفیسر شمیم حنفی، گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر شکیل الرحمٰن، پروفیسر عتیق اللہ، کرامت علی کرامت، ڈاکٹر محمد حسن، مغنی تبسم، ابن فرید، حقانی القاسمی، نیاز سلطانپوری، سیف حامد علی شاہ وغیرہ اپنی نگارشات میں بین العلومی تنقید کے نمونے وقتاً فوقتاً پیش کرتے رہے ہیں۔ بین العلومی تنقید کا دائرہ نہایت وسیع ہے۔ یہ ناقدین سے کثرتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ کثیر المضامین (Several Subject) اور Multy Language کثیر اللسانیت کے مطالعے کا پرزور مطالبہ کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اردو میں بین العلومی ناقدین کی تعداد انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔

ماخذات

1 کاشف الحقائق، ص 632
2 ایضاً، ص 635
3 جدید اردو تنقید پر مغرب کے اثرات، ص 52-51
4 اردو دنیا، نئی دہلی، دسمبر 2014، ص 67
5 بحوالہ مقالات سندیلوی مرتبہ ڈاکٹر الحاج سعید احمد سندیلوی، سنہ اشاعت 2007، ص 16
6 تاریخ ادب اردو: مرتبہ پروفیسر نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، سنہ اشاعت 2018، ص 467
7 تاریخ ادب اردو، مرتبہ: پروفیسر نورالحسن نقوی، بحوالہ بالا، ص 469
8 نئے تناظر از ڈاکٹر وزیر آغا ناشر: اردو رائٹر گلڈ الہ آباد، 211 اندرونی فلیپ پر
9 تاریخ ادب اردو، مرتبہ: پروفیسر نورالحسن نقوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ، ص 470

Niyaz Sultanpuri
Bhatti Jaroli
Sultanpur - 228001 (UP)
Mob.:8756228658

ہمارا تعلیمی نظام اور بدلتا ہوا تکنیکی منظر نامہ

محمد احسن

علم و اہمیت کا اعتراف روزِ اول سے ہر مہذب معاشرے نے کیا ہے۔ تعلیم یافتہ عوام ہی ایک بہتر سماج اور ایک ترقی یافتہ ملک و قوم کی تعمیر کرتے ہیں۔ کسی ملک و قوم کے عروج و زوال کی کہانی میں تعلیم کا کردار بڑی اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ انسانی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ جن قوموں نے تعلیم کو اپنا شیوہ بنایا، دنیا ان کے سامنے سرنگوں ہوتی چلی گئی۔ اس حقیقت کو مدنظر رکھ کر دنیا کے بیشتر ممالک اپنے شہریوں کو بہتر تعلیمی مواقع فراہم کرنے کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور اپنی سیاسی، معاشی و اقتصادی صورتِ حال، تہذیب و ثقافت اور نظریے کو سامنے رکھ کر اپنا تعلیمی نظام وضع کرتے ہیں، نیز قومی، سماجی اور معاشرتی حالات و ضروریات کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے طویل المیعاد پالیسیاں ترتیب دے کر اپنے ہدف کو حاصل کرتے ہیں۔ اس پس منظر میں جب ہم اپنے ملک کے نظامِ تعلیم بالخصوص اعلیٰ تعلیمی نظام پر نظر ڈالتے ہیں تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے میدان میں دوسرے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے مقابلے ہم ابھی سست رو ہیں، یا اپنی تعلیمی منصوبہ بندی میں اس ہدف کو حاصل نہیں کر سکے جو مقصود تھا۔

ہندوستان کو آزاد ہوئے 74 برس کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ ہماری شرحِ خواندگی 77 فیصد کے آس پاس ہے۔ ہمارا تعلیمی نظام جو انگریزوں سے ورثے میں ملا، بہت حد تک غیر شمولیاتی تھا۔ آزادی کے بعد ایک مضبوط قوم کی ترقی کے حصول کے لیے ہندوستان نے ایک نئے سفر کا آغاز کیا۔ اس کا مقصد آنے والی نسلوں کے لیے ایک بہتر اور مضبوط ہندوستان کی تعمیر کرنا ہے جو صحیح معنوں میں جدید فکر اور خوشحالی کا باعث ہو۔ اس کے حصول کے لیے ہمارے ملک کی سب سے بڑی طاقت یعنی ہماری نوجوان آبادی کو صحیح رخ فراہم کرنے کے لیے انھیں یکساں مناسب تعلیمی مواقع مہیا کرنے ہوں گے۔ تاکہ ہم اپنی نوجوان آبادی کی پوشیدہ صلاحیتوں کو بروئے کار لاسکیں۔ اس کے لیے ایک عمدہ تعلیمی نظام کی ضرورت ہے۔ ہمارے حکمرانوں کو اس کا احساس بھی ہے لیکن اس میں کامیابی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم اس سمت میں بالخصوص اعلیٰ تعلیمی نظام کو بہتر بنانے کی کتنی کوشش کر رہے ہیں۔

اس تناظر میں جب ہم اپنے ملک کی اعلیٰ تعلیمی صورتِ حال پر نظر ڈالتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ ہندوستان میں طلبا اور اعلیٰ تعلیم کی فراہمی کے مواقع کے درمیان ایک بڑا خلا ہے۔ ہمارے یہاں اعلیٰ تعلیم میں داخلے کا تناسب 27 فیصد ہے جو ترقی یافتہ ممالک امریکہ، برطانیہ، جاپان، شمالی کوریا اور چین کے مقابلے نسبتاً کم ہے۔ حکومتِ ہند کی وزارت تعلیم نے 2022 تک 32 فیصد اعلیٰ تعلیم میں داخلے کا ہدف رکھا ہے۔ 2001 سے اب تک اعلیٰ تعلیم میں مجموعی داخلے کے تناسب میں چار گنا اضافہ ہو چکا ہے یعنی ہم اعلیٰ تعلیم میں 32 فیصد داخلے کے ہدف کو حاصل کرنے کے قریب پہنچ چکے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اعلیٰ تعلیم تک رسائی میں اضافے کے باوجود اس شعبے کے سامنے متعدد چیلنجز جیسے فارغ التحصیل افراد کی عدم ملازمت، تعلیم کا ناقص معیار، کمزور حکمرانی، ناکافی مالی امداد اور پیچیدہ ریگولیٹری معیارات کا سامنا ہے۔

آج کے حالات صحیح معنوں میں غیر یقینی، پیچیدہ اور مبہم ہیں۔ برق رفتار ٹکنالوجی، تیزی سے معلومات کا بہاؤ عالمی سطح پر باہم مربوط Supply Chain اور فنانشیل مارکیٹ غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہے اور اس میں کسی بھی لمحے کوئی نہ کوئی تغیر رونما ہو جاتا ہے۔ اس تکنیکی اور عالمگیر بدلتے منظر نامے کے اثرات ہندوستان کی نوجوان آبادی کے تعلیم اور کیریئر پر روز بہ روز بڑھتے جا رہے ہیں۔ ہمارے تعلیمی شعبوں کو اس بدلتی ہوئی صورتِ حال و ضروریات کے مطابق تبدیلی لانے کی ضرورت ہے۔ 51,649 سے زیادہ اعلیٰ تعلیم کے شعبوں کے ساتھ ہندوستان دنیا کے ایک بڑے اعلیٰ تعلیمی شعبوں والا ملک ہے۔ ان کثیر التعداد تعلیمی اداروں سے ہمارے یہاں اعلیٰ تعلیم تک رسائی میں اضافہ تو ہوا ہے لیکن ان میں اعلیٰ تعلیمی معیار کا فقدان ہے۔ فارغ التحصیل افراد کے لیے فرسودہ اور علمی سطح سے مطابقت نہ رکھنے والا غیر موزوں اور فرسودہ نصاب، درس و تدریس کا ناقص معیار، تحقیق کی عدم موجودگی یا ناقص تحقیقی معیار، کمزور لائحہ عمل، تدریس و فنی تعلیم کی مشکلات، محدود رسائی، یونیورسٹی اور صنعت میں باہمی ربط کا فقدان، اور ضرورت سے کم رقوم کی فراہمی وغیرہ چند ایسی خامیاں ہیں، جن پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ نیز ہندوستان کے تعلیمی نظام کو عالمی سطح پر مسابقتی، موزوں و مناسب بنانے کے لیے پرائمری سے اعلیٰ تعلیم کی سطح تک جدت و تبدیلی کے نقطۂ نظر کو بھی اپنانے کی ضرورت ہے۔

Brookings India کی ایک رپورٹ کے مطابق ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم میں داخلے لینے والے 50 فیصد سے زائد طلبہ گریجویشن کے صرف تین کورس بی اے، بی ایس سی، بی کام میں داخلہ لیتے ہیں جو یونیورسٹیوں سے ملحقہ کالجوں کے ذریعے فراہم کیے جاتے ہیں۔ ان میں اکثر میں کسی قسم کی جدت و اختراع کی قطعی گنجائش نہیں ہوتی ہے، یا یوں کہیں کہ بہت کم ہوتی ہے۔ سخت اصول و ضابطے سے بندھے ہوئے ہندوستان کے اعلیٰ تعلیم کے شعبے، مالی وسائل کی کمی سے بھی دوچار ہیں۔ ان میں عالمی معیار کی تعلیم فراہم کرنے کی وہ صلاحیت اور مستعدی نہیں جس کی ضرورت ہے۔ ہندوستان میں ایسے اداروں کا بھی فقدان ہے جو تیزی سے بدلتی ہوئی مانگ و ضرورت کے لیے چاق و چوبند اور مستعد ہوں۔ نیز جو اپنے نصاب میں ضرورت کے مطابق بغیر تاخیر کیے ہوئے تبدیلی لاسکیں۔

ہمارے سامنے ترقی یافتہ ممالک کی مثالیں موجود ہیں۔ مشرقی ممالک کی تاریخ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ابتدائی سطح کی تعلیم وہ کلید ہے جو معاشرتی اور اقتصادی ترقی کے تمام دروازے کھولتی ہے۔ دوسری طرف یہ بھی

حقیقت ہے کہ ہندوستان میں عوامی بنیادی تعلیم اور فنڈنگ کی جو اہمیت ہونی چاہیے اس کا فقدان رہا ہے۔

دہلی کی ایک بھرتی اور مہارت کی تشخیص کرنے والی کمپنی Aspiriing Minds کا کہنا ہے کہ 85 فیصد لبرل آرٹس فارغ التحصیل اور 75 فیصد انجینئرنگ گریجویٹس ہندوستانی اور ملٹی نیشنل اداروں میں قابل ملازمت نہیں ہیں اور یہی سبب ہے کہ ہندوستانی صنعت و زراعت کی پیداواری صلاحیت دوسرے ترقی یافتہ اور ترقی پذیر ممالک کے مقابلے کم ہے۔ اس رپورٹ میں یہ بھی انکشاف ہوا کہ ہمارے 80 فیصد انجینئرنگ طلبا علمی معیشت میں روزگار حاصل کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ اور ان میں صرف 2.5 فیصد انجینئرنگ طلبا مصنوعی ذہانت اور ٹیکنیکل مہارت رکھتے ہیں جو موجودہ دور میں صنعت کے لیے لازمی ہے۔

رپورٹ میں اس بات پر بھی زور دیا گیا ہے کہ ہندوستان کے اعلیٰ تعلیمی نظام میں ایڈ ہاک تبدیلیوں سے بے روزگاری جیسے مسئلے کو حل کرنے میں مدد نہیں ملے گی۔ دوسری طرف یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ماضی کے مقابلے ہمارے یہاں اعلیٰ تعلیم کا حصول آسان ہوا ہے۔ نتیجتاً تعلیم یافتہ افراد کی تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے لیکن یہ اضافہ روزگار میں مواقع کی فراہمی اور دستیابی کے تناسب سے میل نہیں کھاتا ہے۔ یہ عین ممکن ہے کہ مستقبل میں بہتر روزگار کے حصول کی دوڑ میں ہر 100 میں سے 70 امیدوار اعلیٰ تعلیم یافتہ ہوں گے۔ اس وقت کاروباری گھرانے ایسے امیدواروں کو ترجیح دیں گے جو اپنے میدان میں یا اُن سے منسلک شعبے میں خاطر خواہ تجربہ رکھتے ہوں اور تربیت یافتہ ہوں۔ موجودہ 'نالج اکنامی' کے دور میں تعلیم یافتہ ہونے کے ساتھ تربیت یافتہ ہونا بھی لازمی ہوتا جا رہا ہے۔ اب کسی ایک مخصوص علم پر اکتفا کر کے روزگار کے میدان میں مقابلہ آرائی دشوار کن ہوگی۔ 'نالج مکس' کے زمانے میں 'ہرفن مولا' ہونا بھی روزگار حاصل کرنے کے لیے ضروری ہوگا۔ لیکن اس سے یہ مراد قطعی نہیں کہ ماہرین اور متخصص افراد کی ضرورت نہیں ہوگی۔ ماہرین کی بھی ضرورت ہوگی لیکن اس قدر نہیں جتنی ماضی میں ہوا کرتی تھی۔ روزگار حاصل کرنے کے لیے تازہ گریجویٹس کے ساتھ سب سے بڑی پریشانی یہ ہے کہ ان میں بنیادی تصورات اور مہارتوں کا فقدان ہے جو آج کی صنعت کے لیے لازمی ہے۔ نیز تکنیکی معلومات کی تفہیم کی کمی، کلائنٹ ہینڈلنگ اسکلس کا فقدان اور متعلقہ شعبے کی عدم معلومات اس شعبے کی وہ چند خلیج ہیں جن کو پُر کیے بغیر ہمارے فارغ التحصیل طلبا برسر روزگار نہیں ہو سکتے۔

ماہرین کے مطابق ہمارا ثانوی تعلیمی نظام، گریجویشن میں داخلے کے لیے سلیکشن کا طریقہ کار، درس و تدریس کا معیار، مضمون میں دلچسپی اور تعلیمی شعبے میں کارپوریٹ سیکٹر کی عدم شمولیت جیسی متعدد وجوہات ہیں، جو ہمارے فارغ التحصیل گریجویٹس کی روزگار حاصل کرنے صلاحیت کی شرح کو مزید کم کرتے ہیں۔ جبکہ اس شعبے سے وابستہ Stakeholders کا نقطہ نظر یہ ہونا چاہیے کہ وہ ان وجوہات کی نشاندہی کریں کہ جن کے سبب Employability Gaps میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ صحیح معنوں میں روزگار کے فاصلے کو ختم کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی شارٹ کٹ نہیں ہے۔ تاہم ان خامیوں کی وجوہات کی شناخت، ان کی مقدار کا تعین اور قلیل مدتی پیشہ وارانہ و طویل مدتی منصوبہ بندی کر کے اس خلیج کو ختم کیا جا سکتا ہے۔

آج کے علمی معیشت کے ابھرتے ہوئے منظر نامے میں اعلیٰ تعلیم کا کردار کسی بھی ترقی یافتہ یا ترقی پذیر ملک بالخصوص ہندوستان کے تعلق سے کثیر الجہت ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے شعبے میں تدریسی معیار کی کمی، مالی اعانت، تعلیم میں اصول و نظریات پر ضرورت سے زیادہ توجہ اور عملی علم کی بجائے تدریس کے روایتی طریقے، نجکاری، سہولیات کی عدم دستیابی اور بنیادی ڈھانچے کی کمی، کوٹا سسٹم وغیرہ وہ مسائل ہیں جو ہمیں سست رو کر رہے ہیں۔ اس سبب ہمارے بیشتر تعلیمی ادارے اذیت ناک دور سے گزر رہے ہیں۔

کیا ان مسائل کا حل ہمارے پاس ہے؟ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ ہمیں خود مختار اعلیٰ تعلیمی اداروں کی ضرورت ہے جو اپنے نصاب کی تشکیل اور تعلیمی معاملات پر آزادانہ فیصلے لینے کا اختیار رکھتے ہوں، ان اداروں کو جدید پروگراموں کو تیار کرنے کی آزادی ہو۔ جو فارغ التحصیل افراد کو نہ صرف ملازمت یا نوکری کا متلاشی بنائیں بلکہ اپنے میدان میں رہنما بھی بنائیں اور اپنی روایتی تین سالہ ڈگری فارمیٹ (جو اپنی افادیت کو کھو چکا ہے) کے مطابق ہونے کی قید سے آزاد ہوں۔ آج ہمیں علمی، سیاسی اور سماجی قیادت کے لیے عالمی معیار کے اداروں کی ضرورت ہے اور ہمارے یہاں اس کی عمدہ مثالیں IITS, NITS, IIBMS اور دیگر اعلیٰ تعلیمی اداروں کی صورت میں موجود ہیں۔

آج ٹکنالوجی نے انسان کی جگہ لے لی ہے۔ اب صنعت و زراعت میں انسانی مداخلت رفتہ رفتہ کمزور یا ختم ہو رہی ہے۔ ٹکنالوجی نے ہر چیز پر قبضہ کر لیا ہے۔ اس لیے ہمیں ہر شعبے میں ایسے افراد تیار کرنے ہوں گے جو بدلتے ہوئے تکنیکی منظر نامے کے ساتھ مطابقت پیدا کر سکیں۔ بدقسمتی سے ہمارے بیشتر اعلیٰ تعلیمی اداروں نے اس بدلتی ہوئی حقیقت سے پیدا شدہ چیلنجز کا پوری طرح سامنا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہیں کیا ہے، لیکن ہم ان چیلنجز کا بخوبی حل نکال سکتے ہیں۔ کیونکہ ہمارے ملک کی اصل طاقت ہمارا انسانی وسائل اور علمی نظام ہے، جس نے ہزاروں سال کا سفر طے کر کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق تعلیمی نظام اور ملک کو ترقی کی راہ پر گامزن کیا ہے۔ قوموں کی تعمیر میں تعلیم کا ایک اہم کردار ہوتا ہے۔ بہتر معیار تعلیم سے ہماری آنے والی نسلوں کی سربلندی ہوگی۔ نیز تعلیم جمہوریت کی جڑوں کو مستحکم اور مضبوط کرتی ہے۔ چنانچہ عصر حاضر میں معیاری تعلیم کی ضرورت پہلے سے زیادہ بلکہ ناگزیر ہے۔ انسانی وسائل کی صلاحیت اور قابلیت کا دار و مدار تعلیمی نظام پر منحصر ہے یعنی موجودہ حالات میں ترقی کا واحد منبع تعلیم یافتہ عوام ہے۔ تعلیم ہی وہ عمل ہے جس سے انسان کا جسم، دماغ اور کردار بنتا، سنورتا اور مضبوط ہوتا ہے۔ نیز تعلیم ہی وہ عمل ہے جو ہماری شخصیت کو نکھارتا اور ہمہ جہت بناتا ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ان پر مزید غور و فکر کریں اور ہائر ایجوکیشن کا اعلیٰ معیار قائم کرنے کا ہدف لے کر ایک طویل مدتی ایکشن پلان مرتب کریں۔ اُن اصولوں کو نصاب میں شامل کریں جو بدلتے ہوئے تکنیکی منظر نامے سے مطابقت رکھتے ہوں اور ایسے اعلیٰ تعلیمی اداروں کو فروغ دیں جن میں خود مختاری، اور نصاب میں جدت طرازی کے ذریعے ہر شعبے میں قائدین پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔ بین الاقوامیت کے فروغ، جدید معیشت کی عالمگیری نوعیت، علم ثقافت اور تا عمر سیکھنے سکھانے اور تعلیم جاری رکھنے کے تصور نے بین الاقوامی اور قومی حوالے سے اعلیٰ تعلیم کو ایک نیا رخ اور نمایاں حیثیت عطا کی ہے۔ ان بدلتے ہوئے حالات کے مدنظر ہندوستان کے تعلیمی اداروں کو عالمی معیار پر پورا اترنا ہوگا اور ایسے سند یافتہ افراد تیار کرنے ہوں گے جو اعلیٰ اداروں کے ہم پلہ ہوں۔ ایسے فارغ التحصیل افراد صرف ملازمت کے متلاشی ہی نہیں ہوں گے بلکہ ملازمت دینے والے بھی بنیں گے۔ کیونکہ ہندوستان ایک بہت بڑا انسانی وسائل والا ملک ہے۔ اس توانائی کو صحیح اور مثبت انداز میں استعمال کر کے بہت کچھ حاصل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں بے پناہ مواقع میسر ہیں لیکن ان مواقع سے استفادہ کیسے کیا جائے اور ان کو دوسروں تک کیسے پہنچایا جائے، اس پر از سر نو غور و فکر کرنے کی ضرورت ہے۔ دراصل اعلیٰ تعلیمی اداروں کو عالمی معیار پر لائے بغیر ہم اپنے ملک کی ترقی کی شرح کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔

■

Dr. Mohammad Ahsan
12, Ahemdabad Palace Road
Kho-e-Fiza
Bhopal - 462001 (MP)
Email.: ahsanmohd16862@gmail.com

مساوات پر مبنی تعلیم اور قومی تعلیمی پالیسی 2020

بختیار احمد

عالمی تناظر میں مساوات کی اہمیت و ضرورت

مساوات پر مبنی تعلیم کا مطالبہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ سب کے لیے یکساں معیار کی تعلیم (قطع نظر فرد، جنس، قابلیت، مذہب، ذات، علاقہ، سماجی و معاشی حیثیت، اور نسل) کی ضرورت بہت پہلے سے محسوس کی جارہی ہے۔ دی روٹلیج انٹرنیشنل انسائیکلوپیڈیا آف ایجوکیشن 2008 کے مطابق، ارسطو نے 348-322 قبل مسیح کے دوران لکھا تھا کہ تعلیم عوامی اور سب کے لیے یکساں ہونی چاہیے (میک کولچ و دیگر 2008)۔ بعد میں افلاطون، سینٹ تھامس ایکویناس نے بھی اپنی تحریروں میں تقریباً اسی تصور کی حمایت کی۔ دو صدی قبل ایڈم اسمتھ نے امن عامہ اور آزادی کے تحفظ کے واسطے عالمگیر تعلیم کی وکالت کی۔ ایک صدی بعد، میجی جاپان نے ایک مضبوط فوج اور ایک امیر ملک کی بنیاد کے طور پر تعلیم کو فروغ دیا (ابریکس وفریرا 2009)۔ بیسویں صدی کے وسط تک، تعلیم انسانی حقوق کے عالمی اقرار نامے میں درج ہو چکی تھی جس کے مطابق ''ہر ایک کو تعلیم کا حق ہے۔ تعلیم مفت ہوگی، کم از کم ابتدائی اور بنیادی مراحل میں۔ ابتدائی تعلیم لازمی ہوگی۔ تکنیکی اور پیشہ ورانہ تعلیم عام طور پر دستیاب کی جائے گی اور اعلیٰ تعلیم صلاحیت کی بنیاد پر سب کے لیے یکساں طور پر قابل رسائی ہوگی (اقوام متحدہ، 1949 ص 6)'' یونیسکو نے سال 1990 میں 'سب کے لیے تعلیم کے عالمی اقرار نامہ' پر اپنی رپورٹ میں بنیادی تعلیم کی ضرورت پر بھی زور دیا اور اعلان کیا کہ لڑکیوں عورتوں، غریبوں، دیہی باشندوں، خانہ بدوشوں، اقلیتوں اور ہر قسم کے معذوروں کو بنیادی تعلیم فراہم کی جانی چاہیے۔ ان خیالات کی تصدیق ڈکار فریم ورک فار ایکشن (2000) میں کی گئی، جس کے مطابق ''پسماندہ اور خارج شدہ گروہوں کے بچوں کو راغب کرنے اور انھیں برقرار رکھنے کے لیے، تعلیمی نظام کو لچیلا بنانا چاہیے، متعلقہ مواد کو قابل رسائی اور دلکش شکل میں فراہم کیا جانا چاہیے۔ تعلیمی نظام کو لازمی طور پر شمولیاتی طرز کا ہونا چاہیے، ان بچوں کی تلاش میں فعال ہونا چاہیے جن کا داخلہ نہیں ہو سکا، اور سبھی متعلموں کے حالات وضروریات کی تکمیل کے تئیں لچکدار رویے کا حامل ہونا چاہیے۔'' (یونیسکو 2000، ص 16)۔

ہندوستانی سیاق و سباق میں تعلیم میں مساوات کی ضرورت و اہمیت

ہندوستانی تحریروں میں بھی تعلیم میں مساوات کی ضرورت کو یکساں طور پر پیش کیا گیا ہے۔ تقریباً تین دہائی قبل نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف ایجوکیشنل پلاننگ اینڈ ایڈمنسٹریشن (NIEPA 1990) نے 'اسکول ایجوکیشن ان انڈیا دی ریجنل ڈائمنشن' کے عنوان سے شائع ہونے والی رپورٹ میں تعلیم کے معیار اور مساوات سے متعلق مختلف مسائل کے بارے میں بہت عمدہ تحریر پیش کی ہے۔ اس کے مطابق عدم مساوات، اس کی مختلف شکلوں میں معاصر دنیا کو درپیش اہم مسائل میں سے ایک ہے۔ یہ عام طور پر قبول کیا جاتا ہے کہ سماجی زندگی کے تمام شعبوں میں مساوات کو یقینی بنانے کی کوشش کی جانی چاہیے۔ اس نے مزید کہا کہ مساوات کا اصول نہ صرف پسماندگی اور مجموعی تاریخی ناانصافیوں کے نتائج کو کم کرنے کی ہماری کوششوں کے تناظر میں اہم ہے بلکہ قومی تعمیر نو کے کام کے تناظر میں نہایت اہم ہے جس میں ملک آزادی کے بعد سے مصروف ہے۔

این سی ایف 2005 باب چہارم (ص 82-81) میں 'Nurturing and Enabling Environment' کے عنوان سے اس بات پر زور دیتا ہے کہ ہمارے اسکولوں کی پہچان سماجی انصاف، مساوات اور تنوعات کے احترام جیسے اقدار کا تحفظ کرنے والوں کے طور پر ہونی چاہیے۔ انھیں بچوں کے حقوق اور وقار کا احترام کرنے والا ہونا چاہیے۔ ان اقدار کو اسکول کی سرگرمیوں کی بنیاد بنانی چاہیے۔ اسکول کو سیکھنے کے قابل ماحول بنانا چاہیے جہاں ہر بچہ کسی بھی قسم کے خوف کے بغیر محفوظ محسوس کرے۔ ہمارے اسکولوں کو برابری اور مساوات کے درمیان ہم آہنگی کو رہنما اصول بنانا چاہیے۔ اس کے لیے استاد کو چاہیے کہ بچوں کے درمیان بغیر کسی تفریق کے برابری کا معاملہ کرے۔ اساتذہ کو کلاس روم میں بچوں کے لیے بھی گنجائش فراہم

کرنے کی ضرورت ہے جہاں طلبا میں کسی بھی قسم کے خوف کے بغیر سوالات پوچھنے کی عادت پروان چڑھے۔

سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (CABE 2005) کی کمیٹی رپورٹ بعنوان 'ثانوی تعلیم کی عالمگیریت' (چوتھا باب) کے مطابق ابتدائی سوالات جن کو حل کرنے کی ضرورت ہے، وہ ہیں: ثانوی تعلیم تک سب کی رسائی، مساوات اور سماجی انصاف کا حصول۔ جہاں رسمی اور غیر روایتی طریقوں سے اسکولنگ کی سہولیات کی توسیع کے ذریعہ عالمگیر رسائی حاصل کی جا سکتی ہے، وہیں سیکھنے کے تمام متنوع گروہوں کی برابری، سماجی انصاف اور کارکردگی کے حصول کے لیے خصوصی کوششوں کی ضرورت ہوگی۔

CABE کمیٹی کی رپورٹ کے مطابق دوسرا زیر غور موضوع لڑکیوں، درج فہرست ذات، درج فہرست قبائل اور پسماندہ طبقات کی طالبات اور (جسمانی اور ذہنی) چیلنج شدہ نوجوانوں کی تعلیم کی فراہمی ہے۔ چونکہ ان تمام جماعتوں کو خصوصی تعاون وحمایت کی ضرورت ہے، سیکنڈری ایجوکیشن مینجمنٹ انفارمیشن سسٹم (SEMIS) کو خاص طور پر ان جماعتوں کی جانکاری حاصل کرنی چاہیے اور ان کی تعلیم کی نگرانی کے لیے راہ عمل کی وضاحت بھی کرنی چاہیے۔ اس سے قابل توجہ جماعتوں کے درمیان عالمگیر ثانوی تعلیم کو یقینی بنانے میں مدد ملے گی۔

قومی تعلیمی پالیسی 2020 (NEP 2020) نے مساوی اور جامع تعلیم پر مکمل ایک باب یہ اجاگر کرنے کے لیے وقف کر رکھا ہے کہ جامع اور مساوی تعلیم، جو کہ اپنے آپ میں ایک بنیادی ہدف ہے، ایک جامع اور مساوی معاشرے کے حصول کے لیے بھی اہم ہے جس میں ہر شہری کو خواب دیکھنے، ترقی کرنے اور قوم میں اپنی حصے داری کا موقع ملتا ہے۔ یہ پالیسی اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ اسکولی تعلیم میں رسائی، شرکت اور اکتسابی ماحصل میں سماجی زمرے کے فرق کو ختم کرنا تعلیمی شعبے کے تمام ترقیاتی پروگراموں کے اہم اہداف میں سے ایک رہے گا (NEP 2020، ص 24)۔ تعلیمی نظام کا مقصد ہندوستان کے بچوں کو فائدہ پہنچانا ہے تاکہ کوئی بچہ جائے پیدائش یا اپنے کمزور پس منظر کی وجہ سے سیکھنے اور بہترین کارکردگی کا کوئی موقع ضائع نہ کرے۔

تعلیم میں مساوات کی مختلف جہتیں

ستسنگی ولاجونتی (Satsangi and Lajwanti, 1997)، پرکاش برٹے (Prakash Burte, 2008)، شجاتھا (Sujatha, 2002)، سینٹرل ایڈوائزری بورڈ آف ایجوکیشن (CABE, 2005)، NIEPA (1990) و دیگر ادبیات کا جائزہ لینے پر ہندوستانی منظر نامے میں تعلیمی مساوات کے درج ذیل بڑے پہلو نکل کر آتے ہیں (احمد بی 2014):

1. سماجی مساوات: اقلیت و اکثریت کے درمیاں، درج فہرست ذات، درج فہرست قبائل اور جنرل طبقات کے مابین عدم مساوات وغیرہ۔

2. صنفی مساوات: مردوں اور عورتوں کے درمیان عدم مساوات۔

3. اقتصادی مساوات: غریب اور امیر کے درمیان عدم مساوات۔

4. جغرافیائی مساوات: شہری اور دیہی، دور دراز، علاقائی/ ریاستی رجحان کے درمیان عدم مساوات۔

5. معذوری سے متعلق مساوات: مختلف قسم کے معذوروں اور عام افراد کے درمیان عدم مساوات۔

6. تعلیمی مساوات: مختلف مراحل تک ناخواندہ اور خواندہ کے درمیان عدم مساوات۔

7. عمر سے متعلق مساوات: مختلف عمر کے گروہوں کے سیکھنے والوں میں عدم مساوات۔

تعلیم میں مساوات کی پیمائش

تعلیم میں مساوات کی معیاری پیمائش بیشتر ادبیات میں ایکوئٹی پیرامیٹرز پر سوالناموں کے ایک سیٹ پر مبنی ہوتا ہے، جن کا تعلق ان افراد/گروہوں سے ہے جن کی عدم مساوات کا جائزہ لیا جا رہا ہے اور پھر ان سوالناموں کا تفصیل سے تجزیہ کیا جاتا ہے۔ قومی اتحاد برائے تعلیم، یونیورسٹی آف کیلیفورنیا، سانتا باربرا نے مساوات پر اپنے مباحثے میں (ولیس گلاس 2009) آٹھ وسیع زمروں کے تحت سوالناموں کی تفصیلی فہرست تیار کی ہے تاکہ کمرہ جماعت اور اسکول کی تعلیم میں مساوات کی پیمائش کی جا سکے۔ ان آٹھ زمروں کے کچھ ابتدائی سوالات کا ذکر ذیل میں کیا گیا ہے۔

1. کمرۂ جماعت کے اعمال (مثال کے طور پر- کمرہ جماعت میں کون حصہ لے رہا ہے؟ کیا اساتذہ توجہ دے رہے ہیں، تفتیشی سوالات پوچھ رہے ہیں، اور سبھی طلبہ کو ترغیب دے رہے ہیں؟)۔

2. نصاب (مثلاً کیا موضوعات کی تخفیف کاری سے طلبہ کی کامیابی پر اثر پڑتا ہے؟)۔

3. اسکول میں طلبا کی ثقافت: (مثلاً کیا طلبا کے لیے شعبہ رول ماڈل ہیں؟ اگر سارے اساتذہ سفید رنگ کے کپڑے پہنیں تو یہ طالب علم کو کیسے متاثر کرتا ہے؟)

4. بالغوں کی ثقافت: (مثلاً مختلف رنگوں، اقلیتی زبانوں اور کمزور معاشی حالت والے طلبہ کی غیر متناسب کامیابی و ناکامی کی وضاحت کیسے کرتے ہیں)۔

5. والدین: (کیا مختلف رنگوں اور انگریزی زبان کے بچوں کے والدین، اسکول کے پروگراموں اور بورڈ میٹنگ میں شرکت کرتے ہیں۔ کیا وہ کمیٹیوں اور اسکول بورڈ میں نمائندگی کرتے ہیں؟ کیا وہ محسوس کرتے ہیں کہ اسکول میں ان کی سنی جاتی ہے اور وہ اسکول کمیونٹی کے قابل احترام رکن ہیں؟)۔

6. ٹیسٹنگ: (مثلاً تشخیصی نظام کس طرح استعمال کیا جا رہا ہے اس سے کم نمائندگی والے جماعتوں کے طلبا کی کامیابی پر کیا اثر پڑتا ہے)

7. اسکول اور ضلع کی پالیسیاں (مثلاً مشاورت کے طریقے کس طرح طالب علم کی خودشناسی و کارکردگی کو متاثر کرتی ہیں، اور ٹریکنگ پالیسیاں کس طرح طلبہ کی کامیابی کو متاثر کر رہی ہیں۔

8. کالج اور یونیورسٹیاں (مثلاً یونیورسٹی کی پالیسیاں اہلیت کی شرح، نصاب اور تدریس کے طریقوں کو کیسے متاثر کرتی ہیں؟)

قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے مطابق سماجی ثقافتی شناخت

سماجی تعلیمی پسماندہ جماعت جنھیں ایس ای ڈی جی (SEDGs) بھی کہا جاتا ہے کے زمرے میں آنے والی سماجی و ثقافتی شناخت جن کا ذکر این ای پی 2020 (ص 24) میں کیا گیا ہے کا مختصر جائزہ مندرجہ ذیل ذیلی حصوں میں کیا گیا ہے۔

1. U-DISE 2016-1 کے اعداد و شمار کے مطابق، پرائمری سطح پر تقریباً 19.6% طلبا درج فہرست ذات سے تعلق رکھتے ہیں، لیکن یہ حصہ اعلیٰ ثانوی سطح پر 17.3% پر آ جاتا ہے۔ درج ذیل قبائل کے طلبا کی تعداد 10.6% سے گھٹ کر 6.8 فی صد اور معذور بچوں کی تعداد 1.1 سے گھٹ کر 0.25 تک پہنچ گئی ہے۔ ڈراپ آؤٹ کی یہ سطح بہت زیادہ ہے، ان میں سے ہر ایک زمرے میں لڑکیوں کے ڈراپ آؤٹ کی سطح زیادہ ہے۔ جبکہ اعلیٰ تعلیم میں داخلے میں ڈراپ آؤٹ کی سطح اور بھی زیادہ ہے۔

2. متعدد عوامل، بشمول معیاری اسکولوں تک رسائی کا فقدان، غربت، رسم و رواج اور زبان نے درج فہرست ذاتوں میں اندراج برقرار رکھنے کی شرح پر نقصان دہ اثر ڈالا ہے۔ درج فہرست ذات سے تعلق رکھنے والے بچوں کی رسائی، شرکت اور اکتسابی ماحصل کے انخلا کو ختم کرنا ایک

اہم ہدف ہے۔ نیز، دیگر پسماندہ طبقات (او بی سی) جن کی شناخت تاریخی، سماجی اور تعلیمی طور پر پسماندہ ہونے کی بنیاد پر کی گئی ہے، پر بھی خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

3. درج فہرست قبائل کے بچوں کو بھی مختلف تاریخی اور جغرافیائی عوامل کی وجہ سے کئی سطحوں پر نقصانات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ قبائلی برادریوں کے بچے اکثر تعلیم کو اپنی زندگی سے غیر متعلق اور غیر ملکی سمجھتے ہیں، ثقافتی اور تعلیمی دونوں لحاظ سے۔ حالانکہ قبائلی برادریوں کے بچوں کی بہتری کے لیے کئی پروگرام چل رہے ہیں، اور چلتے رہیں گے، اس بات کو یقینی بنانے کے لیے خصوصی طریقہ کار بنانے کی ضرورت ہے کہ قبائلی برادریوں کے بچے ان پروگراموں سے فوائد حاصل کر سکیں۔

4. اسکول اور اعلیٰ تعلیم میں بھی اقلیتوں کی نسبتاً کم نمائندگی ہے۔ پالیسی تمام اقلیتی برادریوں سے تعلق رکھنے والے بچوں کی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے مداخلت کی اہمیت کو تسلیم کرتی ہے، اور خاص طور پر وہ طبقات جو تعلیمی طور پر کم نمائندگی رکھتی ہیں۔

سب کے لیے مساوات پر مبنی تعلیم کو یقینی بنانا: قومی تعلیمی پالیسی 2020 کے اہم اقدامات

قومی تعلیمی پالیسی 2020 (ص 27-25 نے اپنی رپورٹ میں متعدد پالیسی اقدامات کا ذکر کیا ہے جو درج ذیل ہیں:

1. پالیسی میں مختلف اسکیموں اور پالیسیوں پر تبادلہ خیال کیا گیا، جیسے والدین کو اپنے بچوں کو اسکول بھیجنے کی ترغیب دینے کے لیے نقد رقم کی منتقلی، مخصوص وظائف، ٹرانسپورٹ کے لیے سائیکلیں فراہم کرنا وغیرہ جیسے اسکیم جن کی وجہ سے کچھ علاقوں میں اسکولی نظام میں سماجی و معاشی اعتبار سے محروم طبقات کی شمولیت میں واضح طور پر اضافہ دیکھا گیا ہے۔ مذکورہ پالیسی کا مشورہ ہے کہ ایسی اسکیموں کو ملکی سطح پر مضبوط کیا جائے۔

2. پالیسی سماجی و تعلیمی پسماندہ طبقات (SEDGs) کے لیے مختلف اسکیموں کی تاثیر کو دیکھنے کے لیے تحقیق کا مشورہ دیتی ہے۔ اس میں پیر ٹیوٹرنگ (Peer tutoring)، مناسب بنیادی ڈھانچہ، مناسب تکنیکی مداخلتوں کی کھلی اسکولنگ، اور ون آن ون اساتذہ اور ٹیوٹرز خاص طور پر معذور بچوں کے لیے موثر بتائے گئے ہیں۔ ایسے کونسلر یا اچھی طرح سے تربیت یافتہ سماجی کارکن جو کہ اساتذہ، اسکولوں، طلبا اور والدین کے ساتھ مل کر کام کر سکتے ہیں، خاص طور پر شہر کے غریب علاقوں کے بچوں کے لیے موثر پائے گئے ہیں۔

3. پالیسی میں یہ تجویز دی گئی ہے کہ ملک کے وہ علاقے جن کی بڑی آبادی تعلیمی طور پر پسماندہ ہے، کو خصوصی تعلیمی زون (SEZs) قرار دیا جائے، جہاں تمام اسکیموں اور پالیسیوں کو اضافی اور ٹھوس کوششوں سے نافذ کیا جائے تاکہ ان کے تعلیمی منظرنامے کو صحیح معنوں میں تبدیل کیا جا سکے۔

4. یہ نوٹ کرنا ضروری ہے کہ تمام زیر نمائندگی جماعتوں میں خواتین کی تعداد زیادہ ہے، جو تمام سماجی و تعلیمی پسماندہ طبقات میں لگ بھگ نصف آدھا ہے۔ بدقسمتی سے SEDGs کو جس اخراج اور عدم مساوات کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ خواتین کے معاملے میں اور بھی زیادہ ہے۔ یہ پالیسی خواتین کی ان مخصوص اور اہم کردار کو بھی منظر عام پر لاتی ہے جو معاشرے اور سماجی رویوں کی تشکیل میں نہایت اہمیت کا حامل ہیں۔ لہٰذا، لڑکیوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنا تمام سماجی اور تعلیمی پسماندہ طبقات کے لیے تعلیمی سطح کو بڑھانے کا بہترین طریقہ ہے۔ یہ نہ صرف موجودہ بلکہ مستقبل کی نسلوں کو بھی پروان چڑھانے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ پالیسی تقریباً تمام اسکیموں اور پالیسیوں میں خواتین کو خصوصی توجہ اور ترجیح کی سفارش کرتی ہے۔

5. یہ پالیسی تمام لڑکیوں و ٹرانسجنڈر طلبا کو مساوات پر مبنی تعلیم کو فروغ دینے کے لیے اس بات کی تصدیق کرتی ہے کہ حکومت ہند ایک صنفی شمولیت فنڈ تشکیل دے گی۔ یہ فنڈ صفائی ستھرائی اور بیت الخلا، سائیکلوں، کمیونٹی پر مبنی مداخلت، مشروط نقد رقم کی منتقلی وغیرہ جیسی سہولیات فراہم کرنے میں استعمال کیا جائے گا۔

6. زیادہ سے زیادہ کیندریہ ودیالیہ اور جواہر نوودیا ودیالیہ خصوصی تعلیمی زون (SEZs) اور پسماندہ علاقوں کا خیال رکھتے ہوئے بنائے جائیں گے۔ سماجی و معاشی پسماندہ طلبہ اور طالبات کے لیے بورڈنگ کی سہولیات جواہر نوودیا ودیالیہ کی طرز پر بنائی جائیں گی۔ یہ پالیسی سماجی و معاشی طور پر پسماندہ لڑکیوں کے لیے کستوربا گاندھی بالیکا ودیالوں کی توسیع کا مشورہ بھی دیتی ہے۔

7. یہ پالیسی معذور بچوں کی بنیادی تعلیم کے مرحلے سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک باقاعدہ اسکولنگ کے عمل میں مکمل شرکت کو یقینی بناتی ہے۔ یہ پالیسی اسکول ایجوکیشن کے حوالے سے RPWD ایکٹ 2016 کی سفارشات کی توثیق کرتی ہے۔

8. معاون آلات اور مناسب ٹکنالوجی پر مبنی آلات نیز مناسب اور زبان کے مطابق تدریسی مواد (جیسے کہ قابل رسائی فارمیٹس میں درسی کتب جیسے بڑے پرنٹ اور بریل) دستیاب ہوں گے تاکہ معذور بچے آسانی سے کمرہ جماعت میں ضم ہو سکیں۔ اساتذہ اور اپنے ہم سروں کے ساتھ مشغول رہیں۔ اس کا اطلاق اسکول کی تمام سرگرمیوں بشمول فنون، کھیلوں اور پیشہ ورانہ تعلیم پر ہوگا۔ این آئی او ایس (NIOS) ہندوستانی سائن لینگویج سکھانے، اور ہندوستانی سائن لینگویج کا استعمال کرتے ہوئے دیگر بنیادی مضامین سکھانے کے لیے اعلیٰ معیار کے ماڈیول تیار کرے گا۔

9. گھر پر تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کو عام اسکولی نظام میں تعلیم حاصل کرنے والے بچوں کے برابر سمجھا جانا چاہیے۔ عدل و مساوات کے اصول کو استعمال کرتے ہوئے گھر پر مبنی تعلیم کی کارکردگی اور اثر کو جاننے کے لیے آڈٹ ہونا چاہیے۔ گھر پر مبنی اسکولنگ کے لیے ہدایات اور معیارات آر پی ڈبلیو ڈی ایکٹ 2016 کو مدنظر رکھتے ہوئے آڈٹ کی بنیاد پر تیار کیے جانے چاہیے۔

10. تشخیص اور سرٹیفیکیشن ایجنسیاں، بشمول مجوزہ نیا National Assessment Centre, PARAKH بنیادی لول سے لے کر اعلیٰ تعلیم (بشمول داخلہ امتحانات) کے لیے ہدایات مرتب کرے گا اور مناسب ٹولز کی سفارش کرے گا تاکہ تمام طلبا کے لیے یکساں رسائی اور مواقع کو یقینی بنایا جا سکے۔

11. مخصوص معذور بچوں کے بارے میں آگاہی اور ان کو سکھانے کے طریقوں کا علم تمام اساتذہ کے تعلیمی پروگراموں کا ایک لازمی جزو ہوگا۔ اس کے ساتھ ساتھ اساتذہ کو صنفی و دیگر پسماندہ طبقات کے تئیں حساس بنانا بھی ایک اہم ترجیح ہے۔

12. یہ پالیسی روایات اور متبادل تدریسی طریقوں کو محفوظ رکھنے کے لیے متبادل اسکولی نظام تجویز کرتی ہے۔ پالیسی کی سفارش ہے کہ تعلیمی نصاب میں سائنس، ریاضی، سماجی علوم، ہندی، انگریزی، ریاستی زبانیں یا دیگر متعلقہ مضامین شروع کرنے کے لیے مالی مدد فراہم کی جائے گی۔ سائنس، ریاضی، زبان اور سماجی علوم کی تدریس میں اساتذہ کی صلاحیتیں بہتر کی جائیں گی۔ نئے تدریسی طریقوں کی طرف بھی توجہ دی جائے گی۔ کتب خانوں اور تجربہ گاہوں کو بہتر کیا جائے گا اور مطالعے کے لیے مناسب مواد جیسے کتابیں اور دیگر تدریسی مواد دستیاب کرایا جائے گا۔

13. درج فہرست ذاتوں اور درج فہرست قبائل کی تعلیمی ترقی میں تفاوت کو کم کرنے پر خصوصی توجہ دی جائے

گی۔ برج کورسز: مخصوص علاقوں میں ہاسٹل اور فیس میں چھوٹ اور وظائف کے ذریعے باصلاحیت اور ہونہار طلبہ کو مالی مدد دی جائے گی۔

14. این سی سی ونگز کو وزارت دفاع کے تحت ریاستی حکومتیں اپنے ثانوی اور اعلیٰ ثانوی اسکولوں میں کھول سکتی ہیں، جن میں قبائلی اکثریتی علاقوں میں واقع اسکول بھی شامل ہیں۔ اس سے طلبا کی قدرتی و منفرد صلاحیتوں کو بروئے کار لانے میں مدد ملے گی جس کے نتیجے میں وہ دفاعی افواج میں اپنا کیریئر بنا سکتے ہیں۔

15. 'سنگل ونڈو سسٹم' کو ہر طرح کے وظائف اور دیگر مواقع اور اسکیموں کے لیے فروغ دیا جائے گا جو کہ سماجی و تعلیمی پسماندہ طبقات کے طلبا کے لیے مربوط طریقے سے دستیاب رہیں گے۔

16. اس پالیسی کی تجویز ہے کہ اسکولی تعلیمی نظام کے تمام رکن بشمول پرنسپل، اساتذہ، طلبا، کونسلر اور منتظمین کو طلبا کی ضروریات، احترام، وقار، افراد کی رازداری، شمولیت اور مساوات کے نظریے سے آگاہی و حساس بنائے۔ شمولیت اور مساوات کی پاسداری اساتذہ کی تعلیم کا ایک اہم پہلو ہوگا، جس کے لیے قیادت، انتظامیہ اور اسکول کے دیگر تمام عہدوں پر فائز اشخاص کو تربیت دی جائے گی۔ طالب علموں کے لیے بہترین رول ماڈل پیش کرنے کے لیے سماجی و تعلیمی پسماندہ طبقات میں سے زیادہ اعلیٰ معیار کے اساتذہ اور رہنما کی تقرری کی کوشش کی جائے گی۔

17. یہ پالیسی اساتذہ، تربیت یافتہ سماجی کارکنوں اور مشیروں کے ذریعے لائے گئے نئے اسکولی ماحول کے حوالے سے طالب علموں کو حساس بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ مزید جامع اسکولی نصاب میں متعلقہ تبدیلیوں کے حوالے سے بھی طالب علموں کو حساس بنانے کی سفارش کرتی ہے۔ اسکول کے نصاب میں انسانی اقدار جیسے مساوات، شمولیت، تمام افراد کا احترام، رواداری، ہمدردی، انسانی حقوق، عدم تشدد، صنفی مساوات اور عالمی شہریت پر مواد شامل کرنے کی سفارش کرتی ہے۔ تنوع کے احترام کے تئیں بچوں کو حساس بنانے کے لیے مختلف زبانوں، ثقافتوں، صنفی شناخت، مذاہب وغیرہ کے علم کی فراہمی کو نصاب میں شامل کرنے کی سفارش کرتی ہے۔

18. NEP2020 (ص 28) نے 5 سے 10 کلومیٹر کے احاطے میں اسکول کمپلیکس/کلسٹرس کے قیام پر زور دیا ہے جس میں ایک گروپنگ ڈھانچہ ہوتا ہے۔ اسکول کمپلیکس میں ایک ثانوی اسکول ہوتا ہے اور ساتھ ہی کم درجوں کی پڑھائی والے دیگر اسکول ہوتے ہیں جن میں آنگن واڑیاں بھی شامل ہیں۔ پالیسی میں اس طرح کے اداروں کے فوائد کے بارے میں تفصیل سے بتایا گیا ہے۔ اسکول کلسٹرس کے قیام سے زیادہ سے زیادہ وسائل کی تقسیم، اساتذہ، طلبا اور انتظامی عملے کی آسانی سے نقل و حرکت، عمارتوں اور دیگر بنیادی ڈھانچے کا زیادہ سے زیادہ استعمال، خیالات کا اشتراک اور دیگر وسائل کے موثر استعمال اور انتظام میں مدد ملے گی۔ مزید یہ پسماندہ علاقے، کم طلبا والے اسکولوں، اساتذہ کی کمی، دور دراز کے مسائل وغیرہ کو حل کرنے، مساوی ثقافت و شمولیت کو فروغ دینے میں مددگار ہوگی۔

ہندوستانی تعلیمی نظام میں مساوات کی راہ میں بڑی رکاوٹیں

تعلیم کو مساوی بنانے کے لیے تجویز کردہ حکمت عملیوں اور ہمارے تعلیمی نظام میں موجود تفاوت اور عدم مساوات کی سطح کے درمیان ایک مماثلت ہے۔ نیتی آیوگ اور یونائیٹڈ نیشن کی مشترکہ شائع شدہ رپورٹ ایس ڈی جی انڈیا انڈیکس اور ڈیش بورڈ (SDG India index & dashboard)، 2020-21 (ص 94) کے مطابق ہندوستان کی مختلف ریاستوں کے لیے ایس ڈی جی انڈیکس اسکور، گول 4 کے تحت کم از کم 29 اور زیادہ سے زیادہ 80 کے درمیان ہے جو تعلیمی رسائی کی مساوات اور دیگر تعلیمی اشاریوں کے لحاظ سے ملک کے اندر وسیع تفاوت کو ظاہر کرتی ہیں۔ ریاستوں اور مرکز کے زیر انتظام علاقوں میں بالترتیب کیرل اور چندی گڑھ بہتر کارکردگی کے ساتھ سب سے اوپر ہیں۔ پانچ ریاستوں اور تین UTs نے فرنٹ رنرز کا مقام حاصل کیا ہے (اسکور 65 اور 99 کے درمیان)۔ نو ریاستیں اور دو UTs کو اسپیرنٹ کٹگری (انڈیکس اسکور 50 سے کم) سے کام چلانا پڑا۔ اس انڈیکس میں درج ذیل انڈیکیٹر (indicators) شامل کیے گئے ہیں: ابتدائی تعلیم میں نیٹ انرولمنٹ کا تناسب (اے این ای آر)، ثانوی سطح پر اوسط سالانہ ڈراپ آؤٹ ریٹ، اعلیٰ ثانوی سطح پر گراس انرولمنٹ تناسب، قومی سطح پر متعین اکتسابی ماحصل کے لحاظ سے کم از کم مہارت کی سطح حاصل کر رہے آٹھویں جماعت کے طلبہ کا فیصد، اعلیٰ تعلیم میں گراس انرولمنٹ تناسب (18-23 سال)۔ ایسے معذور بچوں کا فیصد جنہوں نے کم از کم ثانوی تعلیم (15 سال اور اس سے زیادہ) مکمل کیا ہو، اعلیٰ تعلیم کے لیے (18-23 سال) صنفی برابری انڈیکس (جی پی آئی)، ان افراد کا فیصد جو پڑھے لکھے ہیں (15 سال اور اس سے زیادہ)، بنیادی ڈھانچے تک رسائی والے اسکولوں کا فیصد (بجلی، پینے کا پانی)، ثانوی سطح پر تربیت یافتہ اساتذہ کا فیصد (کلاس 9-10)، ثانوی سطح پر شاگرد اساتذہ کا تناسب (Pupil Teacher Ratio)۔

ڈرافٹ قومی تعلیمی پالیسی (Draft NEP)، 2019، (MHRD 2019 P. 402) کے مطابق سال 2017-18 میں ہندوستان میں تعلیم پر عوامی اخراجات GDP کا 2.7 فیصد تھا۔ یہ بتاتا ہے کہ تعلیم پر عوامی اخراجات 1968 کی پالیسی کی جی ڈی پی کے 6 فیصد کی سفارش تک کبھی نہیں پہنچی۔ 1986 کی پالیسی میں اس کا اعادہ کیا گیا اور 1992 کے ایکشن پروگرام میں اس کی مزید تصدیق کی گئی۔ پچھلے 5 سالوں میں تعلیم پر سالانہ عوامی سرمایہ کاری جی ڈی پی کے 3 فیصد کے آس پاس گھوم رہی ہے۔ جبکہ دنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں یہ شرح بہت زیادہ ہے۔ بھوٹان، زمبابوے اور سویڈن کے لیے 7.5 فیصد، کوسٹاریکا اور فن لینڈ کے لیے 7 فیصد، کرغیزستان، جنوبی افریقہ اور برازیل کے لیے 6 فیصد، برطانیہ، نیدرلینڈ اور فلسطین کے لیے 5.5 اور ملائیشیا، کینیا، منگولیا، کوریا اور امریکہ کے لیے یہ شرح 5 فیصد ہے۔

اختتامی مشاہدات

اس حقیقت سے انکار کرنا ناممکن ہے کہ معاشرے کا ایک بڑا حصہ خاص طور پر سماجی و تعلیمی پسماندہ طبقات جیسے درج فہرست ذات، درج فہرست قبائل اور اقلیتوں کو طویل عرصے سے اسکولنگ اور تعلیم کی حصولیابی میں مختلف قسم کی دشواریاں درپیش رہی ہیں۔ ظاہر ہے کہ NEP2020 ہماری تعلیم کو زیادہ مساوی اور قابل رسائی بنانے کے لیے متعدد حکمت عملیاں اور پالیسی اقدامات کی وکالت کرتا ہے۔ تاہم مقدار، معیار اور محرومی کی سطح کو مدنظر رکھتے ہوئے ایک بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ رکاوٹوں کے تناظر میں یہ انتظام انتہائی خوش آئند ہے لیکن ناکافی ہے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ حکومت ہند تعلیم میں جی ڈی پی کا 6 فیصد سرمایہ کاری کے ہدف کو عملی جامہ پہنائے۔ حکومت کو اسکولنگ اور یونیورسٹی کے نظام کا ایک بھرپور اور مستحکم انفراسٹرکچر تیار کرنا چاہیے، تاکہ تمام ہندوستانی بچوں کو ملک میں کہیں بھی معیاری تعلیم تک رسائی حاصل ہو۔

■

Dr. Bakhteyar Ahmad
Asst Prof, MANUU
College of Teacher Education
Hutton Road, Asansol -713301 (WB)
Mob.: 8292553437
Email: bakhteyarahmad@gmail.com

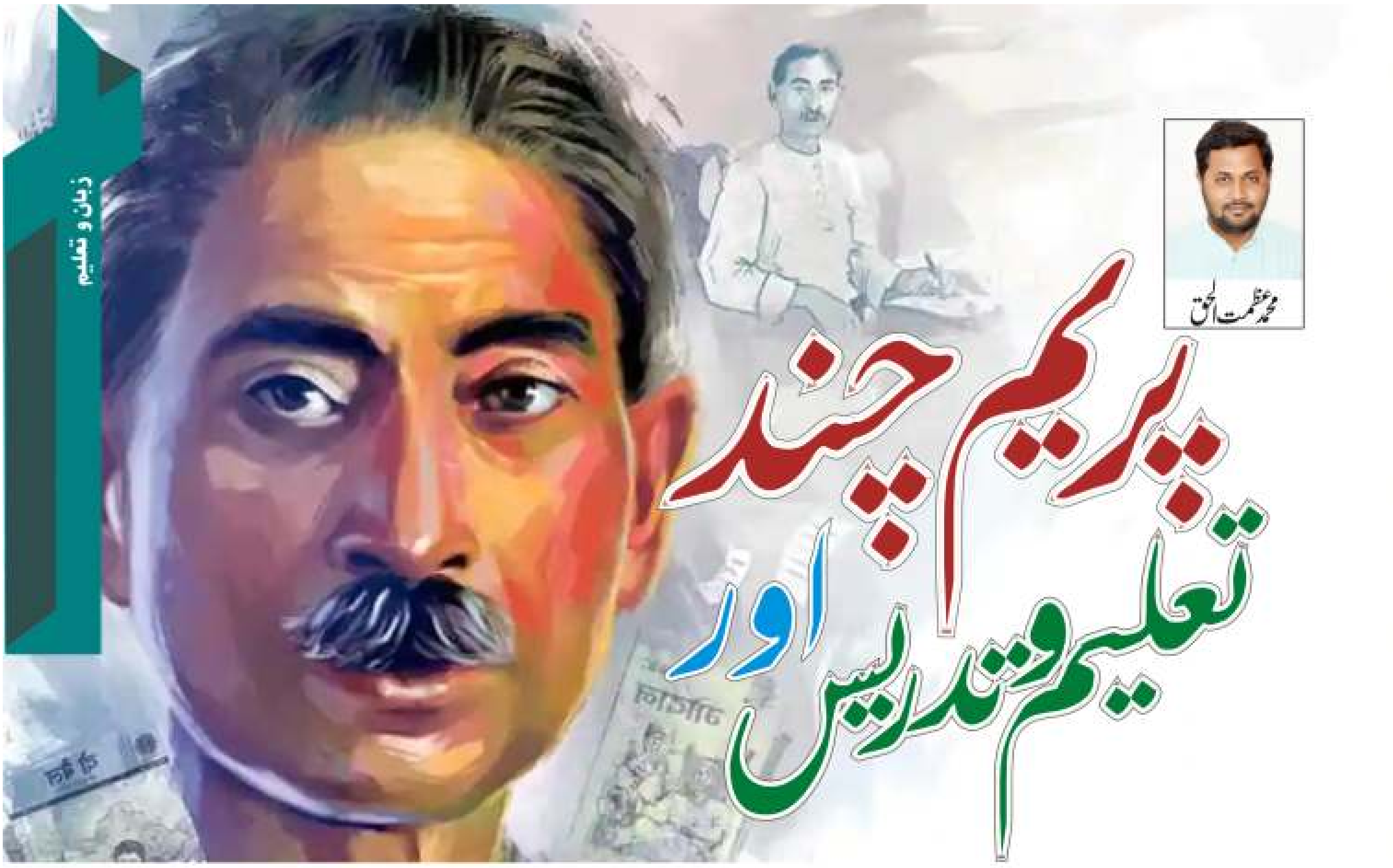

محمد عظمت الحق

پریم چند اور تعلیم و تدریس

پریم چند (31 جولائی 1880–8 اکتوبر 1936) ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ انھیں زندگی کے مختلف شعبوں سے دلچسپی تھی۔ اپنے وقت کے سماجی، سیاسی اور تعلیمی حالات اور اس کے تقاضوں سے وہ بخوبی واقف تھے۔ تعلیم و تدریس، مختلف علوم وفنون اور صنعت وحرفت سے بھی انھیں لگاؤ تھا۔ اس لگاؤ کی وجہ سے پریم چند نے مختلف قدیم وجدید علوم وفنون پر بھی مضامین ومقالات قلمبند کیے ہیں۔ فکشن کے علاوہ انھوں نے مختلف موضوعات پر مضامین بھی لکھے ہیں۔ ان میں تعلیم و تدریس اور نصابِ تعلیم پر لکھے گئے مضامین کے ذریعے وہ ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے بھی سامنے آتے ہیں۔ اس حوالے سے پریم چند پر شاید کچھ نہیں لکھا گیا۔ راقم الحروف نے پریم چند کے ایسے مضامین کی روشنی میں انھیں ایک ماہرِ تعلیم کی حیثیت سے دیکھنے اور دکھانے کی اپنی سی کوشش کی ہے۔

پریم چند بنیادی طور پر ایک مدرس تھے اسی لیے تعلیم وتدریس کے مسائل پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ تعلیم وتدریس اور نصابِ تعلیم کے موضوع پر لکھے گئے ان کے مضامین کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اس بارے میں نہ صرف غور وخوض کیا کرتے تھے بلکہ اس موضوع سے متعلق مسائل کا حل بھی تجویز کیا کرتے تھے۔ پریم چند جدید زرعی تعلیم اور تجربات سے استفادہ کرتے ہوئے ہندوستان کی زرعی پیداوار میں اضافہ کرنے کی طرف اربابِ مجاز کو توجہ دلایا کرتے تھے۔ پریم چند نے تعلیم وتدریس اور نصابِ تعلیم کے موضوع پر اردو اور ہندی میں کچھ مضامین اور اداریے بھی تحریر کیے ہیں۔ ان مضامین میں اردو زبان میں لکھے گئے ان کے تین مضامین بہت اہم ہیں جن کے عنوانات یہ ہیں: ''زراعتی ترقی کیوں کر ہو سکتی ہے''، ''صوبۂ متحدہ میں ابتدائی تعلیم'' اور ''کلا بھون''۔ زیرِ نظر مضمون میں پریم چند کے ان تینوں مضامین کے حوالے سے تعلیم وتدریس کے تئیں ان کی دلچسپی، زراعتی، صنعتی اور تکنیکی تعلیم وتربیت کی طرف ان کی رغبت اور ان کے تعلیمی نظریات پر بساط بھر روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔

زراعتی ترقی کیوں کر ہو سکتی ہے

پریم چند نے یہ مضمون ہندوستان میں زراعت کے مسائل اور اس کے حل کے حوالے سے لکھا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں زراعت کو فروغ دینے کے ممکنہ طریقوں اور امکانات پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ ساری دنیا جانتی ہے کہ ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور آج کی تاریخ میں آبادی کی کثرت کے اعتبار سے یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ آبادی کی کثرت اور اناج کی قلت کے مسئلے پر پچھلے سو ڈیڑھ سو برسوں سے مغربی ملکوں کے دانشور مختلف خطوط پر سوچ رہے ہیں۔ بعض ماہرین کم وقت اور کم زمین پر زیادہ سے زیادہ فصل حاصل کرنے کے عملی تجربے کر رہے ہیں اور اس میں انھیں کامیابی بھی مل رہی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مثبت اور بہتر اقدامات ہیں۔ دوسری طرف 'کچھ دانشور' ایسے بھی گزرے ہیں جو آبادی کو کم کرنے کے نہایت مضحکہ خیز طریقے اپنانے کی سفارشات کیں۔ پریم چند کے اس مضمون سے کچھ ایسے ہی مضحکہ خیز مشوروں اور سفارشات سے واقفیت ہوتی ہے۔ اس بابت پریم چند نے لکھا ہے:

> یورپ میں آبادی کو روکنے کے لیے مالتھس نے یہ تجویز نکالی تھی کہ غربا کو شادی سے محترز ہونا چاہیے۔ ایک دوسرے فرقے کی تجویز یہ تھی کہ صرف انھیں لوگوں کو شادی کرنی چاہیے جو قوی الاعضا اولاد پیدا کر سکیں۔ اور ایک تیسرے فرقۂ علما کا خیال ہے کہ ہمیں اضافۂ نسل کو معاش کے محکوم رکھنا چاہیے۔ لیکن جدید ترین تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ہر ملک کی زمین اس کی بڑھتی ہوئی آبادی کے لیے کافی غلہ پیدا کرنے کی قابلیت رکھتی ہے بشرطیکہ اس کی قوت کو قائم رکھنے اور بڑھانے کی کوشش کی جاتی رہے۔[1]

پریم چند کے اس مضمون سے واضح ہوتا ہے کہ وہ آبادی کو کم کرنے کے نہیں بلکہ اناج کی پیدائش کو بڑھانے کے طریقوں پر عمل کرنے کے قائل تھے۔ ان کا یہ ماننا تھا کہ ہندوستان میں غلے کی پیدائش کو بڑھانے کے طریقوں پر اتنی توجہ نہیں دی گئی جتنی دینی چاہیے تھی۔ اس

سلسلے میں انھوں نے انگلستان، فرانس اور ڈنمارک میں ہونے والی زراعتی اصلاحات کا ذکر کرتے ہوئے بتایا ہے کہ وہاں فی ایکڑ اناج اگانے کی مقدار ہندوستان سے تین چار گنہ زیادہ ہے۔ پریم چند ایسی اصلاح اپنے ملک میں بھی لانے کے خواہش مند تھے۔ مگر اصلاح کیسے لائی جائے؟ ہندوستان اس ضمن میں طرح طرح کے مسائل کا شکار کل بھی تھا اور آج بھی ہے۔ بقول پریم چند جب تک یہ مسائل حل نہیں کیے جاتے زراعتی ترقی ناممکن ہے۔

پریم چند کی نگاہ میں سب سے پہلا مسئلہ یہ تھا (جو آج بھی برقرار ہے) کہ ہندوستان کے بیشتر کاشتکار غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ کاشتکاروں کو محض علمی تحقیقات سے نہ دلچسپی ہوتی ہے اور نہ اس سے انھیں کوئی فائدہ پہنچتا ہے۔ تاوقتیکہ عملی اصلاحیں کاشتکاروں کو نہ بتائی جائیں۔ پریم

> **پریم چند نے نصاب تعلیم میں زراعتی تعلیم کو بھی داخل کرنے کی تجویزپیش کی ہے۔انھوں نے اس کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ اس سے طلبا میں‌اوائل عمر ہی سے زراعت سے دلچسپی بڑھے گی اور وہ آگے چل کر زراعت کے پیشے کو کم نگاہی سے نہ دیکھیں گے۔اس کے علاوہ محنت ومشقت سے جی چرانے کا رجحان بھی کم ہو گا۔پریم چند نے تعلیم یافتہ لوگوں‌کی ملازمت پسندی کوزراعت کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ کہا ہے۔**

چند نے لکھا ہے کہ ہر سال انڈسٹریل کانفرنسیں منعقد ہوتی ہیں لیکن اس کی کوئی خبر کاشتکاروں تک نہیں پہنچتی تھی کیونکہ ساری کارروائی انگریزی میں ہوتی تھی۔ اس سلسلے میں انھوں نے کانفرنسوں کے منتظمین کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ ایسی کانفرنسوں کی روداد کو عام فہم ملکی زبان میں لکھ کر مفت تقسیم کریں۔ بقول پریم چند ایسا کرنے سے کچھ نہ کچھ اثر پڑنے کے امکانات تھے۔

پریم چند نے نصاب تعلیم میں زراعتی تعلیم کو بھی داخل کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ انھوں نے اس کا فائدہ یہ بتایا ہے کہ اس سے طلبا میں اوائل عمر ہی سے زراعت سے دلچسپی بڑھے گی اور وہ آگے چل کر زراعت کے پیشے کو کم نگاہی سے نہ دیکھیں گے۔ اس کے علاوہ محنت ومشقت سے جی چرانے کا رجحان بھی کم ہوگا۔ پریم چند نے تعلیم یافتہ لوگوں کی ملازمت پسندی کو زراعت کی ترقی کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

زراعت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ تعلیم یافتہ فرقے کی ملازمت پسندی ہے۔ یہاں تک کہ بڑے بڑے ذی اقتدار اور صاحب ثروت رؤسا بھی اپنے لڑکوں کو اعلیٰ تعلیم سے آراستہ کر کے انھیں ملازمت کے لیے پیش کر دیتے ہیں۔ اس طرح وہ لوگ جو کاشتکاروں کی حالت میں کچھ اصلاح کرنے کے قابل ہیں، اپنے ایک قومی فرض کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔[2]

یہاں پریم چند نے کاشتکاروں کی اصلاح کو قومی فرض کہا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ زراعت کے میدان میں اصلاح اور کاشتکاروں کی فلاح و بہبودی کو کتنی اہمیت دیتے تھے۔

پریم چند نے ایک تجویز یہ بھی پیش کی تھی کہ دیہاتوں میں تقرر پانے والے مدرسین کو یہ تربیت دی جائے کہ وہ کاشتکاروں کو مصنوعی کھاد اور عمدہ بیجوں کے استعمال کے مشورے دے سکیں۔ کیونکہ اس دور میں یورپ میں مصنوعی کھاد کے استعمال سے فصل کی پیدائش دو چند بلکہ سہ چند ہو چکی تھی۔ جب کہ ہندوستان میں گوبر ہی سے کھاد کا کام لیا جا رہا تھا۔ پریم چند نے حکومت کی توجہ اس طرف بھی مبذول کروائی کہ بڑے بڑے کارخانے شہروں میں قائم کرنے کے بجائے دیہاتوں میں قائم کیے جائیں۔ پریم چند کی نظر میں اس کا فائدہ یہ تھا:

ہمارے کاشتکار فاضل اوقات میں کوئی مفید مشغلہ نہ ہونے کے باعث بیکار بیٹھے رہتے ہیں... ہماری کوشش یہ ہونی چاہیے کہ بجائے بڑے بڑے شہروں میں کارخانے کھولنے کے مواضعات میں صنعت وحرفت کا شغل جاری کریں۔ تاکہ ہمارے کاشتکار خود مختار مالکانِ زمین کی حیثیت سے گر کر محض مزدور نہ ہو جائیں۔ آج کل ملک میں کپڑے کا قحط ہے۔ اس کا باعث بجز اس کے اور کیا ہے کہ ہم کپڑوں کے لیے بڑے بڑے کارخانوں کے محتاج ہیں۔ ہمارے پاس نہ اتنا سرمایہ موجود ہے نہ آسانی سے کلیں دستیاب ہو سکتی ہے۔ لیکن اگر کاشتکاروں میں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کی صنعت زندہ کی جائے تو یہ قحط بڑی حد تک رفع ہو سکتا ہے۔[3]

اس مضمون میں پریم چند نے اس طرح کی کئی تجاویز پیش کی ہیں۔ یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ پریم چند کی ان تجاویز کو حکومت اور قوم کے دانشوران کہاں تک روبہ عمل لا سکے لیکن اتنا ضرور کہا جا سکتا ہے کہ پریم چند ہندوستان کی زراعتی ترقی کے مسئلے پر نہایت متفکر رہا کرتے تھے۔ اس ضمن میں وہ جو کچھ سوچ سکتے تھے انھوں نے سوچا اور جو کچھ تجاویز پیش کر سکتے تھے انھوں نے پورے خلوص کے ساتھ پیش کیں۔ اس مضمون کے مطالعے سے یہ بات اجاگر ہوتی ہے کہ پریم چند صرف ادیب نہیں تھے اور نہ انھوں نے خود کو ادب تک محدود رکھا بلکہ جتنے بھی قومی اور ملکی مسائل ہو سکتے تھے ان پر انھوں نے پورے خلوص کے ساتھ غور وخوض کیا اور مختلف تحریروں کے ذریعے اپنی بات ارباب مجاز اور عوام تک پہنچا دی۔

صوبۂ متحدہ میں ابتدائی تعلیم

پریم چند کی عملی زندگی کا آغاز مدرس کی حیثیت سے ہوا۔ لگ بھگ بائیس برسوں تک انھوں نے معلمی کی خدمت انجام دی۔ اس دوران میں انھیں پرائمری، اپر پرائمری اور ہائی اسکول کی سطح تک تدریس کا تجربہ حاصل ہو چکا تھا۔ ان کی ملازمت زیادہ تر دیہاتوں میں رہی۔ اسی لیے وہ پرائمری تعلیم کے مسائل اور اس کے نصاب سے اچھی طرح واقف تھے۔ چوں کہ ان کی ملازمت زیادہ تر دیہاتوں میں رہی اس لیے وہ دیہاتوں میں تعلیم کے مسائل اور اس کی دقتوں سے بھی بخوبی آگاہ تھے۔ دوسری اہم بات یہ بھی ہے کہ وہ برائے نام مدرس نہیں تھے بلکہ ان کے دل میں تعلیم کو عام کرنے کے تئیں پُر خلوص جذبہ بھی تھا۔ اسی لیے وہ تعلیم سے جڑے ہوئے مسائل پر غور کیا کرتے تھے اور اس میں اصلاح لانے کے طریقے سوچا کرتے تھے۔

زیر تبصرہ مضمون پریم چند کے اسی جذبے کی عکاسی کرتا ہے۔ آزادی سے قبل آگرہ اور اودھ کو 'صوبۂ متحدہ' کہا جاتا تھا۔ غالباً ان دونوں صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنایا گیا تھا۔ اس مضمون میں پریم چند نے اسی صوبے کی ابتدائی تعلیم کی صورتِ حال کا جائزہ لیا ہے۔

ہندوستان میں پرائمری تعلیم کی جو صورتِ حال تھی اور جو اس کا انفرا اسٹرکچر تھا، اس سے پریم چند بہت دلبرداشتہ اور مایوس تھے۔ پریم چند نے سینٹ نہال سنگھ کے ایک مضمون کو پڑھ کر (جو امریکا کے ایک موضع میں تعلیم کے انتظام سے متعلق تھا) جن احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے ان کی مایوسی اور دلبرداشتگی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

دسمبر کے ماڈرن ریویو میں سینٹ نہال سنگھ نے ایک نادر مضمون لکھا ہے۔ جس میں امریکا کے ایک موضع کی کیفیت بیان کی ہے۔ اسے پڑھ کر حیرت بھی ہوتی ہے اور مایوسی بھی۔ حیرت اس لیے کہ تہذیب کی جو آسانیاں

اور اسباب اس گاؤں میں ہیں وہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں کو نصیب نہیں۔ اور مایوسی اس لیے کہ شاید ہندوستان کی قسمت میں ترقی لکھی ہی نہیں۔ دو ہزار آدمی کا موضع اور ہائی اسکول، اس کی عمارت، اس کے کتب خانے، اس کی لیبوریٹری پر ہندوستان کا کوئی کالج ناز کرسکتا ہے۔ کیا ہندوستان کے بھی کبھی ایسے نصیب ہوں گے۔[4]

پریم چند نے امریکا کے دیہات کے اس مدرسے کا موازنہ ہندوستان کے مدارس سے کرتے ہوئے افسوس کے ساتھ لکھا ہے کہ:

اب ایک طرف تو اس دیہاتی مدرسے کو رکھیے، اور دوسری طرف ایک ہندوستانی دیہاتی مدرسے کا خیال کیجیے۔ ایک درخت کے نیچے جس کے ادھر ادھر کوڑا کرکٹ پڑا ہوا ہے، اور جہاں شاید برسوں سے جھاڑو نہیں دی گئی، ایک پھٹے پرانے ٹاٹ پر بیس پچیس بچے بیٹھے اونگھ رہے ہیں۔ سامنے ٹوٹی ہوئی کرسی اور ایک پرانی میز ہے اس پر حضرت مدرس کی ذات متمکن ہے۔ لڑکے جھوم جھوم کر پہاڑے رٹ رہے ہیں، شاید کسی کے بدن پر ثابت کرتہ نہ ہوگا۔ دھوتی ران کے اوپر تک بندھی ہوئی۔ ٹوپی میلی کچیلی، صورت گرسنہ، چہرے پژمردہ، یہ آریہ ورت کا مدرسہ ہے جہاں کسی زمانے میں تکس شلا اور ندیا [کذا، نالندہ] کے دارالعلوم تھے۔ کس قدر تفاوت ہے، ہم تہذیب کی دوڑ میں دیگر اقوام سے کس قدر پیچھے ہیں کہ شاید وہاں تک پہنچنے کا حوصلہ بھی نہیں کرسکتے۔[5]

ہندوستان میں پرائمری تعلیم کی یہ صورت حال پریم چند کو افسردہ کردیتی تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ہندوستان کے مدارس میں بھی معیاری تعلیم کا انتظام ہو۔ یہاں کے نظامِ تعلیم اور نصابِ تعلیم میں وہ بہت زیادہ اصلاحات کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ قابل مدرّسوں کی کمی اور اسکول کی عمارتوں کے فقدان کو پریم چند اس اصلاح کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ سمجھتے تھے۔ حکومت چار چار درجوں پر صرف ایک مدرس کا تقرر کرتی تھی، اور ان کا مشاہرہ تھا چار تا پانچ روپے۔ پھر اس غریب مدرس پر ڈاک خانے کے کام کا اضافی بوجھ بھی لاد دیا گیا تھا۔ گویا وہ ٹیچر بھی تھا، گاؤں کا پوسٹ ماسٹر اور ڈاکیہ بھی تھا۔

اس مضمون کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانے میں دیہات کے مدرسوں کو ڈاک خانے کے کام کی زائد ذمے داری بھی دی جاتی تھی۔ گو اس کام کی وجہ سے انھیں خفیف سی آمدنی ہوتی تھی لیکن تعلیم و تدریس پر اس کا منفی اثر پڑتا تھا۔ مدرس تعلیم و تدریس پر خاطر خواہ توجہ نہیں دے پاتا تھا۔ پہلے ہی چار چار درجوں کے بچوں کی تعلیم اور ان کی نگرانی پھر ڈاک خانے کا کام۔ یہ تو یک نہ شد دو شد والا معاملہ تھا۔

پریم چند اس نظام میں تبدیلی اور اصلاح چاہتے تھے۔ انھوں نے اس مضمون میں مدرس کی تنخواہ کم سے کم پندرہ روپے ماہانہ کی سفارش کی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے ٹریننگ کالج سے تعلیم و تدریس کی ٹریننگ پانے والے اساتذہ کے تقرر پر بھی زور دیا ہے۔ عام طور پر غیر تربیت یافتہ اساتذہ کی تدریس موثر نہیں ہوتی۔ کیوں کہ وہ تعلیم و تدریس کے سائنٹی فک اصولوں سے واقف نہیں ہوتے۔

پریم چند نے نصابِ تعلیم کی اصلاح کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہا ہے کہ پرائمری تعلیم کا نصاب ایسا ہونا چاہیے کہ چار برس تک پڑھنے کے بعد بچے اپنی روزمرہ کی ضروریات کی حد تک تعلیم یافتہ ہوجائیں۔ اپر پرائمری کے نصاب کے تعلق سے پریم چند نے لکھا ہے کہ:

ہمارا خیال ہے کہ اپر پرائمری درجے کی تعلیم اگر وہ ذرا اور وسیع کر دی جائے تو کاشت کاروں کی ضروریات کے لیے کافی ہے۔ ریڈریں جو اس وقت مروج ہیں زبان کے لحاظ سے ناکارہ ہیں۔ ان کے پڑھنے سے لڑکے بجز بول چال کے نہ ہندی زبان جانتے ہیں اور نہ اردو، ان کی زبان کی اصلاح ہونی چاہیے تا کہ لڑکے رامائن تو سمجھ لیں۔ قاعدے کی ضرورت نہیں اسے خارج کردینا چاہیے۔ جغرافیہ کی تعلیم کافی ہے۔ حساب میں بھی کچھ کسر نہیں، عملی سوالات کی مشق زیادہ ہونی چاہیے۔ ڈرائنگ فضول ہے، اس کے بجائے تندرستی کے متعلق ایک چھوٹی سی پرائمری ہونی چاہیے اور قواعد زبان کی جگہ زراعت کے کچھ اصول سکھائے جانے چاہئیں۔ اس وقت خط و کتابت کا طریقہ نہیں سکھایا جاتا یہ اک بہت ضروری شے ہے۔ اس کا بھی کچھ انتظام ہونا چاہیے۔ اور تب ابتدائی تعلیم کا مسئلہ گویا حل ہوجائے گا۔[6]

بقول پریم چند عموماً دیہاتوں میں مدرسے کی کوئی عمارت نہیں ہوتی تھی۔ بیشتر دیہاتوں میں کسی درخت کے نیچے یا کسی زمین دار کے گھر کے سامنے جھونپڑے میں یا گوشالہ کے اندر کسی کونے میں بچوں کو پڑھایا جاتا تھا۔ اگر کہیں کوئی عمارت ہوتی بھی تو اس قدر خستہ اور بوسیدہ کہ خدا کی پناہ۔ ایسے ماحول میں کیسے تعلیم دی جاسکتی تھی؟ چنانچہ پریم چند نے مدرسوں کے لیے ڈھنگ کی عمارتوں کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ حکومت سے کہا ہے کہ وہ مدارس کے معائنے (انسپکشن) کی مد میں جتنی رقم خرچ کرتی ہے اس میں سے کچھ کم کرکے انفرا اسٹرکچر میں لگا دے تو یہ زیادہ بہتر ہوگا۔

ابتدائی تعلیم، اس کی اصلاح اور ترقی کے باب میں پریم چند کے یہ خیالات یقیناً قابل قدر اور قابل غور ہیں۔ پریم چند نے یہ مضمون 1909 میں لکھا تھا جب کہ انھیں تعلیم و تدریس کے میدان میں آئے ہوئے تقریباً بیس برس ہوچکے تھے۔ ان بیس برسوں کے دوران میں وہ جن تجربات اور مشاہدات سے گزرے اور جن مسائل و مشکلات کا انھیں سامنا کرنا پڑا ان کی روشنی میں پریم چند نے یہ مضمون سپرد قلم کیا ہے۔ پرائمری تعلیم کے مسئلے اور اس کی اصلاح پر پریم چند نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے موجودہ زمانے میں بھی ان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔

دراصل پریم چند کو تعلیم و تدریس کے موضوع سے بڑی دلچسپی تھی۔ وہ جتنی دلچسپی سے ادبی اور علمی کتابوں کا مطالعہ کیا کرتے تھے اتنی ہی رغبت سے تعلیم و تربیت سے متعلق کتابوں کو بھی پڑھا کرتے تھے۔ تعلیم و تربیت سے متعلق کتابوں کی اشاعت پر وہ بڑی مسرت کا اظہار بھی کرتے تھے اور ایسی کتابوں کے مصنفین کا حوصلہ بھی

ہمارا خیال ہے کہ اپر پرائمری درجے کی تعلیم اگر وہ ذرا اور وسیع کر دی جائے تو کاشت کاروں کی ضروریات کے لیے کافی ہے۔ ریڈریں جو اس وقت مروج ہیں زبان کے لحاظ سے ناکارہ ہیں۔ ان کے پڑھنے سے لڑکے بجز بول چال کے نہ ہندی زبان جانتے ہیں اور نہ اردو۔ ان کی زبان کی اصلاح ہونی چاہیے تا کہ لڑکے رامائن تو سمجھ لیں۔ قاعدے کی ضرورت نہیں اسے خارج کر دینا چاہیے۔ جغرافیہ کی تعلیم کافی ہے۔ حساب میں بھی کچھ کسر نہیں۔ عملی سوالات کی مشق زیادہ ہونی چاہیے۔ ڈرائنگ فضول ہے۔ اس کے بجائے تندرستی کے متعلق ایک چھوٹی سی پرائمری ہونی چاہیے اور قواعد زبان کی جگہ زراعت کے کچھ اصول سکھائے جانے چاہئیں۔

بڑھاتے تھے۔ تعلیم و تربیت کے موضوعات پر لکھی گئیں کتابوں پر پریم چند نے جو تبصرے اور تنقیدی مضامین تحریر کیے ہیں ان کے مطالعے سے بھی اس موضوع سے ان کی گہری وابستگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ لالہ گوکل چند کی تصنیف 'بچوں کی تربیت' پر تحریر کردہ تبصرے کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں جس سے راقم الحروف کے دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ پریم چند نے لکھا ہے:

ہمارے یہاں ہر شخص اپنے لڑکے کو یونیورسٹی تعلیم دلوانا چاہتا ہے۔ اس کی قدرتی مناسبت کے تحقیق کرنے کی ذرا بھی کوشش نہیں کی جاتی۔ جس کا نتیجہ مضر یہ ہے کہ بہت سے لڑکے جو دوسرے صیغۂ تعلیم میں ترقی کرتے وہ اپنی طبیعت کے خلاف کتابیں رٹنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ رجحانات طبعی کا اندازہ کیوں کر کیا جائے۔ بچپن میں قوی بہت ضعیف ہوتے ہیں اور کسی خاص میلان کا اظہار نہیں ہوتا۔ لہٰذا 13 برس کے سن تک لازم ہے کہ بچے کو اسکول کی معمولی تعلیم دی جائے۔ اس کے بعد جس کی طرف توجہ دیکھیں اسی ڈھرے پر لگا دیں۔ اگر مصنف نے چند لفظوں میں کنڈر گارٹن طریقۂ تعلیم کا تذکرہ دیا ہوتا تو کتاب اور بھی مفید ہو جاتی۔ قدیم اسپارٹا یا قدیم ہندوستان کے طرز تربیت کا تذکرہ کرنے سے جواب بالکل متروک اور گئی گزری باتیں ہوگئیں ہیں کنڈر گارٹن کا تذکرہ بدرجہا زیادہ فائدہ بخش ہوتا۔[7]

المختصر پریم چند کا یہ مضمون ابتدائی تعلیم کے مسائل، حل اور اصلاحات پر ان کی گہری فکر مندی کا مظہر ہے۔ اس مضمون میں بھی پریم چند نے ابتدائی تعلیم کے نصاب میں زراعتی تعلیم کی بنیادی باتیں شامل کرنے کی بات کی ہے تاکہ آگے کاشتکاروں کو اس سے فائدہ پہنچے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ہمیشہ اور ہر معاملے میں قومی اور ملکی مفاد پریم چند کے پیش نظر رہا کرتا تھا۔

کلا بھون

'کلا بھون' کے نام سے بڑودہ ریاست کے مہاراجہ نے ایک نہایت معیاری اور عصری تقاضوں کی تکمیل کرنے والا صنعتی کالج (انڈسٹریل کالج) قائم کیا تھا جو آج بھی برقرار ہے اور غالباً یونیورسٹی میں تبدیل ہو گیا ہے۔ یہ مضمون اسی کالج کے تعارف اور اس کے معیار تعلیم کے تذکرے پر مشتمل ہے۔ پریم چند نے اس کالج کے قائم کرنے پر بڑودہ ریاست کے مہاراجہ کی بڑی تحسین وستائش کی ہے اور ان کے اس اقدام کو دوسری ریاستوں کے لیے قابل تقلید کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

ریاستِ بڑودہ نے صرف عام تعلیم اور معاشرتی مسائل ہی میں حیرت انگیز ترقی نہیں کی ہے بلکہ صنعتی معاملات میں بھی وہاں پوری توجہ صرف کی گئی ہے۔ اور اس عقدہ کا حل کرنے میں اس دور بینی سے کام لیا گیا ہے جو ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے لیے قابل تقلید ہے۔ مہاراجہ صاحب بڑودہ پختہ کار مدبر اور منتظم شخص سے یہ امر کیسے مخفی رہ سکتا ہے کہ کسی قوم کی ترقی کا سب سے بڑا ذریعہ صنعت وحرفت ہے۔ کلا بھون جو بڑودہ کا خاص صنعتی کالج ہے.... کیا بہ لحاظ معیار تعلیم اور کیا بہ لحاظ طلبا یہ کالج سب ہندوستانی ریاستوں کے کالجوں میں ممتاز ہے۔[8]

اس اقتباس میں پریم چند نے جس مسرت آمیز اسلوب میں اپنے احساسات کا اظہار کیا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ پریم چند کو ریاستِ بڑودہ کے مہاراجہ کے اس اقدام سے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ یہ خوشی اور مسرت پریم چند کے اس میلان و رغبت کو بھی ظاہر کرتی ہے جو انھیں تعلیم و تدریس کے موضوع سے تھی۔ دراصل پریم چند ہندوستان کو تعلیم اور ہنر کے میدان میں خود مکتفی دیکھنا چاہتے تھے، یہی نہیں بلکہ وہ اپنے ملک کو معیار تعلیم کی بلندی پر پہنچتا دیکھنے کی خواہش بھی رکھتے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ صنعتی کالجوں کے قیام کے بغیر صنعت وحرفت کو فروغ نہیں مل سکتا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ یوروپی ممالک کی طاقت اور ترقی کا راز صنعتی ترقی میں پوشیدہ ہے۔

پریم چند نے اس مضمون میں کالج میں چلنے والے کورسس، داخلے کا طریقۂ کار، فیس، امتحانات کا طریقہ، مصارف تعلیم، وظائف کی سہولت، نظریاتی تعلیم اور عملی تربیت کے معیار، لیبوریٹری اور اس میں استعمال ہونے والے آلات وغیرہ پر گفتگو کی ہے۔ پریم چند کے کہنے کے مطابق اس کالج میں زیر تعلیم طالب علم کے ماہانہ مصارف صرف سولہ روپے ہوتے تھے جب کہ اس طرز کے دوسرے کالجوں میں چالیس روپے خرچ آتا تھا۔

پریم چند نے لکھا ہے کہ ہمارے ملک کو تحقیقاتی کالجوں کی اتنی ضرورت نہیں ہے جتنی مفید عام صنعتی کالجوں کی ہے۔ اسی لیے انھوں نے انگریزی حکومت اور دیسی ریاستوں کے حکمرانوں سے اس طرز کے زیادہ سے زیادہ کالج کھولنے کی طرف توجہ دلائی ہے۔ آخر میں صوبۂ متحدہ (آگرہ اور اودھ) کے خواہش مند طلبا سے کہا ہے کہ اس کالج میں زیادہ سے زیادہ طلبا داخلہ لے کر اس سے فیض یاب ہوں۔ کیوں کہ یہاں ماہانہ صرف سولہ روپیوں کے مصارف سے تین سالہ کوئی کورس کر کے طلبا اچھے سے اچھا روزگار حاصل کر سکتے ہیں۔

تعلیم و تدریس اور نصاب تعلیم سے متعلق ان مضامین کے مطالعے سے اس بات کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ پریم چند کو ان موضوعات سے گہری دلچسپی اور ذہنی مناسبت تھی۔ ان موضوعات و مسائل پر وہ غور وفکر کرتے تھے۔ جہاں جو بات قابل ستائش ہوتی اس کی تعریف و تحسین کرتے اور جہاں جو بات قابل گرفت ہوتی بے باکی کے ساتھ اس کی مذمت بھی کرتے تھے۔ وہ ہر معاملے میں قومی اور ملکی مفاد کو پیش نظر رکھتے تھے۔

''زراعتی ترقی کیوں کر ہو سکتی ہے'' ایسا مضمون ہے جس میں انھوں نے زراعتی علم و تحقیق کے شعبے میں ہندوستان کی پسماندگی پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس شعبے میں ہونے والی سائنسی تحقیقات سے ہندوستانی کاشتکاروں کو اچھی طرح واقف کروانے کا بھاؤ بھی دیا ہے۔ اس کے علاوہ اس راستے میں جو رکاوٹیں پیش آتی تھیں ان کی طرف اشارے بھی کیے ہیں اور انھیں کس طرح دور کیا جاسکتا ہے اس کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ ''صوبۂ متحدہ میں ابتدائی تعلیم'' کے مطالعے سے تعلیم و تدریس کے موضوع سے ان کی فطری رغبت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے ایک ماہر تعلیم کی طرح ابتدائی تعلیم کے مسائل اور اس کی اہمیت وافادیت پر نتیجہ خیز گفتگو کی ہے۔ مضمون 'کلا بھون' تکنیکی اور صنعتی تعلیم کے موضوع سے پریم چند کی رغبت کو ظاہر کرتا ہے۔

حوالے

1 زراعتی ترقی کیوں کر ہو سکتی ہے مشمولہ کلیات پریم چند مرتب مدن گوپال (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، 2003) جلد 21 ص 58

2 ایضاً ص 60

3 ایضاً ص 61

4 صوبۂ متحدہ میں ابتدائی تعلیم مشمولہ کلیات پریم چند مرتب مدن گوپال (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، 2003) جلد 20 ص 252

5 ایضاً ص 252

6 ایضاً ص 257

7 حال کی بعض کتابیں مشمولہ کلیات پریم چند مرتب مدن گوپال (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، 2003) جلد 20 ص 133

8 کلا بھون مشمولہ کلیات پریم چند مرتب مدن گوپال (قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان دہلی، 2003) جلد 20 ص 375

■

Dr. Mohammed Azmat ul Haq
Asst. Professor, Dept. of Urdu,
Degloor College, DEGLOOR-431717
Dist Nanded (M.S)
Mob:7020407042

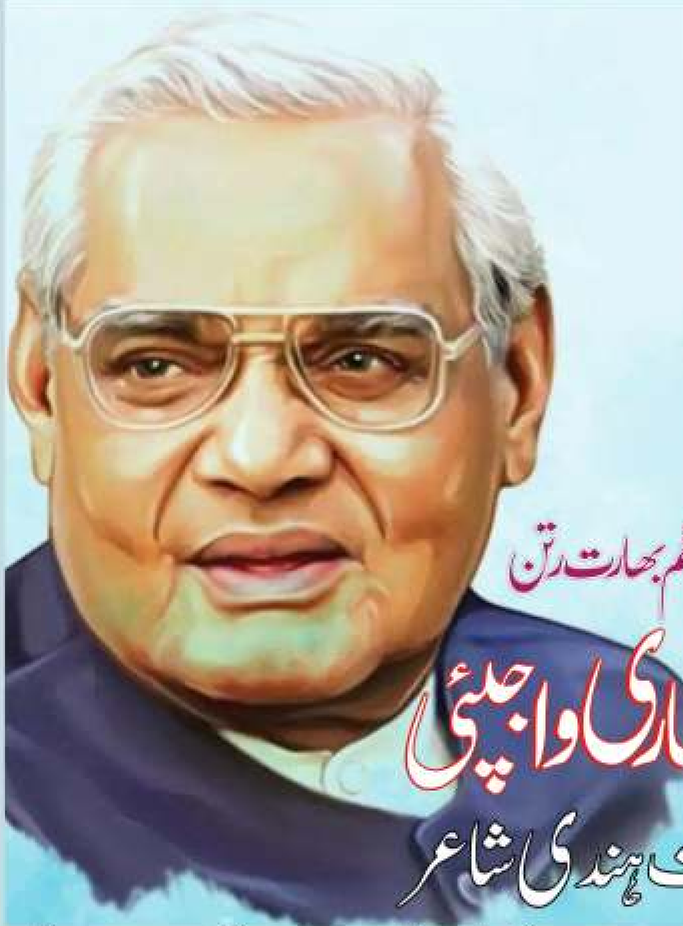

پی پی سریواستو رند

سابق وزیر اعظم بھارت رتن

اٹل بہاری واجپئی

بہ حیثیت ہندی شاعر

سیاست اور شاعری دونوں کا میدان عمل مختلف ہے۔ سیاست مخصوص نظریہ فکر، خواہ وہ سماجی ہو یا اقتصادی، کی پیروی ہے۔ اس کے علاوہ سیاست کا میدان نفسانفسی کا میدان ہے جبکہ شاعری کا کام دلوں کو جوڑنے کا ہے۔ سیاسی شخص شاعر بھی ہوسکتا ہے۔ ایسے حالات میں اس کا مزاج اس کی سوچ، اس کا شعور اس کے کلام پر اکثر اثر انداز ہوتا ہے، بلکہ اس کے قلم پر بھی حاوی ہوجاتا ہے۔ قومیت، سماجی مقصدیت کے ساتھ وہ سچائیوں کے اظہار کو اپنی ذمے داری بھی سمجھتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ وہ اپنی شناخت شاعر کی حیثیت سے بھی کروانا چاہتا ہے۔ وہ سماج کے ناسوروں کی نشاندہی کرتے ہوئے واقعاتی سطح پر معلومات میں اضافہ کرتا ہے۔ موضوع کی یکسانیت یا مغائرت سے بھی اپنی شناخت بناتا ہے۔ مخصوص سیاسی، معاشرتی صورت حال بھی اس کے نوک قلم پہ آجاتی ہے۔ اٹل بہاری واجپئی کی نثری اور آزاد نظموں میں قومی یک جہتی اور حب الوطنی کے ساتھ دل کی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے۔ ان کے پاس نہ الفاظ کی کمی ہے، نہ موضوعات کی۔ ان کی کویتاؤں میں جدت ہے، روانی ہے، نئے اور تازہ مضامین ہیں۔ اٹل جی چونکہ ایک سرگرم سیاسی رہنما تھے، اس لیے ان کے پاس وقت کی کمی تھی، پھر بھی ان کے اندر کا شاعر کروٹیں بدلتا تھا۔ ان کی کویتاؤں میں باریک بینی اور سماجی شعور نمایاں ہیں۔ تہذیب اور معاشرہ دونوں یک جان و قالب نظر آتے ہیں۔ ادب میں نظم کی وہی اہمیت ہے جو زندگی میں ہے۔ ادب فکر و فن دونوں کا مجموعہ ہے۔ مشہور مفکر اور شاعر رابندر ناتھ ٹیگور نے ایک جگہ لکھا ہے:

''سماج سے الگ رہ کر ادیب بنی نوع انسان سے آشنا نہیں ہوسکتا۔ بہت سے لوگوں سے مل کر جو تجربہ حاصل ہوتا ہے، اس سے الگ رہ کر ادیب کئی مقامات پر اہم نکات سے محروم رہ جاتا ہے۔ اگر آپ کا ہاتھ سماج کی نبض پر ہے اور آپ اس کی دھڑکن سُن سکتے ہیں تو حق کی تلاش کریں اور اپنے حصار سے باہر نکلنے کی کوشش کریں، پھر دیکھیں کہ روشنی کتنی سیانی ہے اور لطیف ہے۔''

ہر فرد کا انفرادی اور تجرباتی سفر اس کے فن کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ یہ سفر سماج سے باہر رہ کر نہیں کیا جاسکتا۔ سماجی تجربات کی سوچ ہی حروف اور الفاظ بن کر بیان کی صورت اختیار کرتے ہیں اور اپنی مخصوص آواز کے ساتھ تمثیلات اور محاکات میں تبدیل ہوجاتے ہیں۔ سیاست اور شاعری کا امتزاج بھی بہت حد تک ادراک کی منزل متعین کرتا ہے۔

آج میرے سامنے اٹل بہاری واجپئی کی کچھ نثری اور آزاد نظمیں ہیں۔ ان نظموں کے آئینے میں اٹل جی کی شخصیت اور مزاج کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ اٹل جی بہت مصروف سیاست داں تھے۔ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ سیاست، ملک اور قوم کے لیے وقف تھا پھر بھی ان کے اندر کا شاعر انہیں کچھ نہ کچھ لکھنے پر مجبور کردیتا تھا۔

آؤ مل کر دیپ جلائیں
بھری دوپہری میں اندھیارا
سورج پرچھائیں سے ہارا
انترتم کا نیہہ نچوڑیں
بجھی ہوئی باتی سلگائیں
آؤ مل کر دیپ جلائیں
ہم پڑاؤ کو سمجھیں منزل
لکش ہوا آنکھوں سے اوجھل
ورت مان کے موہ کال میں
آنے والا کل نہ بھلائیں
آؤ مل کر دیپ جلائیں
آہوتیہ باتی یگیہ اُدھورا
اپنوں کے وگھنوں نے گھیرا
انتم جئے کا وجر بنائیں
نودھیچ ہڈیاں گلائیں
آؤ مل کر دیپ جلائیں

ایمرجنسی کے دوران اٹل جی کو کئی بار جیل جانا پڑا مگر ایک بار وہ شدید طور پر بیمار ہوگئے کہ ان کو موت سامنے نظر آنے لگی۔ بے خوابی، الجھن اور ذہنی تناؤ ان کو از حد پریشان کررہا تھا کہ انھوں نے یہ نظم کہی۔

ٹھن گئی موت سے ٹھن گئی
ٹھن گئی موت سے ٹھن گئی
جوجھنے کا میرا ارادہ نہ تھا
موڑ پر ملیں گے یہ وعدہ نہ تھا
راستہ روک کر وہ کھڑی ہوگئی
یوں لگا زندگی سے بڑی ہوگئی
موت کی عمر ہی کیا، دو پل بھی نہیں
زندگی مسلہ آج کل کا نہیں
میں جی بھر جیا، میں من سے مروں
لوٹ کر آؤں گا، کوچ سے کیوں ڈروں
ٹھن گئی موت سے ٹھن گئی
ٹھن گئی موت سے ٹھن گئی

اٹل جی کی شاعری میں احساس جنم لیتا ہے۔ یہ احساس مقناطیسی ہے جس میں ان کے دل کی دھڑکنیں نمایاں ہیں۔ اٹل جی موت سے کبھی خوف زدہ نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے موت کو ہمیشہ للکارا۔

اے موت/تو دبے پاؤں چپکے سے
آنے کی مت سوچ/سامنے آکر وار کر
اور پھر مجھے آزما

اٹل جی کی نثری نظموں میں ان کی شخصیت جھلکتی ہے اور

احساس کی شدت نمایاں طور پر نظر آتی ہے۔ اٹل جی کی نظموں میں سادگی، موضوع سخن، شعور واحساس کا اضطراب قاری کو متاثر کرتا ہے۔ وہ ہنگامی شاعری سے پہلوتہی کرتے ہیں۔ ہمیشہ اپنی بات سادگی اور سلیقے سے کہتے ہیں جس میں خلوص، صداقت اور حوصلہ شامل ہوتا ہے۔

ہار نہیں مانوں گا/ رار نہیں ٹھانوں گا
کال کے کپال پر/ لکھتا اور مٹاتا ہوں
گیت نئے گاتا ہوں

دھرتی بونوں کی نہیں ہے
اونچے قد انسانوں کی ضرورت ہے
اتنے اونچے کہ آسمان چھولیں
نئے نکشتروں میں
پرتبھا کے بیج بولیں
اتنے اونچے بھی نہیں
کہ پاؤں تلے دُوب ہی نہ جمے
کوئی کانٹا نہ چبھے
کوئی کلی نہ کھلے
میرے پربھو! مجھے اتنی اونچائی نہ دینا
کبھی مت دینا
کہ غیروں کو گلے نہ لگا سکوں
اتنی رکھائی نہ دینا

اٹل جی کی آزاد اور نثری نظمیں آج کے دور سے مختلف ہیں۔ ان کی نظموں میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی۔ زندگی کی دھوپ بھی ہے اور احساسات کے پھول بھی۔ ان کا اسلوب، چاندنی پر ہری گھاس پر اوس کی بوند ہے جس میں دردمندی، کسک اور ملال پوشیدہ ہیں۔

ان کی کویتاؤں میں سبک چاندی ہے جیسے ہری ہری گھاس پر اوس کی بوندیں ہوں۔ ان کی شدت احساس ہی قاری کو متاثر کرتا ہے۔

ہری ہری دوب پر اوس کی بوند
ابھی تھی ابھی نہیں ہے
ایسی خوشیاں جو ہمیشہ ہمارا ساتھ دیں
کبھی نہیں تھیں، کہیں نہیں ہیں

سُوریہ ایک ستیہ ہے
جسے جھٹلایا نہیں جاسکتا
مگر اوس بھی ایک سچائی ہے
مگر یہ بات الگ ہے/ اور چھنک ہے
سوریہ تو پھر بھی اگلے گا
دھوپ تو پھر بھی کھلے گی
ہری ہری دوب پر اوس کی بند
ہر موسم میں نہیں کھلے گی

خون کیا سپید ہوگیا
بھید میں ابھید ہوگیا
بٹ گئے شہید/ گیت کٹ گئے
کلیجے میں کٹار گڑگئی
دودھ میں دار پڑگئی
کھیت میں بارودی گندھ
ٹوٹ گئے نانک کے چھند
ستلج سہم اٹھی/ بسنت کی بہار جھڑگئی
دودھ میں درار پڑگئی

آج کی دنیا افراط وتفریط میں گھری ہوئی ہے۔ قومی یکجہتی، بھائی چارہ، مذہب کا احترام اور تہذیبی قدریں کہیں کھوگئی ہیں۔ بے راہ روی ہر طرف حکمراں ہے۔ ایسے عالم میں اٹل جی کا دل بھی سہم اٹھا۔ ان کی ایک نظم ہے۔ آپ بھی دیکھیں۔

بھارت ایک زمین کا ٹکڑا نہیں ہے
جیتا جاگتا، راشٹر پُرش ہے
ہمالہ مستک ہے/ کشمیر کریٹ ہے
پنجاب اور بنگال دو وشال کاندھے ہیں
کنیا کماری اس کے چرن ہیں
ساگر اس کے پگ پکھارتا ہے
ابھینندن کی بھوم ہے
اس کا کنکر شنکر ہے
ہم جئیں گے تو اس کے لیے
اور مریں گے تو اس کے لیے
اونچے پہاڑ پر/ پیڑ نہیں لگتے
پودے نہیں اُگتے نہ گھاس ہی جمتی ہے
جمتی ہے صرف برف/ جو کفن کی طرح سپید ہے
اور موت کی طرح ٹھنڈی......
کھیلتی کھلکھلاتی ندی
جس کا روپ دھارن کر/ اپنے بھاگیہ پر
بوند بوند روتی ہے
ایسی اونچائی/ جس کا پرس
پانی کو پتھر کردے/ ایسی اونچائی
وکاس ہین بھاؤ بھردے
کتنو کوئی گوریا
وہاں نیڑ نہیں بنا سکتی
نہ کوئی تھکا ماندہ بٹوہی
اس کی چھاؤں میں پل بھر
پلک ہی جھپکا سکتا ہے
سچائی یہ ہے کہ کیول
اونچائی ہی کافی نہیں ہوتی
اونچائی اور گہرائی میں
آکاش، پاتال کی دُوری ہے

قدآور شاعر کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے عہد اور معاشرے کے تناظر میں معنویت کو اہم سمجھتا ہے اور اپنی فکر اور احساسات کو عوام کے روبہ رو کرتا ہے جس میں انسان دوستی اور اخوت بھی ہوتی ہے۔ وہ نامساعد حالات میں حوصلہ مندی کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

بادھائیں آتی ہیں آئیں
گھریں پرلے کی گھور گھٹائیں
پاؤں کے نیچے انگارے
سر پر برسیں یدی جوالائیں
نج ہاتھوں میں ہنستے ہنستے
آگ لگا کر جلنا ہوگا
قدم ملا کر چلنا ہوگا

اٹل جی کی عام نظمیں سیاسی ہیں۔ کشمیر، پڑوسی ملک، پاکستان، وکاس، خارجہ پالیسی، ایمرجنسی، فیصلے کا دن اور دیگر سیاسی مضامین پر ان کی بہت ساری نظمیں ہیں مگر میں نے اس مضمون میں اٹل جی کے اندر مچلتا شاعر جو حساس ہے سمیٹنے کی کوشش کی جو صرف سمندر میں ایک بوند ہی کہی جاسکتی ہے۔ اٹل جی نے اپنی سیاسی مشغولیت کے باوجود ادبی اثاثہ چھوڑا ہے، وہ ذیل کی کتابوں پر مشتمل ہے:

1 قیدی کوئی راج کی کنڈلیاں
2 امر آگ ہے
3 میری اکیاون کویتائیں
4 کیا کھویا کیا پایا
5 اکیس طویل نظمیں وغیرہ

اس کے علاوہ بے شمار مضامین بھی ہیں۔ اٹل جی کو مندرجہ ذیل اعزازات سے بھی نوازا گیا:

1 ''بھارت رتن— 1992
2 پدم بھوشن— 1992
3 سب سے بہتر M.P.— 1994

اٹل جی کی ان نظموں میں شرافت نفس ہے، خودداری ہے اور خود اعتمادی ہے جس میں ایک حساس شاعر کا دل دھڑکتا ہے۔ تہذیب کی کوکھ سے ہی نئی تہذیبیں جنم لیتی ہیں۔ سماجی شعور، کیفیات کی سلیقہ مندی، اٹل جی کے نفس نفس میں موجزن نظر آتی ہے اور قاری کو متاثر کرتی ہے۔

■

P.P. Srivastava "Rind"
R-16, Sector-XI
NOIDA-201301
Mob.:9711422058

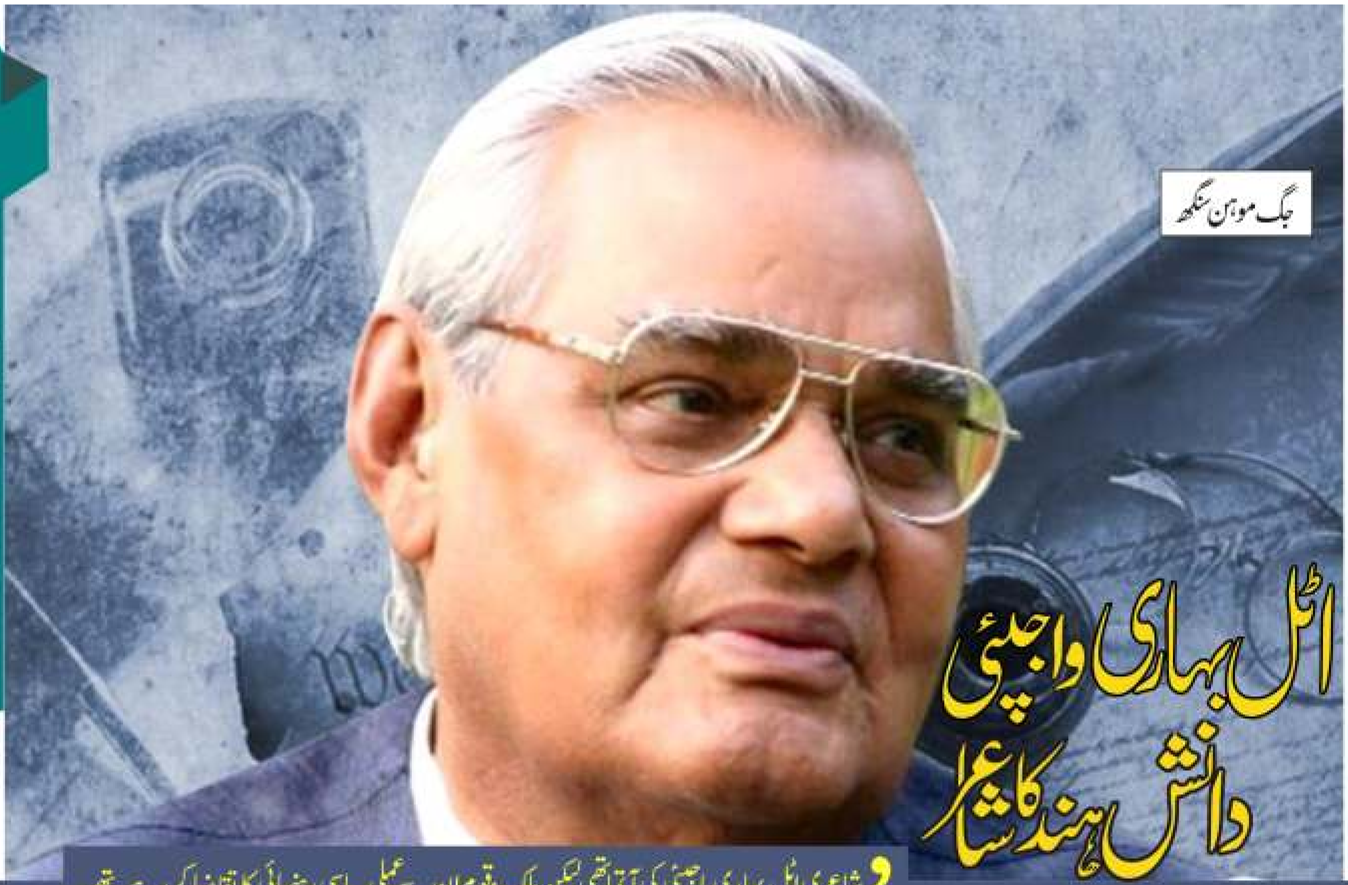

اٹل بہاری واجپئی
دانشِ ہند کا شاعر

جگ موہن سنگھ

شاعری اٹل بہاری باجپئی کی آتما تھی لیکن ملک وقوم ان سے عملی سیاسی رہنمائی کا تقاضا کر رہے تھے۔ چنانچہ اٹل جی نے حصول تعلیم کے دنوں سے ہی ہندوستان کی جنگ آزادی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کردیا۔ اٹل جی ہندوستانی سیاست کے ایک اہم ستون تھے جس کا اعتراف پنڈت جواہر لال نہرو کے علاوہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے تمام بڑے لیڈروں نے کیا ہے لیکن اٹل بہاری باجپئی کی شاعرانہ حیثیت پر کم ہی توجہ دی گئی ہے۔

بھارت رتن ایوارڈ یافتہ اٹل بہاری واجپئی جدید ہندوستان کے معماروں میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ ہندوستان صرف ایک جغرافیائی خطہ نہیں بلکہ ایک نظریۂ حیات (Ideology) کا نام ہے۔ اٹل بہاری واجپئی کی سیاسی سرگرمیاں اسی نظریے کے ارد گرد گھومتی ہیں لیکن سیاست سے الگ ان کی جو تخلیقی سرگرمیاں، نثر یا شاعری کی شکل سامنے آتی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے ملک وقوم کی ترقی کے لیے اپنے گزارے ہوئے شب وروز میں سے اگر کچھ اور زیادہ وقت اپنے تخلیقی اظہار وبیان کے لیے نکالا ہوتا تو ادبی حلقوں میں بھی ان کا شمار اس ملک کے دوسرے دانشوروں، ادیبوں اور شاعروں سے زیادہ بلند ہوسکتا تھا۔

اٹل بہاری واجپئی پیدائشی شاعر تھے۔ شاعری انھیں ورثے میں ملی تھی۔ ان کے والد شری کرشن بہاری واجپئی معتبر شاعر تھے اور مشاعروں میں بھی شرکت کیا کرتے تھے۔ اٹل بہاری واجپئی کے بڑے بھائی شری اودھ بہاری واجپئی بھی شعر کہتے تھے۔ چوں کہ اٹل جی کا مزاج لڑکپن سے ہی شاعرانہ تھا اس لیے ان کے شعری ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے ان کے والد اکثر انھیں بھی مشاعروں میں اپنے ساتھ لے جایا کرتے تھے۔ مشاعروں سے اٹل بہاری واجپئی نے شعر وشاعری کے مضمرات اور لوازمات کا گیان حاصل کیا اور ان کے والد نے اٹل بہاری واجپئی کے شاعرانہ ذوق کو صیقل کیا جس کی بنا پر وہ بہت جلد ایک شاعر کی حیثیت سے بھی مشہور ہوگئے۔

شاعری اٹل بہاری واجپئی کی آتما تھی لیکن ملک وقوم ان سے عملی سیاسی رہنمائی کا تقاضا کر رہے تھے۔ چنانچہ اٹل جی نے حصول تعلیم کے دنوں سے ہی ہندوستان کی جنگ آزادی اور سیاسی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا شروع کردیا۔ اٹل جی ہندوستانی سیاست کے ایک اہم ستون تھے جس کا اعتراف پنڈت جواہر لال نہرو کے علاوہ حزب اقتدار اور حزب اختلاف سے تعلق رکھنے والے تمام بڑے لیڈروں نے کیا ہے لیکن اٹل بہاری واجپئی کی شاعرانہ حیثیت پر کم ہی توجہ دی گئی ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ جیسے جیسے وقت گذرتا جارہا ہے اور ہندوستان کے سماجی، سیاسی، تہذیبی اور اخلاقی مسائل میں پیچیدگی پیدا ہوتی جارہی ہے، عوام اور خواص میں اٹل بہاری واجپئی کی شاعری زیادہ سے زیادہ مقبول ہوتی جارہی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اٹل جی کی شاعری ملک وقوم کو ہر نئے چیلنج (Challenge) کے موقع پر رہنمائی کے لیے سامنے آجاتی ہے۔ اٹل بہاری واجپئی پوری دنیا میں امن چاہتے تھے اور کسی ایک سماج کی نہیں بلکہ تمام انسانوں کی آزادی انھیں عزیز تھی۔ اسی لیے جب ملک آزاد ہوا تو دوسرے دیش واسیوں کی طرح اٹل جی نے بھی خوشیوں کے گیت گائے لیکن اسی دن 15 اگست 1947 کو انھوں نے ایک نظم 'سوتنتر تا دوس کی پکار' (یوم آزادی) کے عنوان سے لکھی۔

اٹل بہاری واجپئی کی پیدائش کرسمس کے دن 25 دسمبر 1924 کو گوالیار میں ہوئی۔ ابتدا سے لے کر گریجویشن تک کی تعلیم گوالیار میں ہی حاصل کی۔ کانپور سے Political Science میں ایم اے کیا اور پھر قانون کی ڈگری بھی حاصل کی۔ اٹل صاحب ایک ہونہار مقرر تھے۔ ان کی خطابت میں لب ولہجے کی تیزی کے ساتھ ساتھ فکر وخیال میں بھی منفرد روشن خیالی ہوتی تھی۔ اسی لیے اکثر وبیشتر ادبی، علمی اور سیاسی مباحثوں میں انھیں اول انعام سے نوازا جاتا تھا۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

''ایک بار الٰہ آباد میں بحث کا مقابلہ رکھا گیا جس

میں اٹل جی گوالیار سے ٹرین لیٹ ہوجانے کے باعث مقابلے کے مقام پر تب پہنچے جب مقابلہ تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ ججوں نے لگ بھگ اپنے فیصلے تیار کر لیے تھے، لیکن سفر سے تھکے اٹل جی جلد ہی اسٹیج پر پہنچ کر بولنے لگے اور انھوں نے دیر سے آنے کا سبب بیان کر کے معذرت چاہی اور متعلقہ موضوع پر مؤثر طریقے سے تقریر کی۔ ان کی تقریر پر سامعین عش عش کراٹھے اور ججوں کو اپنا فیصلہ بدلنا پڑ گیا۔ اٹل جی اول نمبر پر آئے اور انھوں نے انعام پایا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان ججوں میں ڈاکٹر ہری ونش رائے بچن بھی شامل تھے۔''

(بحوالہ مضمون 'اٹل بہاری باجپئی اور ان کی شاعری' از کرشن موہن۔ کتاب: اٹل بہاری باجپئی کی نظمیں 1998، ص 12)

اٹل بہاری واجپئی نے 1942 کی 'بھارت چھوڑو تحریک' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں کئی دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح اٹل بہاری واجپئی کو بھی گرفتار کرلیا اٹل جی 24 دنوں تک جیل میں رہے اس کے بعد بھی انھیں ان کی سیاسی سرگرمیوں کے لیے کئی بار قید وبند کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔

اٹل بہاری واجپئی نے 1942 کی 'بھارت چھوڑو تحریک' میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ جس کے نتیجے میں کئی دوسرے سیاسی لیڈروں کی طرح اٹل بہاری واجپئی کو بھی گرفتار کر لیا اٹل جی24دنوں تک جیل میں رہے اس کے بعد بھی انہیں ان کی سیاسی سرگرمیوں کے لیے کئی بار قید وبند کی سختیاں جھیلنی پڑیں۔

سنہ 1946 میں اٹل بہاری واجپئی نے سنگھ کے پرچارک کا کام شروع کیا۔ اس کے ساتھ ہی 'راشٹریہ دھرم' نامی اخبار کی ادارت بھی کرتے رہے۔ اس اخبار میں اٹل بہاری واجپئی جو اداریے اور مضامین لکھتے اور گاہے بگاہے ان کی جو نظمیں شائع ہوتی، انھیں پورے ملک میں پسند کیا گیا۔ خاص طور پر چلا پتی راؤ، پرشوتم داس ٹنڈن، بنارسی داس چترویدی، یشپال، امرت لال ناگر، رام کمار ورما، مہادیوی ورما، پنڈت سوریہ کانت ترپاٹھی جیسے ادبا، شعرا اور صحافی اٹل بہاری واجپئی کی تحریروں کی بہت تعریف کرتے تھے۔

اٹل بہاری واجپئی صاحب کی نظموں کا ایک مجموعہ بعنوان 'اٹل بہاری واجپئی کی نظمیں' اردو اکیڈمی دہلی نے 1998 میں شائع کیا ہے۔ اس مجموعے میں 'حرفِ آواز' کے طور پر اردو کے مشہور شاعر مخمور سعیدی نے لکھا کہ:

''جناب اٹل بہاری واجپئی ملک کے صف اول کے سیاسی رہنما ہونے کے علاوہ ہندی کے بلند پایہ شاعر بھی ہیں۔ کچھ مدت پہلے ان کی منتخب نظموں کا ایک مجموعہ دیوناگری میں شائع ہوا تھا اور ملک اور بیرون ملک کے ہندی حلقوں میں اس کی دھوم مچ گئی تھی۔ اب یہی نظمیں جو اٹل جی کی شاعرانہ شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کی نمائندگی کرتی ہیں اور ان کی ذہنی اور جذباتی رویوں کی ترجمان ہیں، اردو رسم الخط میں شائع کی جارہی ہیں۔''

(اٹل بہاری باجپئی کی نظمیں ص 10)

اٹل بہاری واجپئی کی شاعری کو چار حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان 'انوبھوتی کے سُر' (محسوسات کے نغمے) ہے۔ اس حصے کی نظموں میں آمد کے رنگ میں اپنے اعزازت اور سچے احساسات کی کار فرمائی، اظہار کی سادگی، بے ساختگی اور روانی ملتی ہے۔ دوسرے حصے میں 'راشٹریتا کے سُر' کے عنوان سے قومی نظمیں ملتی ہیں۔ ان نظموں میں اٹل بہاری کی اپنے وطن سے محبت مختلف صورتوں میں جلوہ گر ہوئی ہے۔ تیسرے حصے میں جس کا عنوان ''چنوتی کے سر'' (للکار کے نغمے) ہے۔ اٹل بہاری باجپئی نے ملک کے مسائل کو ذہن میں رکھتے ہوئے اہل وطن کو صبر وسکون اور ہمت سے کام لینے کی تلقین کی ہے۔ اس مجموعے کا چوتھا اور آخری حصہ 'وِودھ سُر' (متنوع نغمے) ہے۔ جس میں انھوں نے بحیثیت انسان اپنے آس پاس کی زندگی، زمانہ، حالات و واقعات کے حوالے سے اپنے جذبات کا اظہار کیا ہے۔

مجموعے کے پہلے حصے میں اٹل بہاری واجپئی نے ملک کی آزادی کو ایک نعمت قرار دیتے ہوئے ماضی، حال اور مستقبل کی بات کی ہے۔ نظم 'آؤ پھر سے دیا جلائیں' میں اٹل بہاری واجپئی نے کہا ہے کہ آزادی تو مل گئی لیکن ابھی کام ادھورا ہے۔ آزادی کے باوجود ملک سے غریبی اور مفلسی کا اندھیرا دور نہیں ہوا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایک بار پھر ملک کے تمام لوگ اس پسماندگی کے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے متحد ہو کر جدو جہد کا دیا جلائیں۔ اٹل صاحب فرماتے ہیں۔

بھری دوپہری میں اندھیارا
سورج پرچھائیں سے ہارا
انترتم کا نیہہ نچوڑیں، بجھی ہوئی باتی سُلگائیں
آؤ پھر سے دیا جلائیں
ہم پڑاؤ کو سمجھے منزل
لکشیہ ہوا آنکھوں سے اوجھل
ورتمان کے موہ جال سے آنے والا کل نہ بھلائیں
آؤ پھر سے دیا جلائیں

اٹل جی نے اپنی نظم 'پہچان' میں انسانیت اور مساوات کا درس دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

پیڑ کے اوپر چڑھا آدمی
اونچا دکھائی دیتا ہے
جڑ میں کھڑا آدمی
نیچا دکھائی دیتا ہے

آدمی نہ اونچا ہوتا ہے نہ نیچا ہوتا ہے
نہ بڑا ہوتا ہے نہ چھوٹا ہوتا ہے
آدمی صرف آدمی ہوتا ہے

اسی طرح اپنی نظم 'گیت نیا گاتا ہوں میں' میں اٹل جی اپنے تصور میں ایک ایسے ہندوستان کا سپنا دیکھتے ہیں۔ جس میں پورا ملک خوشحال ہے اور کہتے ہیں حالات جیسے بھی ہوں میں ہار نہیں مانوں گا اسی لیے میں امید کے گیت گاتا ہوں۔ لکھتے ہیں۔

ٹوٹے ہوئے تاروں سے ٹوٹے واسنتی سُر
پتھر کی چھاتی میں آگ آیا تو انکُر
جھڑے سب پیلے بات
کوئل کی کوہک رات
پراچی میں ارونما کی ریکھ دیکھ پاتا ہوں
گیت نیا گاتا ہوں
ٹوٹے ہوئے سپنے کی سنے کون سسکی
انتر کو چیر و ویتھا پلکوں پر ٹھٹکی
ہار نہیں مانوں گا

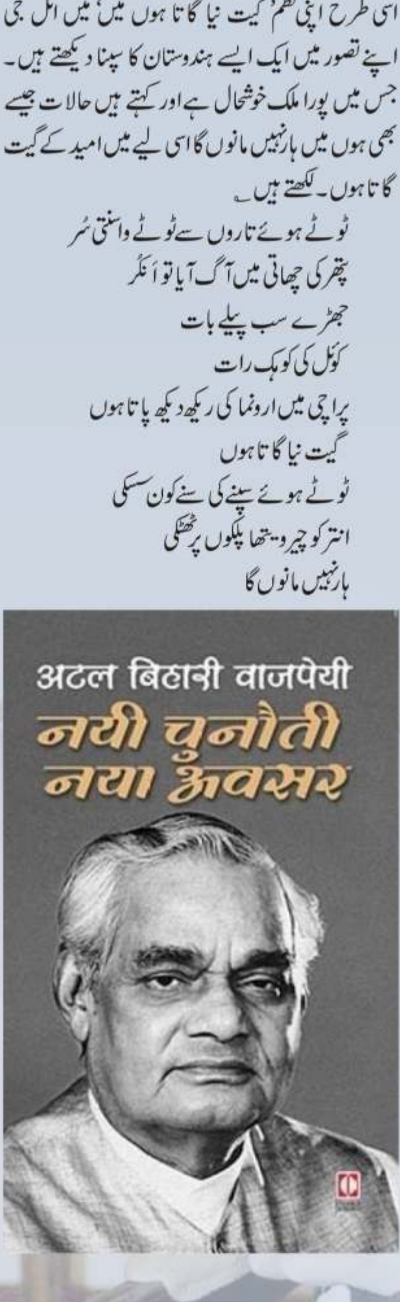

رار نئی ٹھانوں گا
کال کے کپال پر لکھتا مٹاتا ہوں
گیت نیا گاتا ہوں

اٹل بہاری واجپئی کے وجود میں دیش بھگتی بھری ہوئی تھی۔ ملک کے آزاد ہونے کی انھیں خوشی تھی لیکن مذہب کے نام پر ملک کی تقسیم کا انھیں بے حد رنج بھی تھا۔ اسی لیے انھوں نے 15 اگست 1947 کو ہی 'سوتنتر تا دوس کی پکار' کے نام سے جو نظم لکھی ہے، اس میں آزادی کے بعد بھی ہندو اور مسلمانوں کے رنج و غم کا ذکر کیا ہے۔

اٹل بہاری واجپئی نے 'چنوتی کے سُر' کے عنوان کے تحت ملک اور ملک کے عوام کو درپیش چیلنجوں پر نظمیں لکھی ہیں۔ اپنی نظم 'ماتر پوجا پر بندھت' میں لکھا ہے کہ انسان کو چنوتیوں سے گھبرانا نہیں چاہیے کیوں کہ پھول کانٹوں کے درمیان کھلتے ہیں اور اندھیروں کے بیچ ہی چراغ روشن ہوتے ہیں جیسی بھی مصیبتیں آئیں اپنے وطن سے محبت اور اس کی ترقی کے جذبات کو رُکنے نہیں دینا چاہیے۔ اٹل بہاری واجپئی صاحب لکھتے ہیں۔

پشپ کنٹکوں میں کھلتے ہیں
دیپ اندھیروں میں جلتے ہیں
آج نہیں، پرہلادیگوں سے
پیڑاؤں میں ہی پلتے ہیں
کنتو یاتناؤں کے بل پر
نہیں بھاؤنائیں رکتی ہیں
چتا ہولیکا کی جلتی ہے
انیائی کرہی ملتے ہیں

اور پھر دیش واسیوں کو اٹل بہاری واجپئی اپنی نظم 'قدم ملا کر چلنا ہوگا' میں کہتے ہیں کہ حالات جیسے بھی ہوں ملک کی ترقی اور خوشحالی کے لیے ضروری ہے کہ سبھی لوگ ایک دوسرے کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلیں۔ اٹل جی کے لفظوں میں۔

بادھائیں آتی ہیں آئیں
گھریں پرلے کی گھور گھٹائیں
پانو کے نیچے انگارے
سر پر برسیں یدی جوالائیں
نج ہاتھوں سے ہنستے ہنستے
آگ لگا کر جلنا ہوگا
قدم ملا کر چلنا ہوگا

اس مجموعے کے آخری حصے میں جس کا عنوان ہی 'وودھ سُر' (متنوع نغمے) ہے۔ اٹل بہاری باجپئی نے ذاتی جذبات و خیالات کو نظموں کی شکل میں پیش کیا ہے۔

دراصل ان نظموں میں اٹل جی نے اپنے من کی گھانٹھوں کو کھولنے کی کوشش کی ہے لیکن انسان کی مجبوری یہ ہے کہ کوشش کے باجود من کی ساری گھانٹھیں کھل نہیں پائی۔ اس لیے انھوں نے لکھا ہے۔

من میں لگی جو گانٹھ مشکل سے کھلتی
داغدار زندگی نہ گھاٹوں پر دُھلتی
جیسی کی تیسی نہیں
جیسی ہے ویسی سہی
کبیرا کی چدریا بڑے بھاگ ملتی

اس حصے کی دوسری نظموں میں بھی انھوں نے اپنے من کی مختلف الجھنوں، جذبات اور کیفیات کا اظہار کیا ہے۔ لیکن اس حصے میں ایک نظم امن اور شانتی کی حمایت میں

اٹل بہاری باجپئی کو جنگ سے نفرت اور امن سے محبت تھی کیوں کہ امن میں ھی انسانیت پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ھے۔ اسی لیے انہوں نے اپنی نظم 'جنگ نہ ھونے دیں گے' میں لکھا ھے کہ ھم عالمی امن کے پجاری ھیں اس لیے پچھلی عظیم جنگوں میں پوری دنیا میں جو تباھی ھوئی۔ کھیتوں اور کھلیانوں میں انسانی لاشوں کی فصل کٹی اور ایٹم بمبوں سے ناگاساکی جس طرح جلا ھم اس کے حق میں نہیں ھیں ھم ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتے ھیں۔ جہاں جنگ نہ ھواور صرف امن کا ھی بول بالا ھو۔ اٹل بہاری باجپئی کے ان جذبات کا اندازہ ان کی نظم کے اس بند سے لگایاجاسکتاھے۔

بھی ہے۔ اٹل بہاری واجپئی نے اپنی زندگی میں مغرب کی کئی جنگوں کے علاوہ پاکستان اور چین کے ساتھ بھی کئی جنگوں کو دیکھا تھا۔ وہ یہ مانتے تھے کہ ہندوستان ایک امن پسند ملک ہے۔ اسی لیے وہ ہمیشہ سے جنگ کے مخالف رہے ہیں اپنے امن پسند نظریے کی بنیاد پر ہی انھوں نے پاکستان کا بھی دورہ گیا تھا لیکن اس دورے کے فوراً بعد ہندوستان اور پاکستان کے بیچ کارگل جنگ ہوگئی۔

اٹل بہاری واجپئی کو جنگ سے نفرت اور امن سے محبت تھی کیوں کہ امن میں ہی انسانیت پھلتی پھولتی اور پروان چڑھتی ہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی نظم 'جنگ نہ ہونے دیں گے' میں لکھا ہے کہ ہم عالمی امن کے پجاری ہیں اس لیے پچھلی عظیم جنگوں میں پوری دنیا میں جو تباہی ہوئی۔ کھیتوں اور کھلیانوں میں انسانی لاشوں کی فصل کٹی اور ایٹم بموں سے ناگاساکی جس طرح جلا ہم اس کے حق میں نہیں ہیں ہم ایک ایسی دنیا کا خواب دیکھتے ہیں۔ جہاں جنگ نہ ہو اور صرف امن کا ہی بول بالا ہو۔ اٹل بہاری واجپئی کے ان جذبات کا اندازہ ان کی نظم کے اس بند سے لگایا جاسکتا ہے۔

ہم جنگ نہ ہونے دیں گے
وشوشانتی کے ہم سادھک ہیں جنگ نہ ہونے دیں گے
کبھی نہ کھیتوں میں پھر خونی کھاد پھلے گی
کھلیانوں میں نہیں موت کی فصل کھلے گی
آسمان پھر کبھی نہ انگارے اگلے گا
ایٹم سے ناگاساکی پھر نہیں جلے گی
یدھ وہین وشو کا سپنا بھنگ نہ ہونے دیں گے
جنگ نہ ہونے دیں گے

بحیثیت مجموعی اٹل بہاری واجپئی ایک بے حد حساس انسان اور محبِ وطن شاعر اور دانشور تھے۔ ان کی شاعری کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے یہاں رومانیت اور حقیقت پسندی کو توازن کے ساتھ برتا گیا ہے۔ ان کی شاعری کے لفظ لفظ سے ان کی دیش بھگتی ٹپکتی ہے۔ زبان پر انھیں کامل عبور حاصل ہے۔ اسی لیے انھوں نے موضوع اور موقع محل کے حساب سے الفاظ اور تراکیب کو پوری مہارت کے ساتھ برتا ہے۔ اٹل بہاری واجپئی کی شاعری میں ترقی پسندی بھی ہے اور انقلابیت بھی۔ لیکن وطن دوستی ان کی شاعری کی روح ہے۔ جس کا اظہار ان کی شاعری میں پورے یقین اور روانی کے ساتھ ہوا ہے۔ ویسے تو ہندوستان میں محبِ وطن شاعروں کی ایک بڑی تعداد رہی ہے لیکن بیسویں صدی کی چھٹی دہائی سے لے کر اکیسویں صدی کی پہلی دہائی تک کے دور میں اٹل بہاری باجپئی نے جس طرح کہیں استعاروں اور علامتوں کے سہارے اور کہیں صاف اور سادہ اسلوب میں ہزاروں سال پر پھیلی ہندوستان کی تاریخ کے حوالے سے اس ملک کے امن پسند اور عالمی بھائی چارے کے نظریے کو پیش کیا ہے، اس کی بنیاد پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ اٹل بہاری واجپئی صاحب دانشِ ہند کے سچے شاعر تھے۔

■

Dr. Jug Mohan Singh
S/o Sh. Vilayat Singh
C/o Cambridge International School
Purkhoo Camp, Domana, Jammu, 181206
Mob.: 7889762542

ودربھ کی خواتین افسانہ نگار

محمد اسداللہ

ریاست مہاراشٹر کے نقشے میں علاقہ ودربھ ملک کے تقریباً وسط میں واقع نظر آتا ہے، یہ اپنی زرعی پیداوار کے علاوہ اردو ادب کی مختلف اصناف میں نمائندگی کے لیے بھی جانا جاتا ہے۔ یہ گیارہ اضلاع پر مشتمل ہے۔ سرکاری انتظام کے تحت صوبۂ مہاراشٹر کو ممبئی، پونا، اورنگ آباد اور ناگپور کے نام سے چار حصوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ اس کے مشرقی علاقے 'برار' میں امراوتی، ایوت محل، آکولہ، بلڈانہ اور واشم اضلاع شامل ہیں۔ مغربی حصے میں ناگپور، بھنڈارہ، گوندیا، چندر پور، گڑ چرولی، وردھا ضلعے ہیں یہ علاقہ گونڈوانہ کے نام سے مشہور تھا۔

اس علاقے میں تخلیق ہونے والے اردو ادب میں افسانہ نگاری کی ایک دیرینہ روایت رہی ہے۔ اس سلسلے، میں عبدالستار فاروقی کا نام اس لحاظ سے قابل ذکر ہے کہ انھوں نے 1931 میں کامٹی سے ہفتہ وار 'امید' جاری کیا تھا۔ اپنے مضامین میں افسانوی طرز اظہار کو بروئے کار لاکر افسانہ نگاری کے لیے ابتدائی نقوش ثبت کیے انھیں ودربھ کے اولین افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کے بعد ہمیں افسانہ نگاروں کی ایک کہکشاں نظر آتی ہے۔ ان میں سے کئی افسانہ نگاروں نے ادب میں اپنی پہچان بنائی، ان کی تخلیقات ملک و بیرون ملک کے رسائل میں شائع ہوئیں اوران کی کتابیں بھی منظر عام پر آئیں۔ ان میں ایسے افسانہ نگار بھی ہیں جنھوں نے ودربھ میں آنکھ کھولی، یہاں زیورِ تعلیم سے آراستہ ہوئے مگر ان چراغوں کی روشنی کسی اور علاقے کے مکانوں کا مقدر تھی۔ جن شہروں کو انھوں نے اپنا وطنِ ثانی بنایا ان کی ناموری میں ان شہروں کا نام لکھا گیا، تاہم ودربھ کے ان افسانہ نگاروں کو اس دیار سے جو نسبت رہی ہے اسی مناسبت سے اس مضمون میں انھیں بھی شامل کیا گیا ہے کہ بیٹی سسرال چلی جائے تب بھی میکے سے اس کا ایک رشتہ ضرور ہوتا ہے۔ ودربھ کے افسانہ نگاروں کے چند اہم نام درج ذیل ہیں۔

افسانہ نگار

عبدالستار فاروقی، قادر نیازی، ریاض روفی، شاکر اورنگ آبادی، فیض انصاری، حمید جمال، شریف اورنگ، قیصر واحدی کامٹی، تبسم شفائی، حکیم عزیز قدوسی کامٹوی، شیام سوشل: عبدالصمد قیصر بدنیروی، نواب تقی علی، شارق نیازی امراوتوی، متین پرویز اکولوی، حنیف فاتح، ماسٹر عثمان ناظر کامٹوی، شاہد کبیر، عبدالرحیم نشتر، ق۔ حسرت، میم ناگ۔ مظہر سلیم، طارق کھولا پوری، وکیل نجیب، ڈاکٹر اشفاق احمد عظیم راہی۔ نواب رونق جمال، ایم آئی ساجد، غنی غازی، طفیل سیماب، ڈاکٹر غلام السیدین ربانی، ڈاکٹر یحیٰ جمیل، صبغت اللہ، حبیب ریتھ پوری، سعید احمد خاں۔ غلام رسول اشرف، عمر حنیف، عاجز ہنگن گھاٹی، ڈاکٹر محمد ابوالکلام، بابر شریف، عبدالقدیر صدیقی، کلیم ضیا، محمد رفیع مجاہد، فیروز خاں یاس، سکندر عرفان، مظہر حیات۔

خواتین افسانہ نگار

زہرہ جبیں، فہمیدہ پروین،، زرینہ ثانی، واجدہ تبسم، نیر جہاں، شفیقہ فرحت، بانو سرتاج، بلقیس شبیہ، رضیہ مبین نقوی، نکہت خان، ڈاکٹر نکہت ریحانہ، ثریا صولت حسین، کلثوم ممتاز، ڈاکٹر قمر جہاں۔ ڈاکٹر سروشہ نسرین، شگفتہ عارف، صفیہ سلطانہ، زہرہ جمال، نیر شبنم، سلمیٰ نسرین، قیصر انجم، فرزانہ اسد۔ نیلوفر ناہید۔

ودربھ سے باہر سکونت اختیار کرنے والے افسانہ نگار

نیر جہاں (امریکہ) واجدہ تبسم، میم ناگ، مقدر حمید، ڈاکٹر کلیم ضیا، مظہر سلیم، ثریا صولت حسین، غنی غازی (ممبئی) شفیقہ فرحت (بھوپال) رفیعہ منظور الحسین (حیدرآباد)، عظیم راہی (اورنگ آباد)، نواب رونق جمال (درگ، چھتیس گڑھ)، سکندر عرفان، (کھنڈوہ) وغیرہ

آیئے ان میں سے چند اہم خواتین افسانہ نگاروں کے ادبی کاموں پر نظر ڈالیں۔

زہرہ جبیں

پروفیسر زہرہ جبیں بنیادی طور پر ڈراما نگار تھیں ان

کی دو کتابیں 'مشعل راہ (1977)' اور 'صبح کے بھولے' ڈراموں کے مجموعے ہیں 1978 میں ان کے افسانوں کا مجموعہ نشیب و فراز شائع ہوا تھا۔ چھٹی دہائی میں ان کے کئی افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوئے۔ ان پر عصمت چغتائی کے افسانوی انداز کا اثر نمایاں ہے۔ انھوں نے تقریباً سو افسانے تحریر کیے۔ ان کی چار کتابیں شائع ہوئیں۔ اردو کی مختلف اصناف میں زود نویسی کے علاوہ زہرہ جبیں نے انگریزی میں بھی شاعری کی۔ انگریزی شاعری کے ایک انتخاب میں بھی ان کی نظمیں شامل کی گئی تھیں۔ ان کے متعلق نامور محقق ڈاکٹر شرف الدین ساحل لکھتے ہیں: ناگپور کی ادبی تاریخ میں زہرہ جبیں کو اس لحاظ سے فوقیت حاصل ہے کہ بیک وقت تین اصناف شاعری، ڈراما نگاری، اور افسانہ نگاری میں عبور رکھتی تھیں۔ وہ اس شہر کی پہلی خاتون افسانہ نگار ہیں جن کے افسانے کتابی صورت میں شائع ہو کر منظر عام پر آئے۔

(زہرہ جمال کی افسانہ نگاری، ڈاکٹر شرف الدین ساحل، مطبوعہ، ماہنامہ قرطاس جنوری 2018، ص20)

زرینہ ثانی:

5 جولائی 1936 کو ناگپور میں پیدا ہوئیں۔ ناگپور گورنمنٹ گرلز ہائی اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد ناگپور یونیورسٹی سے مولوی کا امتحان پاس کیا۔ بی اے اور ایم اے کی ڈگریاں حاصل کرنے کے بعد سیماب کی نظمیہ شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ ان کا پہلا افسانہ ماہنامہ بانو، دہلی میں شائع ہوا تھا۔ زرینہ ثانی کے نمائندہ افسانوں میں: قصور اپنا نکل آیا، بدلہ تیرے ستم کا، عورت کی خودداری، ایک کرن اجالے کی، خیال اپنا اپنا، مجرم، ضمیر اور پھاٹک وغیرہ شامل ہیں۔ ان کے افسانے اس عہد کے نسوانی اور خصوصاً ازدواجی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان کے کردار جاندار ہیں اور حقیقی زندگی سے قریب تر محسوس ہوتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں گھریلو زندگی کی جھلکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ اگر وہ افسانہ نگاری کی طرف مکمل توجہ دے پاتیں تو یقیناً ایک زبردست فنکار ودربھ کے افسانوی ادب کو مل جاتا لیکن انھوں نے تحقیق اور شاعری کی طرف رخ موڑ لیا۔

واجدہ تبسم

واجدہ تبسم (16 مارچ 1935 - 7/ دسمبر 2010) اردو کی مشہور افسانہ نگار تھیں۔ ان کی پیدائش امراؤتی میں ہوئی انھوں نے ودربھ ہی میں تعلیم حاصل کی اور تقسیم ہند کے ہنگاموں میں وہ حیدرآباد منتقل ہو گئیں اور آخر عمر میں ممبئی میں سکونت پذیر تھیں۔ ان کے افسانوں میں عورتوں پر ہونے والے مظالم اور استحصال کو نمایاں کیا گیا ہے۔ ان میں جنسیت کا غلبہ ہے واجدہ تبسم کا اپنا منفرد اسلوب اور سماجی حقیقت نگاری کا اپنا الگ انداز تھا۔ نتھ کا بوجھ، اور نتھ اترائی ان کے مشہور افسانوی مجموعے ہیں۔ ماہنامہ شمع میں ان کے افسانے بڑے اہتمام سے شائع ہوا کرتے تھے۔ ان کی قابلِ ذکر تصانیف میں آیا بسنت سکھی، شہرِ ممنوع، نتھ اترائی، نتھ کا غرور، نتھ کا بوجھ، نتھ کا زخم، پھول کھلنے دو، اور زر، زن اور زمین شامل ہیں۔ مسلم معاشرے میں صنفِ نازک پر اندرونِ خانہ مظالم اور خاص طور پر نوابانِ حیدرآباد کے جنسی استحصال کے قصے ان کی کہانیوں کی مقبولیت کا سبب بنے۔ عورت کی نفسیات کی عکاسی ان کی تحریروں کا خاصہ ہے۔ پاکستانی افسانہ نگار زاہدہ حنا نے واجدہ تبسم کے بارے میں لکھا ہے:

''واجدہ کے جملوں میں کانٹے اگے ہوئے تھے، سچ یہ بھی ہے کہ وہ ان کانٹوں سے معاشرے کے سڑے گلے جسد سے فاسد مادہ نکالنا چاہتی تھیں یہ اور بات کہ بعض لوگوں نے اس مواد کو شہد سمجھ لیا تھا۔''

واجدہ تبسم نے کرداروں کو ان کے ماحول اور اس میں موجود مسائل کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مقامی لب و لہجے اور منظر کشی نے بھی اس بیانیہ میں جان ڈال دی ہے۔

نیر جہاں

نیر جہاں ضلع ایوت محل کے قصبہ ونی میں پیدا ہوئیں۔ امراوتی میں محمڈن ہائی اسکول میں افسانہ نگار واجدہ تبسم کی ہم جماعت تھیں۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان اور پھر وہیں سے امریکہ چلی گئیں۔ امریکہ میں مرکز انٹرنیشنل کی صدر ہیں۔ اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں مصروف اور آپا ئے اردو کے نام سے معروف ہیں پسِ چہرہ ان کا شعری مجموعہ ہے۔ شاعری کے علاوہ انھوں نے افسانے بھی لکھے۔ ان کے افسانوں میں سیامیز ٹوئینز Twins Siamese، 'دھنک سے پتی ریت تک' اور 'مہندی کے دو رنگ' مشہور ہیں۔

شفیقہ فرحت:

مشہور مزاح نگار شفیقہ فرحت 26 اگست 1931 کو ناگپور میں پیدا ہوئیں۔ ملازمت کے سلسلے میں وہ بھوپال منتقل ہو گئی تھیں اور اسی کو اپنا وطنِ ثانی بنا لیا۔ 1950 کے بعد جن ادیبوں نے صنفِ افسانہ کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا اور چند تخلیقات شائع کیں ان میں شفیقہ فرحت کا نام بھی ہے جنھوں نے ناگپور سے بچوں کے لیے رسائل شائع کیے لیکن بعد میں انھوں نے طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی ان کی چند کہانیوں کو افسانوں کے مقابلوں میں انعام سے بھی نوازا گیا تھا۔ ان کے افسانے مختلف رسائل میں شائع ہوئے، ان کے مزاحیہ مضامین پر بھی افسانوی انداز کی گہری چھاپ نظر آتی ہے۔

بانو سرتاج

بانو سرتاج پانڈھر کوڑا ضلع ایوت محل میں 17 جولائی 1945 کو پیدا ہوئیں۔ چندر پور میں جنتا شکشن مہاودیالیہ کی پرنسپل کی حیثیت سے سبکدوش ہوئیں اور چندر پور میں سکونت پذیر ہیں۔

ودربھ میں بانو سرتاج کو افسانے کی سب سے توانا آواز سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ادبِ اطفال میں ان کی خدمات کے لیے انھیں ساہتیہ اکادمی انعام مل چکا ہے تاہم ایک مدت سے افسانہ نویسی کے سبب وہ افسانہ نگار کے طور پر مشہور ہیں۔ ان کی چھتیس مطبوعات میں سے آٹھ افسانوی مجموعے ہیں۔ نئے حالات کا سامنا کرتی ہوئی عورت کے کئی روپ ان کے افسانوں میں نمایاں ہیں۔ ان کی تحریروں میں عورت زندگی کے مختلف شعبوں میں حالات سے نبرد آزما ہے۔ ان تحریروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان میں مصنفہ مسلسل ان مسائل کے اسباب کا جائزہ لیتی ہوئی اور ان کے حل کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کے متعلق نذیر فتح پوری لکھتے ہیں۔

بانو سرتاج کے افسانے ان کی باطنی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے آنسو ہیں جو زندگی اور متعلقاتِ زندگی کی داستانِ خونچکاں پڑھ کر بہے ہیں اور صفحہ قرطاس پر پھیل گئے ہیں۔ (اس کے لیے)۔

دائروں کے قیدی، اس کے لیے، ذرا سی کمی، اپنے ہاتھوں میں تھاما ہوا میزان اور دھندلی پرچھائیاں ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔

بلقیس شبیہ

بلقیس شبیہ کا تعلق اکولہ سے ہے۔ اسی ضلع کی ایک تحصیل آکوٹ میں پیدا ہوئیں۔ ان کی کہانیاں ماہنامہ بتول، تعمیرِ ہریانہ، درخشاں اور نیا دور جیسے رسائل میں شائع ہوئیں۔ آل انڈیا ریڈیو دہلی سے نشر بھی ہوئیں۔ اس علاقے میں جب بہت کم خواتین تخلیقِ ادب کی طرف متوجہ تھیں، بلقیس شبیہ نے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کی بنا پر مقبولیت حاصل کی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ خالی سیپ 1982 میں شائع ہوا جس میں بارہ کہانیاں ہیں۔ چند کہانیاں رب خود کلامی، خالی سیپ، ساحل کا تھپیڑا، خط کے فارم میں ہیں۔ بلقیس شبیہ نے اس تکنک کو بڑی عمدگی کے ساتھ برتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں خاص طور پر مشرقی قدروں کی پروردہ عورت جن مسائل سے دوچار ہوتی ہے اور جس ردِ عمل کا اظہار کرتی ہے۔ اس صورتِ حال کو مصنفہ نے مہارت

کے ساتھ پیش کیا ہے۔فنِ افسانہ نگاری پر ان کی گرفت مضبوط ہے اور بیانیہ بھی خوب ہے۔ خالی سیپ افسانے میں ایک عورت کی جذباتی کشمکش کو بیان کیا گیا ہے جو اپنے شوہر سے علاحدہ ہوکر زندگی گزارتی ہے۔

رضیہ مبین نقوی

رضیہ مبین نقوی 7 جون 1931 کو اکولہ میں پیدا ہوئیں۔ ناگپور یونیورسٹی سے بی اے اور بھوپال سے بی ایڈ کا امتحان دے کر پیشہ تدریس میں 44 برسوں پر محیط خدمات انجام دیں۔ ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد اکولہ میں سکونت پذیر تھیں۔اپنی آپ بیتی 'ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا' میں انھوں نے اپنے اردگرد بکھری زندگی اور اور اپنے حالاتِ زندگی، تجربات، تلخ اور شیریں یادوں کو بیان کیا ہے۔خواتین قلم کاروں کی خودنوشت سوانح میں 'ذرا عمرِ رفتہ کو آواز دینا' کو ودربھ میں اولین کتاب شمار کیا جا سکتا ہے۔رواں دواں اور شستہ زبان میں لکھی گئی یہ کتاب اس علاقے کی زندگی کی جھلکیاں بھی پیش کرتی ہے۔ زبان کا یہی وصف ان کی کہانیوں کے مجموعے 'میں جانوں یا میرا خدا' (2011) میں بھی موجود ہے۔ان کی کہانیاں جزئیات نگاری اور لطفِ بیان کے اعتبار سے لائق تحسین ہیں۔مگر بیشتر تحریریں احوالِ واقعی کا بیان بن کر رہ گئی ہیں جبکہ فنِ افسانہ نگاری عالمِ امکاں میں دوسرا قدم رکھنے سے عبارت ہے۔ رضیہ مبین کی کہانیوں میں جہاں کہانی پن کی کمی خاص طور پر محسوس ہوتی ہے وہیں اشعار کا بے محابا استعمال گراں گزرتا ہے۔انھوں نے گھریلو زندگی کی تصویریں پیش کی ہیں، کرداروں کے مکالموں میں مقامی زبان کو جگہ دے کر اس علاقے کے مخصوص فطری ماحول میں پہنچنے کے لیے قاری کا راستہ ہموار کیا ہے اور اپنی تحریروں کو عصری زندگی کی مہک سے آراستہ کیا ہے۔

نکہت خان

نکہت خان کا تعلق ناگپور سے تھا۔ان کے افسانے اکثر بیسویں صدی میں شائع ہوتے رہے۔نکہت خان نے افسانہ نگاری کے علاوہ شاعری کی اور مشاعروں میں بھی شرکت کی۔وہ آل انڈیا ریڈیو کے اردو پروگراموں میں بھی اپنی تخلیقات پیش کرتی رہیں۔ مقامِ افسوس ہے کہ اس شہر کے ادبی حلقے میں بہت کم لوگ ان کے ادبی کاموں سے واقف ہیں۔ان کی تخلیقات بھی صرف مذکورہ رسائل ہی میں موجود ہیں۔

ڈاکٹر نگہت ریحانہ

ڈاکٹر نگہت ریحانہ کی پیدائش 7/ جولائی 1942 کو ناگپور میں ہوئی۔ان کے والد ملازمت سے سبکدوش ہونے پر امراؤتی منتقل ہو گئے تھے۔موصوفہ نے اردو مختصر افسانہ: نویسی فن کا تحقیقی مطالعہ، 1947 سے تا حال، اس موضوع پر دہلی یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی تھی۔ انھوں نے امراؤتی اور ناگپور کے ڈگری کالجوں میں تدریس کے فرائض انجام دیے۔ڈاکٹر نگہت ریحانہ کے افسانوں کا مجموعہ شیشوں کا مسیحا 1990 میں شائع ہوا۔ڈاکٹر نگہت ریحانہ کے افسانوں میں تکنک کے تجربات بھی ملتے ہیں، گنہگار فرشتے میں Dramatic monologue کی تکنک کو بروئے کار لایا گیا ہے۔اسی طرح زلفِ مشک بو کی داستان اور بے نیازی حد سے گزری افسانوں کی عام روش سے ہٹ کر لکھی گئی کہانیاں ہیں۔

ثریا صولت حسین

ثریا صولت حسین ناگپور کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔یوپی کے ایک معزز گھرانے سے تعلق ہونے کے علاوہ ان کے متعلق یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ حضرت امیر مینائی ان کے حقیقی پرنانا تھے اور علاقہ برار کی ایک معتبر ادبی شخصیت امجد حسین خطیب جنھوں نے برار کی تاریخ قلمبند کی ان کی بہو ہونے کا شرف بھی انھیں حاصل تھا۔ ایڈیشنل سیشن جج قاضی صولت حسین کی اہلیہ، ثریا صولت حسین کے افسانوں کا مجموعہ مدوجزر 1986 میں مہاراشٹر اردو اکادمی کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آیا تھا، اس میں اٹھارہ افسانے اور پانچ مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔۔ ان کے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات کی بہترین عکاسی ملتی ہے۔ثریا صولت حسین صاحبہ اپنی عمر کے آخری حصے میں ممبئی میں سکونت پذیر تھیں وہیں ان کا انتقال ہوا۔

کلثوم ممتاز

ناگپور کی خواتین افسانہ نگاروں میں ایک اہم نام ہے۔ان کے ہمعصر قادر نیازی جو بذاتِ خود ایک اہم افسانہ نگار تھے، ان کے رسالہ ماہنامہ ایجوکیشنل ٹائمز اور بعد ازاں ماہنامہ قرطاس، ناگپور کی مجلسِ ادارت میں شامل تھیں۔ چند برس ہوئے ان کا انتقال ہوگیا۔ بیشتر تحریریں معتبر ادبی رسائل میں شائع ہوتی رہی تھیں۔کلثوم ممتاز کے افسانوں کا مجموعہ 'آغوشِ بہار' ان کی زندگی ہی میں منظرِ عام پر آچکا تھا اس میں پچیس افسانے شامل ہیں جن میں اپنے زمانے کے رجحانات اور مسائل کا احاطہ کیا گیا ہے۔

بقول شاغل ادیب: ان کے موضوعات متنوع ہیں۔ ان میں میاں بیوی کے خوشگوار تعلقات، مالدار ساسوں کی اپنے داماووں کے افرادِ خاندان سے بدسلوکی، مال و زر کی ہوس میں کسی دوشیزہ سے شادی رچانا اور اسے ہنی مون کے بہانے کسی اجنبی شہر میں لے جا کر یکہ و تنہا چھوڑ کر فرار ہو جانا۔کلثوم ممتاز کے افسانوں میں عصری زندگی کے مناظر عام ہیں انھوں نے اپنی تحریروں میں صنفِ نازک کے مسائل کو پیش کیا۔ان کے موضوعات میں تنوع پایا جاتا ہے۔

ڈاکٹر قمر جہاں

ڈاکٹر قمر جہاں کا تعلق ناگپور سے تھا۔وہ ایل اے ڈی گرلز ڈگری کالج، ناگپور میں صدر شعبہ اردو اور فارسی تھیں۔ان کے افسانوی مجموعہ دھوپ چھاؤں (2005) اور زندگی تیرے لیے (2012) شائع ہوئے تھے۔ان کے افسانوں میں آس پاس بکھری زندگی کی تصویریں نمایاں ہیں۔ان کے کردار مٹی کی مہک لیے ہوئے ہیں۔سماجی مسائل کو انھوں نے اپنے افسانوں میں فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ان کی کتاب زندگی تیرے لیے کے متعلق ڈاکٹر شرف الدین ساحل لکھتے ہیں: قمر جہاں کے افسانے سماجی حقائق کے تناظر میں ہیں ان کا تانا بانا آئے دن رونما ہونے والے واقعات و حادثات سے تیار ہوا ہے۔اس کتاب میں شامل افسانوں میں زیادہ تر عورت کی اچھی اور بری نفسیات نظر آتی ہے۔قمر جہاں کے افسانوں کے متعلق قاضی مشتاق احمد لکھتے ہیں:

مصنفہ کی کہانیاں پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ان کے اندر ایک ایسی افسانہ نگار سانسیں لے رہی ہے جو معاشرہ کی برائیوں سے بے حد مضطرب ہے اور معاشرے کو بدلنے کی خواہش مند ہے۔انھوں نے سماج سے جڑے ہوئے انسانوں کے مسائل کو بڑی ایمانداری کے ساتھ اپنی کہانیوں میں ڈھالا ہے۔(پیش لفظ، دھوپ چھاؤں)

ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی

ڈاکٹر سروشہ نسرین قاضی 15 نومبر 1957 کو دارووہ ضلع ایوت محل میں پیدا ہوئیں۔ابتدائی تعلیم وہیں حاصل کی۔ وسنت راؤ نایک گورنمنٹ انسٹی ٹیوٹ آف آرٹس اینڈ سوشل سائنسز (اولڈ مارس کالج) میں صدر شعبہ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دے کر سبکدوش ہوئیں۔ انھوں نے کئی افسانے اور مضامین لکھے۔ نیز نہال چند پرتاپ شاہ آبادی کے کلام کو مرتب کر کے نوائے دل کے نام سے شائع کیا۔ان کی کہانیوں کا پہلا مجموعہ 'نشیب و فراز' اور دوسرا مجموعہ یہ ایک تبسم ایک ہی سال کے دوران یعنی 2008 میں منظرِ عام پر آچکے ہیں۔

سروشہ نسرین روایتی رجحان کی نمائندہ افسانہ نگار ہیں ان کے افسانوں کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ حقیقی واقعات پر مبنی ہیں۔ان کے افسانوں میں ماحول اور سماج کی جیتی جاگتی تصویریں نظروں کے سامنے سے گذرتی محسوس

ہوتی ہیں اور پڑھنے والے کو اپنے تجربات اور مشاہدات کا عکس ان افسانوں میں سمویا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ وہ اپنے افسانوں کے لیے مواد اور موضوعات اپنے گردو پیش ہی سے حاصل کرتی ہیں۔ بعض افسانوں میں انھوں نے اپنے گاؤں کے جیتے جاگتے انسانوں اور ان کے مسائل کی حقیقتوں کو افسانے کی شکل میں پیش کیا ہے اور کہیں انھوں نے اپنے نجی تجربات بھی افسانوی انداز میں بیان کردیے ہیں۔ ان کی کہانیوں میں عام زندگی کے بے معنی واقعات بھی کہانی کو نئے معنی سے آشنا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر شگفتہ عارف

ڈاکٹر شگفتہ عارف کا تعلق بہار سے ہے، وہ بھاگلپور، (بہار) میں 21 جنوری 1965 کو پیدا ہوئیں۔ شادی کے بعد ناگپور ان کا وطن ثانی قرار پایا 1983 سے وہ یہیں سکونت پذیر ہیں۔ انھوں نے ناگپور یونیورسٹی سے ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی اسناد حاصل کیں۔ ان کی دو کتابیں شائع ہوئیں جن پر مختلف اردو اکادمیوں نے انھیں انعامات سے نوازا۔ ہنستے زخم (199) حرفِ درد (2017)۔ شگفتہ عارف کے افسانے عمدہ تخلیقات کی مثالیں ہیں۔ ان کی زبان معیاری ہے اور اظہار کے تقاضوں کو پورا کرتی ہے۔ ان کے بیشتر افسانوں میں فنی برتاؤ موضوع کو پوری توانائی کے ساتھ اظہار کی سطح پر نمایاں کرتا ہے۔ ان کے افسانوں کے متعلق ڈاکٹر شرف الدین ساحل لکھتے ہیں:

شگفتہ عارف کے افسانے احساسات و جذبات اور حقائق ومعارف کے آئینہ دار ہیں۔ یہ حقیقت سے بالکل قریب ہیں۔ عصری دور کے اخلاقی جرائم کے خلاف صدائے احتجاج ہیں۔ اگرچہ اس احتجاج میں ان کا لہجہ نرم ہے لیکن اس نرمی میں بھی وہ تاثیر ہے جو قاری کے وجدان کو متحرک کردیتی ہے۔

(ڈاکٹر شرف الدین ساحل، شگفتہ عارف کی افسانہ نگاری، حرفِ درد، 2017، ص16)

صفیہ سلطانہ

صفیہ سلطانہ کا تعلق کھام گاؤں سے ہے۔ انھوں نے وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ناگپور کے معروف جدید شاعر سید یونس (مرحوم) سے رشتہ ازدواج میں منسلک ہونے کے بعد ناگپور ان کا وطنِ ثانی بن گیا۔ صفیہ سلطانہ کی کہانیوں کا ایک مجموعہ 'دل کے آنگن میں' 2003 میں شائع ہوا تھا جس میں گیارہ کہانیاں ہیں۔ ان کہانیوں میں گھریلو زندگی کے واقعات دلچسپ انداز میں بیان ہوئے ہیں۔ صنفِ نازک کے احساسات اور نوعمر لڑکیوں کے جذبات کو انھوں نے اپنی تحریروں میں بڑی عمدگی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ 'جنت سرک گئی' اس افسانے میں ماں کی ممتا سے بیوی کی محبت کی طرف مراجعت کرنے والے نوجوان کی کشمکش کو انھوں نے نہایت دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔

زہرہ جمال

زہرہ جمال ناگپور کی ایک افسانہ نگار ہیں جن کی تحریریں رسائل و اخبارات سے زیادہ انٹرنیٹ کے ذریعے منظرِ عام پر آئیں، اسی لیے ادبی حلقوں میں انھیں خاطر خواہ مقبولیت حاصل نہ ہو پائی۔ نور الصباح کے نام سے ان کی نظمیں اور افسانے انٹرنیٹ پر موجود ہیں۔ ان کے چند افسانے ماہنامہ قرطاس ناگپور میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ صنفِ نازک کی تنہائی اور درد و غم کو انھوں نے پراثر انداز میں نمایاں کیا ہے۔ زبان و بیان کی لطافت اور اپنے مافی الضمیر کو افسانوں کی شکل دینے کی صلاحیت ان کی تحریروں کو قابلِ مطالعہ بناتی ہیں۔ افسانہ رہائی میں اس کے مرکزی کردار کا ئنات کے دکھ کو زہرہ جمال نے ہنر مندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔

> **ودربھ کی ان افسانہ نگار خواتین کی نگارشات میں جہاں اردو افسانہ نگاری کی روایت کی پاسداری کا احساس ہوتا ہے وہیں ان میں فنکار کے ارد گرد موجود زندگی کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔**

نیر شبنم

نیر شبنم ہندی کی مشہور افسانہ نگار ہیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے دیوناگری رسم الخط میں شائع ہوکر خراج تحسین حاصل کرچکے ہیں۔ انھیں اردو زبان وادب سے لگاؤ ہے۔ انھوں نے اپنے چند منتخب افسانے اردو میں ترجمہ کرکے 2002 میں اگرچہ آئینہ نہ ہوتا کے عنوان سے کتابی شکل میں پیش کیے ہیں۔ اس مجموعے میں 5 افسانے ہیں۔ ان کے متعلق ڈاکٹر شرف الدین ساحل رقمطراز ہیں:

ان کا لب ولہجہ ریشم کی طرح ملائم ہے، زبان میں روانی اور برجستگی ہے۔ انھوں نے زیادہ تر رومانی دنیا کے مشاہدے پیش کیے ہیں اور حقائق کو کہانی کا روپ عطا کیا ہے۔

(ڈاکٹر شرف الدین ساحل، 'اگرچہ آئینہ نہ ہوتا'، از پروفیسر نیر شبنم، 2002)

قیصر انجم

قیصر انجم ودربھ کی افسانہ نگاروں میں بہت زیادہ معروف نہیں تاہم ان کی کئی تحریریں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان کے متعلق خلیل انجم لکھتے ہیں: قیصر انجم کے مورثِ اعلیٰ گوالیار کے نامی گرامی لوگوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی والدہ محترمہ بھی اچھے مضامین اور افسانے لکھ لیتی ہیں۔ آج ہم جن مسائل سے دوچار ہیں ان پر قیصر انجم کی گہری نظر ہے کہانی بہت دن ہوئے گرچہ محبت کی بنیاد پر لکھی گئی ہے مگر چھوت چھات اور امیری اور غریبی کی تفریق اس میں واضح طور پر نظر آتی ہے۔ مصنفہ خود ایک جاگیردار خاندان سے تعلق رکھتی ہیں لیکن سماجی مسائل اور معاشرہ کی برائیوں کو سمجھتی ہیں اور بڑی سوجھ بوجھ کے ساتھ انھیں الفاظ کا جامہ پہنا کر پیش کرتی ہیں۔

(ودربھ کی قابلِ ذکر ادیبہ۔ قیصر انجم، از خلیل انجم، مطبوعہ ماہنامہ شیرازہ سرینگر، ص 88-87)

فرزانہ اسد

فرزانہ اسد کی کہانیوں میں عام طور پر کسی سانحے یا سماجی حالات سے دبے کچلے لوگوں کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ 'چوتھی لڑکی' میں ذہنی طور پر معذور ایک لڑکی کو اس کے والدین ہی کے ذریعے سماج کی نظروں سے چھپائے رکھنے کی کوشش۔ اپنی اولاد کے لیے رشتوں کی تلاش میں پیش آنے والی مجبوریوں کی داستان سناتی ہے۔ اسی طرح 'جل اٹھے پھر چراغ' میں ایک لیڈی ٹیچر کی بد ہیئت بیٹی کو تعلیم میں درپیش مسائل کی عکاسی کی گئی ہے۔ فرزانہ اسد کے چند افسانچے بھی مختلف رسائل میں شائع ہوچکے ہیں۔

سلمیٰ نسرین

سلمیٰ نسرین اکولہ میں 1985 میں پیدا ہوئیں۔ انگریزی میں ایم اے کیا اور جرنلزم و ماس کمیونیکیشن کا ڈپلومہ بھی حاصل کیا۔ آن لائن میگزین حادیہ کی نائب مدیرہ ہیں۔ طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے علاوہ انھوں نے کہانیاں بھی لکھیں جن پر اصلاحِ معاشرہ کا رنگ غالب ہے۔ ان کی بیشتر تحریریں ماہنامہ حجاب، بتول، ہلال، پیامِ تعلیم اور امنگ میں شائع ہوئیں۔ ان کا ایک اصلاحی ناول 'صداقتوں کے پاسبان' ماہنامہ حجاب میں قسط وار شائع ہوچکا ہے۔

نیلوفر ناہید

نیلوفر ناہید کے کئی خوبصورت افسانے بزمِ ہند، آسنسول میں شائع ہوئے۔ ان کی تحریروں میں بیانیہ اور کردار نگاری قابلِ تحسین ہے۔

ودربھ کی ان افسانہ نگار خواتین کی نگارشات میں جہاں اردو افسانہ نگاری کی روایت کی پاسداری کا احساس ہوتا ہے وہیں ان میں فنکار کے ارد گرد موجود زندگی کی دھڑکنیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

■

Mohd Asadullah
30, Gulistan Colony
Near Panday Lance
Nagpur 440013 (MS)
Mob.:9579591149

پرویز عادل ماحی

مہر نیم روز

ضلع بجنور میں اردو صحافت کا امام

ہندوستان میں مطبوعہ اردو صحافت کی تاریخ 199 برس پرانی ہے۔ مولوی محمد باقر کے دہلی اردو اخبار کو بیشتر حضرات نے اردو کا اولین اخبار تسلیم کیا ہے۔ کثرت سے زائد تعداد میں اردو مورخین کلکتہ سے شائع ہوئے جام جہاں نما کو اردو صحافت کا نشان اول اور اخبار قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں گربچن چندن کی تحقیق پوشیدہ حقیقت کو بے نقاب کرتی ہے۔ چندن صاحب کے ذریعے متواتر دو برس تک نیشنل آرکائیوز آف انڈیا کے نہاں خانے میں کی گئی تحقیق کے بعد یہ خبر تصدیق کو پہنچی کہ ہندوستان میں مطبوعہ اردو صحافت کا آغاز مارچ 1822 میں جاری ہونے والے اردو کے حقیقی اولین مطبوعہ اخبار 'جام جہاں نما' سے ہوا تھا، جس کے اولین ناشر ہری ہردت اور پہلے مدیر مسئول سدا سکھ لعل تھے۔

اردو صحافت کے مشہور نامور اخبار 'مدینہ' بجنور پر کی گئی تحقیق کے دوران مجھ پر یہ حقیقت واضح ہوئی کہ سرزمین بجنور ہمیشہ سے ہی اردو صحافت کے لیے زرخیز رہی ہے۔ یہاں پر ہر دور میں حق بات کہنے والوں کی نہ صرف فراوانی رہی بلکہ آزادی کی جنگ میں علم بغاوت بلند کرنے والوں میں بھی یہ ضلع پیش پیش رہا۔

اردو صحافت کے فروغ اور اخبارات کی اشاعت سے متعلق جب طویل دوری تک سناٹا چھایا ہوا تھا تب بجنور ضلع کی سرزمین 'مہر نیم روز' کی اشاعت سے دنیائے صحافت کو حق وصداقت کا علم بلند کرنے کا سبق پڑھا رہی تھی۔

مہر نیم روز بجنور ضلع سے شائع ہوا پہلا اردو اخبار تھا جو 1878 میں مردم خیز بستی بجنور سے جاری ہوا تھا۔ جیسا کہ معلوم ہے کہ اختلاف ہر جگہ اور ہر شعبے میں اپنی جگہ بنائے ہوئے ہے اس لیے مہر نیم روز کی تاریخ اشاعت بھی اختلافات سے خالی نہیں لیکن اختلاف سے تحقیق کا در کھلتا ہے۔

ایک مقام پر مہر نیم روز کا سنہ اجرا 1886 لکھا ہوا ہے۔ اردو صحافت پر گہری سمجھ کے لیے مشہور امداد صابری نے اپنی کتاب تاریخ صحافت میں مہر نیم روز کا سنہ اجرا 1879 تحریر کیا ہے۔ شکیل بجنوری اپنی کتاب 'صد سالہ صحافت' میں اس کا سنہ اشاعت 1893 درج کرتے ہیں۔ محمد افتخار کھوکر اپنی کتاب تاریخ صحافت کے صفحہ 59 پر مہر نیم روز کا سنہ اجرا 1877 لکھتے ہیں۔ لیکن اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ کے مولف مولوی محبوب عالم (ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور) مہر نیم روز کا صحیح سنہ اجرا 1878 تحریر فرماتے ہیں وہ لکھتے ہیں کہ ہمارے پاس اس اخبار کا ایک شمارہ 28 ستمبر سنہ 1900 محفوظ ہے۔ اس پر جلد 22 اور نمبر 36 درج ہے اس حساب سے اس کا درست سنہ اجرا نکالنا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ اخبار ہفتہ وار تھا اور 12 صفحات کے بڑے سائز پر چھاپا جاتا تھا۔ ہر صفحے پر تین کالم ہوتے تھے۔ مالک و مہتمم حافظ کریم اللہ تھے۔ یہ کریم المطابع میں چھپتا تھا۔

اخبار کی لوح پر جو اطلاعات پڑھنے والوں کے لیے چھپتی تھیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ مہر نیم روز تین بنیادی اصول پر کام کرتا تھا:

1. اخبار کا چندہ والیان ریاست اور عمائدین سے زیادہ اور کم آمدنی والوں سے کم لیا جاتا تھا
2. اخبار اکثر پڑھنے والوں کو بلا درخواست بھی بھیجا جاتا تھا اور یہ وضاحت کر دی جاتی تھی کہ اخبار کا لینا منظور نہ ہو تو اسے واپس کر دیں۔
3. نامہ نگاروں کو اس شرط کے ساتھ اخبار مفت دیا جاتا تھا کہ وہ ہر ہفتے باقاعدگی سے خبریں اور مضامین بھیجتے رہیں گے۔

پہلے صفحے پر اخبار کے نام کے نیچے فارسی کا یہ قطعہ پابندی سے درج کیا جاتا تھا۔

تابشِ خاور بود در باختر فیروز۔ تا بود بدرالدجی قندیل
مہ از مہر روز
جشن سالانہ وشاہانہ مشود حاصل بد ہر۔ مطبع دہم اہم
مطبع راچواں نوروز روز
تا بعالم مطبع و اخبار را رسم بود۔ مخبر صادق بود اخبار مہر
نیم روز

یہ اخبار طویل عرصے تک جاری رہا۔ سنجیدہ لب و لہجے کا اخبار تھا تاہم پڑھنے والوں کی دلچسپی کے پیش نظر سنسنی خیز خبریں بھی شائع کرتا تھا۔ اس میں حالات حاضرہ پر معلوماتی اور علمی مضامین بھی ہوتے تھے۔ سرکاری پالیسیوں پر جرأت کے ساتھ تنقید کرتا تھا۔

'مہر نیم روز' سرسید کے خیالات کا ہم نوا تھا اور تعلیمی معاملات میں ان کی تائید وحمایت کرتا تھا۔ لیکن اسلامی عقائد و نظریات کے معاملے میں یا علی گڑھ کالج کے منتظمین کی حکومت پرستی کے رویے پر متانت کے ساتھ گرفت بھی کرتا تھا۔ جب علی گڑھ کالج میں بدعنوانیوں کی اصلاح کے لیے سابق طلبا اور ٹرسٹیوں کا گروپ بنا تو 'مہر نیم روز' اس گروپ کا ترجمان بن گیا اور اس تنازعے میں اپنا بھرپور کردار ادا کیا۔

مہر نیم روز کی اشاعت 14 فروری 1881 میں

مولانا محمد حسین آزاد کا ایک مضمون شائع ہوا تھا، جس میں انھوں نے ابتدائی جماعتوں کی درسی کتابوں کی تیاریوں کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کام میں کتنی جانکاہ محنت کرنی پڑی۔ اسی مضمون میں انھوں نے آب حیات کی پذیرائی پر بھی اظہار تشکر کیا ہے اور اس معرکہ آرا تصنیف کے وجود میں آنے کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی۔ وہ لکھتے ہیں

اکثر ذوق وشوق کے وقت سوسائیٹیوں اور کمیٹیوں کے مضامین لکھنے میں اڑ گئے۔ بڑا حصہ عمر گراں بہار کا سر رشتہ تعلیم کی ابتدائی کتابوں کی تصنیف میں صرف ہوا۔ وہ کتابیں نام کو ابتدائی ہیں مگر مجھ سے انھوں نے انتہا سے بڑھ کر محنت لی۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ جب تک آپ پختہ نہ ہو جائیں تب تک بچوں کے مناسب حال کتاب میں نہیں لکھ سکتے۔ پھر انھیں بار بار کاٹنا اور بنانا، لکھنا اور مٹانا، بڈھا ہو کر بچہ بننا پڑا، پھرتے، چلتے، جاگتے، سوتے بچوں ہی کے خیالات میں رہا، مہینوں نہیں برسوں صرف ہوئے۔ جب وہ بچوں کے کھلونے تیار ہوئے۔

خیر، میرے پیارے اہل وطن!

اب یہ تمہاری خدمت ہے۔ وہ تمہارے بچوں کی خدمت تھی مگر کاش وہ دن جو میری عمر کے فصل بہار تھے، طبیعت جوان تھی، جوش چمکتے تھے، مضامین برستے تھے اور رنگ اڑتے تھے ان تصنیفات میں خرچ ہوئے جن سے میرے وطن کی صلاح و اصلاح تھی۔ میں اس حال میں بھی تمھیں بھولا نہیں۔

جو وقت نوکری کے کام سے خالی پاتا تھا اس میں آرام نہ کرتا تھا، بہت کم سوتا تھا اور اپنی معلومات کو اور جو اس سے خیالات پیدا ہوتے تھے لکھتا جاتا تھا۔ اس میں سے یہ اوراق پریشاں نکالے ہیں، جو آب حیات کا جام بن کر تمھاری ضیافت طبع کے لیے حاضر کیے ہیں۔''

مہر نیم روز کمزور ہندوستانیوں کی مضبوط آواز تھا اور معیار صحافت پر آنچ آنے کی شکل میں ذمے داران کی گرفت بھی کرتا تھا۔ اس سلسلے کی دو شہادتیں ہمارے سامنے موجود ہیں

(1) ریاست لنڈھورہ 'مقالہ' افتتاحیہ ریاست لنڈھورہ کی بابت ہے جس میں معاصر اخبار 'جامع العلوم' مراد آباد پر سخت تنقید کی گئی ہے کہ وہ ریاست کے انتظام کے متعلق جھوٹی اور من گھڑت باتیں لکھ رہا ہے۔ علاوہ ازیں ریاست کی رانی صاحبہ کے چال چلن پر اخبار نے جو الزام تراشیاں کی ہیں وہ اخبار نویسی کے پیشے کو پڑھنے والوں کی نظروں میں ذلیل کر دیں گی، کیونکہ اخبار نے اب تک جو کچھ لکھا ہے ان سب باتوں کی 'مہر نیم روز' نے چھان بین کی اور وہ سب کی سب بے بنیاد نکلیں۔ جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس مہم کا مقصد ناجائز فائدہ اٹھانا اور اپنی مٹھی گرم کرنا ہے۔ مضمون میں یہ توقع بھی کی گئی ہے کہ 'جامع العلوم' آئندہ ذاتیات کی بحث سے گریز کرے گا

(2) عدالتوں میں دیوناگری زبان کا مروج ہونا۔ اردو کو دیوناگری کا لباس پہنائے جانے پر اخبار نے نہایت مدلل مضمون لکھا ہے اور ان مسائل کی نہایت تفصیل سے نشاندہی کی ہے جو فوجداری عدالتوں میں اردو کے نہ ہونے سے پیدا ہو گئے ہیں۔ اخبار نے عدالتوں میں اظہارات کا اردو زبان میں لکھنے کی اجازت دینے کا مطالبہ بھی کیا ہے۔

مہر نیم روز مختصر اور طویل خبریں چھاپنے کا بھی اہتمام کرتا تھا کارسپانڈنس کی خبروں کو بھی اہمیت دی جاتی تھی۔ تار سے ملنے والی خبروں کو بھی اہمیت کے ساتھ شائع کیا جاتا تھا۔ انتخاب اخبارات کے ذیل میں مختصر اور طویل خبروں کے ضمنی عنوانات سے ملکی اور غیر ملکی خبریں درج ہیں بعض خبریں عجیب وغریب ہیں۔ مثلاً مراد آباد کے شفاخانے میں ایک شخص علاج کے لیے ایسا آیا ہے جس کی شکل بالکل کتے کی مشابہ ہے۔

خبروں کی زبان ادبی بھی ہوتی تھی۔ 12'13 دسمبر کو دہلی میں اس قدر کثرت سے بارش ہوئی کہ صدہا مکانات سر بسجود ہو گئے۔ اخبار میں سنی سنائی اور غیر مصدقہ خبریں بھی چھپتی تھیں، ایک جگہ ایک عالیشان الٹا مکان ہے اس کی چھت نیچے ہے اور دروازہ آسمان کی طرف۔ دور سے دیکھنے پر چکا چوند تو لگ ہی جاتی ہے لیکن اوپر جا کر کھڑکی وغیرہ اور راستے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی سر کے بل چل رہے ہیں۔ اس عجیب وغریب مکان کو ایک روسی کاریگر نے بنایا ہے اور کیفیت یہ ہے کہ جب اور جہاں چاہیں اس مکان کو لے جا سکتے ہیں۔

'منقولات' کے عنوان سے ایک مضمون 'وسط ایشیا میں روسی انتظام' نہایت معلومات افزا ہے مضمون سے اس زمانے میں روس کے صحافیوں کے حالات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔ ایک واقعہ جو اودھ اخبار کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے کہ روس میں ایک سول اخبار کے ایڈیٹر نے ایک کرنل کے خلاف کچھ سچی باتیں لکھ دیں۔ کرنل ریوالور لے کر ایڈیٹر کو قتل کرنے اس کے مکان پر گیا۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے ارادے کو عملی جامہ پہناتا ایڈیٹر نے اسے طمانچہ مار کر گرا دیا اور خود بھاگ کر روسی گورنر جنرل کے پاس گیا اور حفاظت کی درخواست کی لیکن وہاں سے اسے کوئی مدد نہ ملی۔ جب کرنل کو پتہ چلا کہ ایڈیٹر ہائی کورٹ میں انصاف طلب کرنے پہنچ گیا ہے تو اس نے وہاں جا کر ایڈیٹر کو قتل کر دیا۔ کرنل کو دو سال کی سزا ہو گئی لیکن سینٹ پیٹر برگ سے کرنل کی سزا معاف ہو گئی اور اسے عہدے سے ترقی دے دی گئی۔

'کارسپانڈنس' کے عنوان سے خبریں چھاپی جاتی تھیں۔ ایک خبر انڈین ڈیلی ٹیلی گراف کے نمائندے مسٹر جیمس کے قبول اسلام کی بھی ہے خبر میں بتایا گیا ہے کہ 26 سالہ مسٹر جیمس لندن میں پیدا ہوئے تھے۔ والد کا نام گلاس کن تھا ان کی تربیت وتعلیم بمبئی میں ہوئی، انھوں نے اپنا اسلامی نام علی تجویز کیا

اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ کے مولف مولوی محبوب عالم (ایڈیٹر پیسہ اخبار لاہور) لکھتے ہیں کہ مہر نیم روز 1903 میں بجنور سے ہی نئے نام 'عروج' سے شائع ہوا۔ منشی نعیم اللہ اس کے مالک ومہتمم تھے۔ سالانہ چندہ چار روپیہ تھا۔

صد سالہ صحافت ضلع بجنور کے مؤلف شکیل بجنوری نے اپنی کتاب کے صفحہ 81 پر مہر نیم روز کی تعداد اشاعت 300 اور فی پرچہ قیمت 2 پیسہ تحریر کیا ہے انھوں نے 14 فروری 1893 کو جاری شمارے کا عکس بھی کتاب میں چھاپا ہے۔ مشہور زمانہ کتاب 'اردو صحافت کا سفر' کے مصنف گربچن چندن اپنی کتاب کے صفحہ 137 پر مہر نیم روز کی تعداد اشاعت علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ سے زائد تحریر کرتے ہیں۔

اردو صحافت کا اولین مطبوعہ اخبار جام جہاں نما تھا کہ دہلی اردو اخبار۔ اس پر کافی کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جاتا رہے گا لیکن اس پر اختلاف رائے نہیں کہ اردو کے لیے شہید ہونے والے اولین صحافی 'مولوی محمد باقر' تھے اور جب ملک میں اردو صحافت نے اپنے قدم بڑھائے تب محض چند برس بعد ہی بجنوری سر زمین سے جاری ہوا 'مہر نیم روز' اردو صحافت کے ماتھے کا جھومر بن کر چمک رہا تھا اور یہاں سے یکے بعد دیگرے اخبارات کی اشاعت کا سلسلہ قائم ہو گیا تھا اس طور ہم کہہ سکتے ہیں کہ 'مہر نیم روز' نہ صرف ضلع بجنور میں اردو کا اولین اخبار ہے بلکہ ضلع میں اردو صحافت کا امام کہلانے کا شرف بھی 'مہر نیم روز' کو حاصل ہے۔

ماخذ ومصادر

1 اردو صحافت کی ایک نادر تاریخ، لاہور پاکستان: مولوی محبوب عالم، مقدمہ وحواشی: طاہر مسعود
2 اردو صحافت کا سفر: گربچن چندن
3 صد سالہ صحافت ضلع بجنور: شکیل احمد خاں شکیل
4 تاریخ صحافت: محمد افتخار کھوکھر

■

Pervez Adil Mahi
Qazi Sarai, Nagina
Distt.: Bijnor - 246722 (UP)
Mob.:9412568028
Email.: parvezadilmahi123@gmail.com

آہ! بلبلِ دکن
پروفیسر فاطمہ پروین

نشاں زیدی

پروفیسر فاطمہ بیگم نہ صرف ایک بہترین مقررہ تھیں بلکہ انہوں نے تحقیقی و تنقیدی کام بھی کیا۔ان کی ادبی وعلمی خدمات ہمارے لیے اہم سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلاسیکی ادب اوردکنی ادب پر ان کا اہم کام ہے۔ان کا خیال تھا کہ استاد کبھی رٹائرڈ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ سبکدوشی کے بعد بھی ان کا درس وتدریس کا کام جاری رہا اور وہ امبیڈکراوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہیں۔

پروفیسر فاطمہ پروین تلنگانہ وآندھرا پردیش کی ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی عظیم الشان شخصیت تھیں وہ ایک قابل پروفیسر تھیں۔شعلہ بیان اور بے باک مقررہ کی حیثیت سے پورے ملک میں ان کی شناخت تھی۔ان کا مطالعہ بہت وسیع اور غیر معمولی تھا۔زبان وادب کے مختلف موضوع پر گفتگو کرتیں تو ذہنوں کو منور وروشن کر دیتیں۔

پروفیسر فاطمہ بیگم (30دسمبر 1953۔27اگست 2021) کو تحریری اور تقریری صلاحیت ورثے میں ملی تھی۔ ان کا تعلق حیدرآباد کے ایک ایسے علمی گھرانے سے تھا جہاں علم وادب کا ہمیشہ چرچہ رہا۔ان کی والدہ کے دادا خود شاعر تھے اوران کی والدہ کی ایک پھوپھی بھی شاعری کرتی تھیں۔یعنی آج سے سو برس پہلے بھی فاطمہ پروین کے خاندان میں خواتین کو زیور تعلیم سے آراستہ کیا جا تا تھا۔ان کی والدہ کے دادا مرزا غلام سجادا شہر کو حیدرآباد میں'انیس دکن' کہا جاتا تھا۔حیدرآباد کا جو مقبول عام رسالہ ہے'سب رس'اس کے 1938 کے شمارے میں ایک مضمون ہے جس میں انھیں انیس دکن قرار دیا گیا ہے۔ان کے کئی مراثی ملتے ہیں۔ان کے یہاں مرد وخواتین دونوں ہی ادب سے بڑی دلچسپی رکھتے تھے۔اورنوحے اور مرثیے لکھتے رہتے تھے۔سبھی کے کلام، مجموعے کی شکل میں موجود بھی ہیں۔یعنی فاطمہ پروین کے دادا کا کلام بھی ملتا ہے ان کی والدہ نے اپنی زندگی میں اپنے دو مجموعے چھپوائے بھی تھے۔تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ پرانے زمانے میں اتنا تعلیم کا رواج نہ ہونے کے باوجود فاطمہ پروین کے گھرانے میں تعلیم وتربیت سے خصوصی دلچسپی لی جاتی تھی۔ ان کی والدہ عربی فارسی،انگریزی حساب سب جانتی تھیں۔کسی مدرسے میں انھوں نے تعلیم حاصل نہیں کی لیکن گھر پر رہتے ہوئے سب سیکھا۔اس ماحول کا اثر فاطمہ پروین جیسی ذہین وحساس لڑکی پر پڑنا فطری تھا اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کم عمری سے ہی لکھنے کی ابتدا کی۔ شادی کے بعد بھی ان کو ادبی ماحول ملا ان کے شوہر ڈاکٹر مجید اللہ صدیقی سنگھی کالج آف کامرس اینڈ سائنس میں وائس پرنسپل تھے، مجید اللہ صدیقی شاعری کرتے تھے، ان کا شعری مجموعہ'درد کے اتھاہ سمندر میں' کو اردو حلقے میں کافی پذیرائی ملی۔وہ الگ بات ہے کہ کچھ برس گھریلو مصروفیت کے سبب فاطمہ پروین کا لکھنے پڑھنے کا کام کچھ وقت کے لیے رک گیا اور انھوں نے گھر کو ترجیح دی۔ان کا خیال تھا کہ بچوں کی پرورش اور تربیت جتنی اچھی طرح سے ماں کر سکتی ہے اور کوئی نہیں۔یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تقریباً بیس سال تک سمینار وغیرہ میں شرکت نہیں کی جب ان کے بچے بڑی کلاس میں آ گئے تو انھوں نے اپنی ادبی سرگرمیاں جاری کیں۔لیکن یہ ان کی صلاحیت ہی تھی کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد بھی ادبی دنیا میں ان کا پر جوش استقبال کیا گیا اور ان کی پذیرائی ہوئی۔انھوں نے تقریباً سو قومی اور بین الاقوامی سیمینار میں شرکت کی ہے۔ بیرون ممالک کے سفر کیے ہیں۔

پروفیسر فاطمہ بیگم نہ صرف ایک بہترین مقررہ تھیں بلکہ انھوں نے تحقیقی وتنقیدی کام بھی کیا۔ان کی ادبی وعلمی خدمات ہمارے لیے اہم سرمائے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ کلاسیکی ادب اوردکنی ادب پر ان کا اہم کام ہے۔ان کا خیال تھا کہ استاد کبھی رٹائرڈ نہیں ہوتا یہی وجہ ہے کہ سبکدوشی کے بعد بھی ان کا درس وتدریس کا کام جاری رہا اور وہ امبیڈکراوپن یونیورسٹی کے شعبۂ اردو سے وابستہ رہیں۔محترمہ کی شخصیت توازن اور تواضع کا امتزاج تھی۔ان کی اب تک دس تصانیف منظر عام پر آ چکی ہیں، ان کی پہلی تصنیف 1980 میں'اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ'منظر عام پر آئی۔علاوہ ازیں'دکنی ادب ایک مطالعہ'،'اردو زبان وادب اور تہذیبی اقدار کا تحفظ اور خواتین'،'کلاسیکی شاعری کا مطالعہ'،'دکن اور ہند اسلامی تہذیب' اور'پروفیسر مغنی تبسم ایک روشن چراغ تھا نہ رہا'، بہت اہم ہیں۔ان کی تصانیف کو انعامات واعزازات سے بھی نوازہ گیا۔ اردو اکیڈمی آندھرا پردیش، تلنگانہ اسٹیٹ اردو اکیڈمی، مغربی بنگال اردو اکیڈمی نے ان کی تصانیف پر ایواڈ سے نوازا۔

فاطمہ پروین جہاں اپنے طلبا سے شفقت ومحبت سے پیش آتی تھیں وہیں انھیں والدین اور اساتذہ کی کرم فرمائی کا بھی احساس رہتا تھا حالانکہ والدین اور اساتذہ کی محبت اور شفقت بے لوث ہوتی ہے اور وہ کسی بدلے کی متقاضی نہیں ہوتی،لیکن ایک حساس اور باشعور طالب علم کی حس یہ کہتی ہے کہ وہ اپنے والدین اور اساتذہ کا مقروض ہے اور وہ بھی ان کے لیے کچھ کرے۔اسی سوچ کے تحت انھوں

نے اپنی والدہ کو خراج عقیدت پیش کرنے کی غرض سے ان کا مجموعۂ کلام مرتب کیا اور اپنے استاد کا بھی ایک مجموعہ چھپوایا۔ علاوہ ازیں فاطمہ پروین کو جب آصف سابع کی ادبی خدمات پر خطبے کے لیے ایک کانفرنس میں بلایا گیا تھا تو اس کی تیاری کرنے کے لیے وہ جب سالار جنگ لائبریری گئیں تو ان کو پتہ چلا کہ نواب میر عثمان علی خاں آصف سابع کی پانچ کلیات ہیں، اس میں ایک سو پچیس، ایک سو پچیس غزلوں پر محیط پانچ مجموعہ جات ہیں تو ان کو خیال آیا کہ اپنے محسن بادشاہ کے لیے بھی وہ کچھ کریں۔

'اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ' پروفیسر فاطمہ بیگم کی اہم تصنیف ہے جس میں انھوں نے اختر انصاری کی شاعری کا مطالعہ خوبی کے ساتھ کیا ہے۔ ساتھ ہی اختر انصاری کے نظریۂ ادب سے بھی متعارف کرایا ہے اور ان کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہوئے ان کی شاعری کے ہر دور کا احاطہ کیا ہے۔ اختر انصاری اردو کے ایک اہم نقاد ہیں ابتدا میں وہ 'ادب برائے ادب' کے قائل تھے اور ان کا نظریہ تھا کہ ادب خالص جمالیاتی اور فنی اصولوں پر مبنی ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ ساتھ ان کے نظریے میں تبدیلی آتی گئی اور وہ ترقی پسند تحریک کے حامی ہو گئے اور 'ادب برائے زندگی' کو اپنایا فاطمہ بیگم اختر انصاری کے نظریے سے اس طرح متعارف کراتی ہیں:

''اختر انصاری ابتدا میں ادب برائے ادب کے حامی تھے اور ان کی حمایت انتہاپسندی کی حد تک پہنچ گئی۔ ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہونے کے بعد انھوں نے ادب برائے زندگی کے نظریے کو سختی کے ساتھ اپنایا لیکن ساتھ ہی ساتھ ادب کی صناعت اور حسن کو نظر انداز نہیں کیا۔ اپنی ادبی ڈائری میں بھی انھوں نے اپنے متوازن موقف کی جا بجا وضاحت کی ہے۔ یہ موقف قریب قریب وہی ہے۔''

(اختر انصاری کی شاعری کا تنقیدی مطالعہ از فاطمہ پروین، ص 19)

پروفیسر فاطمہ نے اپنے تحقیقی کام کے تحت اختر انصاری کی قطعہ نگاری، غزل گوئی اور نظم نگاری سے بھی متعارف کرایا ہے اور ان کے فن پر بحث بھی کی ہے اور ان کا اردو ادب میں مرتبہ بھی متعین کیا ہے۔

دکنی ادب پر پروفیسر فاطمہ کا اہم کام ہے 'دکنی ادب اور ہند اسلامی تہذیب' اور 'دکنی شاعری میں عورت کی تصویر کشی' ان کا تحقیقی کام ہے۔ 'دکنی شاعری میں عورت کی تصویر کشی' کے تحت انھوں نے ان شعرا کا ذکر کیا ہے جنھوں نے عورت کو اپنی شاعری میں موضوع بنایا ہے ان کا خیال ہے کہ عورت صرف محبوبہ ہی نہیں ہے اور نہ ہی صرف خوبصورت ہوتی ہے بلکہ جس طرح زندگی میں عورت کی مختلف اور متعدد تصاویر ہیں اسی طرح دکنی شعرا نے ان تمام کو اپنی تحریر میں جگہ دی ہے وہ صرف صنف نازک یا محبوبہ نہیں ہے کہ خوبصورت رہے بلکہ وہ جیتی جاگتی ہے۔ مصنفہ نے اپنی بات ثابت کرنے کے لیے وجہی، نصرتی اور ہاشمی کی تصانیف سے مثالیں بھی دی ہیں۔ کہ کون سی خاتون کس فن میں مہارت رکھتی تھی۔

'دکنی ادب اور ہند اسلامی تہذیب' ان کی اہم کتاب ہے جس میں مصنفہ نے دکنی ادب اور ہند اسلامی تہذیب پر تفصیل سے بات کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ہماری تہذیب پر ہندو رسم و رواج کا کتنا اثر ہے۔

پروفیسر فاطمہ پروین نے ترجمہ نگاری میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ انھوں نے کئی اہم تیلگو کتابوں کو اردو کے قالب میں ڈھال کر پیش کیا۔ انھوں نے ڈاکٹر گوپی کی تیلگو نظموں کو جو 'نانی لو' کے نام سے ہیں اردو میں 'ننھی نظمیں' کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ بھی انھوں نے علمی ضرورت کے تحت کئی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا۔ وہ ترجمے کے فن سے بخوبی واقف تھیں۔ دور جدید میں ترجمہ نگاری ایک پروفیشن بن گیا ہے۔ یہ ایک ایسا فن ہے جس میں فنی اور تکنیکی مہارت کے ساتھ دو زبانوں سے واقفیت ضروری ہے۔ یعنی مترجم کے لیے ضروری ہے کہ اسے دو زبانوں کی معلومات بخوبی ہو۔ ایک وہ زبان جس سے وہ ترجمہ کر رہا ہو اور دوسری وہ جس زبان میں ترجمہ کیا جا رہا ہو۔ چنانچہ ترجمے کا فن ایک مشکل ترین فن ہے اس میدان میں قدم رکھنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ پروفیسر فاطمہ پروین ترجمے کے فن سے بخوبی واقف تھیں اور وہ اس کی دشوار راہ سے بڑی آسانی سے گزر جاتی تھیں۔ ان کی ترجمہ کی ہوئی تحریروں کی یہ خوبی ہے کہ وہ کسی بھی زاویے سے نہیں لگتیں کہ یہ کسی دوسری زبان سے ترجمہ کی گئی ہیں۔ ان کی ترجمہ نگاری کے بارے میں پروفیسر مظفر شہ میری لکھتے ہیں:

''پروفیسر فاطمہ کے ترجمہ کو تین بڑے حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ اولاً من و عن ترجمہ، ثانیاً آزاد ترجمہ اور ثالثاً نئے ترجمے۔ من و عن ترجمہ میں پروفیسر فاطمہ نے لفظ بہ لفظ نظم کی روح کے ساتھ ترجمہ کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ تیلگو الفاظ نکال کر ان کی جگہ اردو الفاظ رکھ دیے ہیں۔''

(پروفیسر فاطمہ پروین کی ترجمہ نگاری از پروفیسر مظفر شہ میری مشمولہ مضمون گواہ اردو ویکلی حیدر آباد، ص 15)

پروفیسر فاطمہ پروین نے نصابی کتابوں کی ترتیب میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ فاطمہ پروین نے نثر کی مختلف اصناف میں تو اپنے جوہر دکھائے ہی انھوں نے شاعری میں بھی طبع آزمائی کی ان کی غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوئیں۔ مثال کے طور پر ان کی غزل کے چند اشعار پیش ہیں۔

اب تک جو ہو چکا ہے اسے بھول جائیے
نفرت کو ختم کر کے محبت بڑھائیے
منزل کے درمیان میں دار و رسن بھی ہے
ہر اک قدم یہ سوچ کے آگے بڑھائیے
آئینہ ہر کسی کو دکھانا نہیں درست
کردار آئینہ ہو تو اس کو دکھائیے
راہ وفا میں ہوش کے تابع ہی رکھیے جوش
جذبات جس قدر بھی ہوں ممکن دبائیے
پھر کیجیے جہان میں جنت کی جستجو
پہلے سبھی سے پیار کے رشتے نبھائیے
بلبل کی طرح میرا چہکنا ہے خوش گوار
دو دن کی زندگی ہے تو ہنسیے ہنسائیے
پروین چاند تاروں کی محفل کے فیض سے
اٹھ کر کسی غریب کا گھر جگمگائیے

افسوس صد افسوس اردو ادب کی یہ چہکتی اور کانوں میں رس گھولنے والی بلبل 27 راگست 2021 کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی۔ چند روز قبل ایک ادبی واٹس ایپ گروپ پر چھوٹا سا میسج پڑھا تھا 'میں بیمار ہوں' اس کے بعد فون پر کئی مرتبہ رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن بات نہیں ہو پائی۔ کیا خبر تھی کہ یہ جانکاہ خبر سننے کو ملے گی۔ ان کی باتیں، ملاقاتیں ایک یاد بن کر ذہن میں گردش کرنے لگیں۔ ان کے معرکۃ الآرا کلیدی خطبات یاد آنے لگے جو مختلف سیمناروں اور کانفرنس میں سنے تھے۔ کیا سماں ہوتا تھا لگتا تھا کہ وہ بولتی رہیں اور ہم سنتے رہیں۔ اللہ ان کی مغفرت فرمائے۔

■

Dr. Nisha Zaidi
B-63/S-2 DLF Colony
Sahibabad, Distt.: Ghaziabad - 201005 (UP)
Mob.: 9873297860

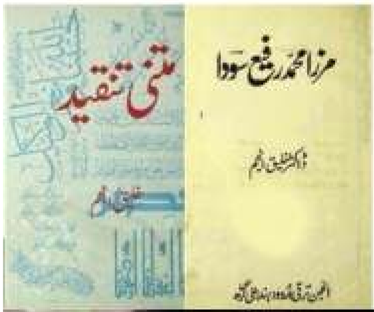

اپنی ذات میں انجمن

خلیق انجم

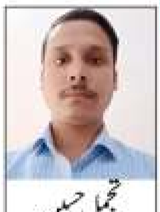

تجمل حسین

خلیق انجم کی پیدائش 22 دسمبر 1935 کو دہلی میں ہوئی ان کا پیدائشی نام غلام احمد تھا لیکن بچپن میں جب انھیں غلام غلام کہہ کر پکارا جانے لگا تو ان کا نام بدل کر خلیق احمد کر دیا گیا۔ بعد میں جب ادب سے ان کو دلچسپی ہوئی تو انھوں نے اپنا ادبی نام خلیق اقبال رکھا، لیکن اپنے بچپن کے دوست ڈاکٹر اسلم پرویز کے مشورے پر خلیق اقبال کو بدل کر خلیق انجم کر دیا اور یوں ادب کی دنیا میں خلیق انجم کے نام سے مشہور ہو گئے۔

ڈاکٹر خلیق انجم کا خاندانی پس منظر یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد روہیلے پٹھان تھے اور پیشے کے اعتبار سے سپاہی اور ننھیال علم و حکمت سے آراستہ ایک علمی گھرانا تھا اور پیشہ تدریس سے وابستہ۔ بچپن میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اس لیے ان کا بچپن بہت زیادہ خوشحال نہ تھا۔ شوہر کے انتقال کے بعد ڈاکٹر خلیق انجم کی والدہ قیصر سلطانہ نے اپنی اولاد کی پرورش و پرداخت میں جس ذہانت، متانت، بردباری اور عزم و استقلال کا مظاہرہ کیا تھا خلیق انجم کی ترقی و اولوالعزمی میں ماں کے اس کردار کا بہت بڑا دخل نظر آتا ہے۔ اینگلو عربک ہائر سیکنڈری اسکول دہلی میں تعلیمی سلسلہ شروع ہوا تو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ہوتا ہوا ان کا یہ تعلیمی سفر دہلی یونیورسٹی کے شعبہ اردو تک پہنچا۔ دہلی یونیورسٹی میں انھوں نے ایم۔اے مکمل کرنے کے بعد مرزا مظہر جان جاناں کی شخصیت پر پروفیسر خواجہ احمد فاروقی کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کا مرحلہ مکمل کیا اور اس طرح اعلی تعلیم سے آراستہ ہو کر اپنی تالیفات و تصنیفات نیز دیگر علمی خدمات کی بدولت علم و ادب کے آسمان پر خلیق انجم کی شکل میں درخشاں ستارہ بن کر چمکے۔

> ڈاکٹر خلیق انجم کا خاندانی پس منظر یہ ہے کہ ان کے آبا و اجداد روہیلے پٹھان تھے اور پیشے کے اعتبار سے سپاہی اور ننھیال علم و حکمت سے آراستہ ایک علمی گھرانا تھا اور پیشہ تدریس سے وابستہ۔ بچپن میں ہی باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا اس لیے ان کا بچپن بہت زیادہ خوشحال نہ تھا۔

خلیق انجم کی شخصیت کا مطالعہ کرنے اور ان کی ادبی، تنقیدی و تحقیقی کتابوں پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک کثیر الجہات شخصیت کے حامل تھے ان کی تالیفات و تصنیفات کا دائرہ کسی ایک صنف تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی تحریریں اردو ادب کی مختلف اصناف مثلاً ترجمہ، تنقید، تحقیق، صحافت اور خاکہ نگاری وغیرہ دیگر اصناف پر بھی مشتمل ہیں۔ ان کی کتابوں کی تعداد ساٹھ سے بھی زیادہ ہے اس لیے ان سب کا تذکرہ کرنا یہاں ممکن نہیں لیکن اہم کتابیں جنھوں نے ادبیات کی دنیا میں ان کا نام روشن کیا ان میں پانچ جلدوں میں خطوط غالب کی تدوین، آثار الصنادید، معراج العاشقین، مرزا محمد رفیع سودا اور متنی تنقید وغیرہ بطور خاص قابل ذکر ہیں۔

خلیق انجم کی بنیادی خصوصیات میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ غالب شناس ہیں۔ غالب کے حوالے سے اردو ادب میں ویسے تو مختلف لوگوں نے کام کیا ہے لیکن غالبیات کے باب میں خلیق انجم کا کام سب

سے مختلف ہے۔ غالب سے ان کی ذہنی وعلمی مناسبت کا ہی نتیجہ ہے کہ ان کے گہر بار قلم سے غالبیات کے باب میں اہم اضافے ہوئے۔ پانچ جلدوں میں خطوط غالب کا کام اتنا اہم اور تفصیلی ہے کہ یہی واحد کام انھیں ماہرین غالبیات کی صف میں نمایاں مقام عطا کرنے کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے نہ صرف خطوط غالب کو پہلی مرتبہ مکمل اور تصحیح شدہ متن کے ساتھ پیش کیا ہے بلکہ غالب کی زندگی اور ان کی دیگر ادبی کاوشوں کا بھی مختلف کتب کی صورت میں تحلیل و تجزیہ کیا ہے۔

خطوط غالب کی ترتیب کے علاوہ بھی انھوں نے غالبیات کے ضمن میں چار مستقل کتابیں مرتب کیں۔ غالب کی نادر تحریریں 1961 غالب اور شاہان تیموریہ 1974 غالب کچھ مضامین 1991 غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ 2004۔ ان کے علاوہ اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں انتخاب خطوط غالب کے نام سے شائقین غالب کی علمی تشنگی کو دور کرنے کے لیے پیش کیا۔

غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ نامی کتاب غالبیات کے باب میں اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں خلیق انجم نے بنیادی طور پر غالب کے سفر کلکتہ اور کلکتے میں پیش آنے والے ادبی معرکے کو دیگر سابقہ اور لاحقہ کے ساتھ جوڑ کر اس طرح تفصیل سے بیان کیا ہے کہ غالب کی زندگی کے جملہ نقوش ہماری آنکھوں کے سامنے گردش کرنے لگتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب ابھی ہمارے دور کے ہیں اور یہ تمام واقعات ابھی حال میں پیش آئے ہیں۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ غالب نے کلکتہ میں قیام کے دوران کلکتے کے تین مشاعروں میں شرکت کی تھی۔ پہلا مشاعرہ یکم جون 1828، دوسرا مشاعرہ 8 جون 1828 اور تیسرا مشاعرہ 15 جون 1828 کو منعقد ہوا تھا۔

خلیق انجم کے خزینہ تصنیفات و تالیفات میں متنی تنقید بہت انمول ہے۔ اس کتاب کے ذریعے ڈاکٹر خلیق انجم نے پہلی بار منظم شکل میں اردو والوں کو متنی تنقید کے اصول وفروع سے کلی طور پر متعارف کرایا۔ ورنہ ہمارے یہاں حالت یہ تھی کہ متنی تنقید اور تدوین متن کی باریکیوں میں لوگ ایسے الجھے ہوئے تھے کہ دونوں میں فرق کرنا عام قاری کے لیے تو دور کی بات تھی بعض اہم ناقدین اور محققین کے لیے بھی دشوار جن تھا۔ اس کا اندازہ ہم ڈاکٹر گیان چند جین کی اس تحریر سے لگا سکتے ہیں:

خلیق انجم نے انگریزی اصطلاحوں Textual Criticism کا ترجمہ کر کے متنی تنقید کے نام سے کتاب لکھی۔ متنی تنقید سے ذہن قدر بلندی کی طرف جاتا ہے اور التباس کا موجب بنتا ہے، کسی درس گاہ میں ایک صاحب نے امتحان کا پرچہ بنایا اور اس کا مسودہ مجھے دکھایا۔ انھوں نے غلط فہمی کی بنا پر ایک سوال لکھا تھا۔ مندرجہ ذیل عبارت کی متنی تنقید کیجیے ان کی مراد محض تنقید تھی جو متن کی لفظیات پر بطور خاص مرکوز ہو۔ تنقید کے لفظی اور صحیح معنی یہی معلوم ہوتے ہیں اس لیے اس فن کو متنی تنقید نہ کہہ کر تدوین متن یا متنی تدوین کہنا بہتر ہے۔

(بحوالہ تحقیق کا فن: ص 427)

ڈاکٹر گیان چند جین کی کتاب کے مذکورہ اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ متنی تنقید کی اصطلاح سے نالاں ہیں ان کا ماننا ہے کہ اس سے التباس کا خطرہ ہے اور اسے دراصل متنی تنقید کا نام نہ دے کر تدوین متن یا متنی تدوین کا نام دینا چاہیے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا واقعی متنی تنقید محض انگریزی اصطلاح کا ترجمہ ہے اور متنی تنقید دراصل تدوین متن یا متنی تدوین کا ہی دوسرا نام ہے۔ پروفیسر گیان چند جین کے مذکورہ اقتباس میں متنی تنقید کے حوالے سے سب سے اہم سوال یہ اٹھایا گیا ہے کہ اس اصطلاح سے التباس کا خطرہ ہے لیکن کیا یہ بات صحیح ہے کہ محض التباس کے خطرے کی وجہ سے کسی اصطلاح کا استعمال ترک کر دینا چاہیے؟ میں سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے اصول پر عمل کرنے کا سلسلہ اگر شروع کر دیا جائے گا تو پھر ادبیات کی دنیا میں موجود اکثر مصطلحات سے ہمیں ہاتھ دھونا پڑے گا۔ کیونکہ ہر کس و ناکس کے غلط استعمال سے کسی بھی اصطلاح کے ترک استعمال کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم تقریباً تمام مصطلحات علمیہ سے دستبردار ہو جائیں۔ یہاں اس بات کا تذکرہ ضروری ہے کہ تدوین متن میں سب سے بنیادی اور اہم کام متنی تنقید کا ہی ہے۔ تنقید متن کی اہمیت کو ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب متنی تنقید میں بڑی خوبی کے ساتھ بیان کیا ہے چنانچہ وہ متنی تنقید کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''متنی تنقید نام ہے اس متن کی بازیافت کا جو مصنف نے لکھا تھا یا لکھنا چاہا تھا، اور اگر کسی وجہ سے متن میں کچھ غلطیاں راہ پا گئی ہیں تو انھیں درست کرنا متنی نقاد کا کام ہے۔'' (ایضاً ص 27)

یہاں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ ادبی تنقید اور متنی تنقید دونوں کے الگ میدان ہیں چنانچہ اس کی وضاحت کرتے ہوئے خلیق انجم اپنی کتاب متنی تنقید میں رقم طراز ہیں:

''تنقید ادبی ہو یا متنی دونوں سائنس ہیں، دونوں کے کچھ اصول اور ضابطے ہیں۔ ادبی تنقید کے اصول زمانے کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں جبکہ متنی تنقید کے اصول نہیں بدلتے البتہ اسے زیادہ سے زیادہ سائنٹفک بنانے کے لیے مزید اصولوں کا اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ ان دونوں کی راہیں کبھی بالکل ایک اور کبھی ایک دوسرے سے بالکل

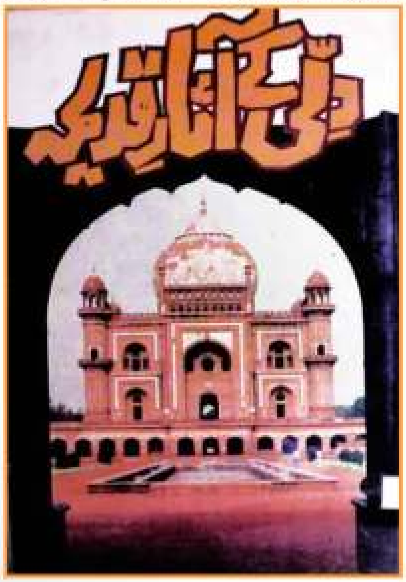

الگ ہوتی ہیں۔ دونوں کا مقصد سچائی کی تلاش ہے۔ دونوں اپنے مواد کی تشریح اور تجزیہ کرتے ہیں لیکن متنی نقاد کو اس سے بحث نہیں کہ جو متن اس نے تیار کیا ہے وہ دل کش ہے یا غیر دلکش۔ وہ ادبی معیار پر پورا اترتا بھی ہے کہ نہیں۔ اگر چہ متنی نقاد کو ادبی تنقیدی صلاحیتوں سے پورا پورا فائدہ لینا ہوتا ہے لیکن پسند نا پسند کا اسے حق نہیں ہے۔'' (ایضاً ص 30)

ڈاکٹر خلیق انجم کی مذکورہ وضاحت سے یہ بات نکل کر سامنے آتی ہے کہ متنی اور ادبی تنقید کے حدود اور امتیازات مختلف ہیں۔ اس میں خلیق انجم نے متنی اور ادبی تنقید کے

خلیق انجم کی زندگی اور علمی و ادبی سفر کے مطالعے سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ ان کی زندگی میں دهلی اور دهلی سے وابستہ افراد کا بہت بڑا دخل تھا ان کی جملہ تصنیفات پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ یقین میں بدل جاتا ہے کیونکہ ان کے علمی گوشے کا بڑا حصہ غالب اور سرسید کی زندگی اور تالیفات و تصنیفات پر محیط ہے اور ان دونوں کا تعلق براہ راست دهلی سے ہی ہے. سر زمین دهلی اور یہاں موجود آثار قدیمہ سے خلیق انجم کو خصوصی دلچسپی تھی۔

حدود کا تعین جس طرح کیا ہے اس سے ان دونوں کے مابین موجود امتیازات کی وضاحت بھی ہوتی ہے اور دونوں میں موجود مشابہت کی صراحت بھی۔ بہر کیف یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ متنی تنقید ادبی تنقید کے بہ نسبت زیادہ معروضی ہے اس لیے اس کا تعلق بڑی حد تک تکنیکی امور سے ہے۔

خلیق انجم کی زندگی اور علمی و ادبی سفر کے مطالعے سے ہمیں اندازہ ہوا ہے کہ ان کی زندگی میں دہلی اور دہلی سے وابستہ افراد کا بہت بڑا دخل تھا ان کی جملہ تصنیفات پر نظر ڈالنے سے یہ اندازہ یقین میں بدل جاتا ہے کیونکہ ان کے علمی گوشے کا بڑا حصہ غالب اور سرسید کی زندگی اور تالیفات وتصنیفات پر محیط ہے اور ان دونوں کا تعلق براہ راست دہلی سے ہی ہے۔ سرزمین دہلی اور یہاں موجود آثار قدیمہ سے خلیق انجم کو خصوصی دلچسپی تھی۔ ان کی بیگم پروفیسر مونی انجم کہتی تھیں کہ دہلی کی تاریخی عمارتوں سے انھیں اس قدر لگاؤ تھا کہ وہ اتوار کے دن اکثر بطور تفریح گھر سے باہر مع اہل وعیال دہلی کے کسی تاریخی مقام پر جاتے اور وہاں بیٹھ کر اس عمارت کے تاریخی پس منظر پر گفتگو کرتے ہوئے اہم اور ضروری معلومات سے ہم سب کو آگاہ کرتے اور ان کا معمول تھا کہ ایک کیمرہ اپنے ساتھ رکھتے اور اس عمارت کی تصویر اپنے کیمرے میں قید کر کے اسے اپنے پاس محفوظ کر لیتے۔ پروفیسر مونی انجم کی یہ بات مختلف قرائن سے درست اور صحیح بھی معلوم ہوتی ہے کیونکہ ان کی مختلف اہم کتابیں اس بات کی غمازی کرتی ہیں۔ چنانچہ آثار الصنادید میں انھوں نے دہلی کی عمارتوں کی جو تصویریں منسلک کی ہیں ان تمام تصویروں کو انھوں نے بذات خود کھینچا تھا اور اس طرح دہلی کے آثار قدیمہ اور یہاں کے رسم ورواج سے متعلق دیگر کتابیں بھی اس بات کا پتہ دیتی ہیں کہ انھیں دہلی کی تاریخی عمارتوں اور یہاں کے تہذیب و تمدن سے شدید لگاؤ تھا اسی لگاؤ کا نتیجہ ہے کہ انھوں نے دہلی کے آثار قدیمہ اور یہاں کے تہذیب وتمدن کے حوالے سے اتنی اہم کتابیں مرتب کیں کہ ان کی زبان سے خود دہلی کی تاریخ نے ایک مکالمہ قائم کر لیا ہے۔

پروفیسر شمیم حنفی اسی طرف اشارہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

دہلی میں ایک کروڑ سے زیادہ کی آبادی سانس لیتی ہے لیکن خود دہلی شہر اپنے مکینوں میں سے کچھ کے اندر بھی آباد ہے اور ان کے وجود میں سانس لیتا ہے خلیق انجم کا شمار ایسے منتخبات میں کیا جانا چاہیے۔ دہلی ان کے لیے صرف ایک شہر اور جائے پیدائش نہیں بلکہ ایک روایت، ایک ثقافت، ایک تاریخ اور ایک تجربہ بھی ہے۔ خلیق انجم اس کے بدلے ہوئے موسموں میں، اس کے دکھ سکھ میں، اس کے مسئلوں اور بکھیڑوں میں شامل رہے۔ ان کی اپنی ہستی میں جس بستی کی چھاپ سب سے زیادہ گہری دکھائی دیتی ہے اور خلیق انجم کے تشخص کا وسیلہ بنتی ہے وہ یہی بستی ہے۔ (بحوالہ مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا، ص 13-14)

پروفیسر شمیم حنفی کا یہ بیان ڈاکٹر خلیق انجم اور دہلی کے مابین جو رشتہ تھا اسے بالکل واضح طور پر سامنے لاتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ ان کا بیشتر ادبی سرمایہ دہلی اور افراد دہلی کے ارد گرد ہی گھومتا ہے دہلی اور آثار دہلی سے متعلق ان کی اہم کتابوں میں رسوم دہلی 1965 دہلی کے آثار قدیمہ 1988 دہلی کی درگاہ شاہ مرداں 1988 اور مرقع دہلی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

دہلی اور آثار دہلی سے متعلق خلیق انجم کی مرتب کردہ کتاب آثار الصنادید اپنی نوعیت اور شہرت کے لحاظ سے سب سے اہم ہے یہ کتاب بنیادی طور پر سرسید کی تصنیف ہے لیکن حالات زمانہ اور گردش رنگ چمن نے دہلی کی تصویر میں بڑی تبدیلی پیدا کر دی تھی اس کی وجہ سے اس کتاب میں بیان کردہ مقامات مجہول سے ہو گئے تھے لیکن خلیق انجم نے اس کتاب کو از سر نو مرتب کر کے اس میں مذکور مقامات کی مجہولیت ختم کر دی اور اس کتاب کی افادیت برقرار رہی۔ یہ کتاب سرسید کی زندگی میں دوبار شائع ہوئی۔ پہلا ایڈیشن 1847 میں مطبع سید الاخبار سے شائع ہوا جبکہ دوسرا ایڈیشن 1854 میں مطبع سلطانی سے منظر عام پر آیا۔ دونوں ایڈیشن میں بنیادی فرق یہ تھا کہ سرسید نے ایڈیشن میں ترمیم واضافے سے کام لیا اور پہلا ایڈیشن جو چار ابواب پر مشتمل تھا وہ اب گھٹ کر تین ابواب میں سمٹ کر رہ گیا۔ خلیق انجم نے اس کتاب کی ترتیب میں دوسرے ایڈیشن کو بنیاد بنایا لیکن اس میں انھوں نے اس بات کا اہتمام کیا کہ سرسید نے پہلے ایڈیشن کے جس خاص حصے کو دوسرے ایڈیشن میں شامل نہیں کیا تھا اسے بھی انھوں نے اپنی مرتب کردہ کتاب میں جگہ دی اور اس طرح باب سوم جو شاہجہان کے اندرون کے حالات پر مشتمل تھا اور دہلی کے آثار قدیمہ کے بیان میں اہم تھا اسے بھی اس کتاب میں شامل کر لیا۔

خلیق انجم کی تخلیقی مہارت اور ادبی نگارشات میں ان کی کتاب مجھے سب ہے یاد ذرا ذرا بہت اہمیت کی حامل ہے۔ یہ کتاب 2008 میں انجمن ترقی اردو دہلی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب شخصیات کے خاکوں پر مشتمل ہے۔ ان میں شاہد احمد دہلوی، رشید احمد صدیقی، جمیل جالبی، عبدالسلام ندوی، استاد رسا دہلوی، امتیاز علی خاں عرشی، نور الحسن نقوی، مہندر سنگھ بیدی اور جگن ناتھ آزاد وغیرہ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ان کے علاوہ خلیق انجم کی دیگر اہم کتابوں میں حسرت موہانی 1995، گجرال کمیٹی اور اس سے متعلق دیگر کمیٹیوں کا جائزہ 1998، بابائے اردو مولوی عبدالحق (بچوں کے لیے) 1992، کربل کتھا کا لسانی مطالعہ 1970، (اس کی ترتیب میں گوپی چند نارنگ بھی شامل تھے) مرزا محمد رفیع سودا 1965 اور گل کاری وحشت کا شاعر: مجروح 2000 وغیرہ اہم ہیں۔

خلیق انجم کی کثیر الجہات شخصیت کی ایک اہم اور بنیادی جہت یہ بھی ہے کہ انھیں فن ترجمہ نگاری سے بھی خصوصی دلچسپی تھی۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انھوں نے مختلف کتابوں کا ترجمہ کیا اور ترجمہ نگاری کے فن پر فن ترجمہ نگاری کے نام سے ایک اہم کتاب بھی مرتب کی۔ ان کی ترجمہ کردہ کتابوں میں تاراس بلبا 1957 (نکولائی گوگول کے انگریزی ناول کا اردو ترجمہ) کے علاوہ مرزا مظہر جان جاناں کے خطوط 1962 (فارسی خطوط کا اردو ترجمہ) دلّی کے آثار قدیمہ 1988 (عہد وسطیٰ کی پچیس فارسی تاریخوں میں دلّی کے آثار قدیمہ کی تفصیلات کا اردو ترجمہ) اور مرقع دہلی 1993 (فارسی متن کی ترتیب اور ترجمہ) شامل ہیں۔

ان کتابوں کے علاوہ خلیق انجم نے انجمن ترقی اردو دہلی سے شائع ہونے والے اردو ادب اور ہماری زبان جیسے رسالے میں مختلف مضامین اور اداریے لکھے۔ مختلف کتابوں پر لکھے گئے ان کے پیش لفظ اور تبصرے اسی طرح مختلف موضوعات پر تحریر کردہ مضامین سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ نہایت فعال اور متحرک بھی تھے۔

خلیق انجم کا انجمن ترقی اردو دہلی سے تقریباً 37 سال تک مسلسل وابستہ رہے۔ اس مدت میں اردو ادب کی ترقی کے ضمن میں ان کی خدمات کی ایک طویل فہرست ہے اس مختصر سے مضمون میں اس کی تفصیل پیش کرنا ممکن نہیں۔

خلاصہ کلام یہ کہ ڈاکٹر خلیق انجم بذات خود ایک انجمن تھے۔ ان کی پوری زندگی اردو زبان وادب کی ترویج واشاعت سے عبارت ہے۔ اپنی بیش قیمت کتابوں اور تحقیق وتدوین سے متعلق دیگر تحریروں سے انھوں نے اردو ادب کے دامن کو بیش قیمت جواہر ریزوں سے مالا مال کیا۔ اس اہم ناقد اور محقق سے اردو دنیا 18 اکتوبر 2016 کو محروم ہو گئی۔

■

Tajammul Husain
Research Scholar, Dept of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025
Mob.:9716422138

ارشاد احمد خاں

ل۔احمد اکبرآبادی

اردوادب کی تاریخ میں ل۔احمد اکبرآبادی (پ: 8اپریل 1885، و:6 جون 1980) ایک رومانوی ادیب اور جمالیاتی نثر نگار کی حیثیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔ انھوں نے اردو دنیا میں رومانوی تحریروں کے ذریعے شہرت حاصل کی۔ انھوں نے اُردو نثر کو'ادبِ لطیف' سے وابستہ کیا اور نثری ادب کو جمالیات سے ہم آہنگ کر کے ایک ایسے اسلوب کی بنیاد رکھی جسے اُردو ادب کے منفرد اسلوب کا درجہ حاصل ہے۔ ل۔احمد نے جس قدر افسانے لکھے اور تخلیقی ادب کا ترجمہ کیا، ان تمام میں ان کی صلاحیتوں کا سلسلہ طبع زاد نہیں ہے بلکہ انھوں نے بیشتر قصہ کہانیوں اور افسانوں کو ترجمے کی روایت کے ساتھ اُردو میں فروغ دیا۔ اس کے باوجود اُردو کی نثری دُنیا میں ایک منفرد اسلوب اور تازہ کار لفظیات کے توسط سے اپنی شناخت منوانے والے نثر نگار کی حیثیت سے ل۔احمد کی تخلیقی حیثیت کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اُن کی تصانیف ہمہ گیر ہیں اور انھوں نے افسانوی ادب کے ساتھ ساتھ غیر افسانوی ادب کے ترجموں کی طرف بھی خصوصی توجہ دی اور ترجمے کے دوران اپنے اسلوب کو رومانویت اور جمالیات سے وابستہ کر کے طبع زاد تخلیق کار نہ ہونے کے باوجود اس قدر شہرت حاصل کی کہ جس کی نظیر اُردو ادب میں ملنی مشکل ہے۔

ل۔احمد اکبرآبادی کی تخلیقی حیثیت اس وجہ سے دوبالا ہوجاتی ہے کہ انھوں نے خاص طور پر روسی اشتراکیت پرمبنی ناولوں، افسانوں اور قصوں وکہانیوں کے ترجمے پیش کیے۔ ان ترجموں کے دوران لازمی طور پر وہ Target Language اور Source Language کے تمام وسیلوں کو استعمال کرتے ہیں اور قصہ اور کہانی تو دوسری زبان سے اخذ کرتے ہیں لیکن اس میں تخلیقی صلاحیت کو بروئے کار لانے میں ان کا کوئی ہمسر نہیں۔ ڈاکٹر قاضی عبدالودود نے اپنی کتاب 'اُردو میں ادبِ لطیف' کی تحریر کے دوران ل۔احمد اکبرآبادی کی تحریروں میں تخلیق کی مختلف سطحوں کا جائزہ لیا ہے۔ اگرچہ ایک افسانہ نگار، ناول نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے ل۔احمد اکبرآبادی اپنی شہرت کی بلندیوں کو چھو لیتے ہیں لیکن اُردو کے بعض نقاد ایسے بھی ہیں جنھوں نے اُردو ادب کی تاریخ مرتب کرنے کے دوران ل۔احمد اکبرآبادی کو صرف اس وجہ سے نظر انداز کر دیا کہ وہ ایک مترجم کی حیثیت سے اُردو کے تخلیقی ادب میں اہم کارنامے انجام دیتے ہیں۔ اُردو کی ادبی تواریخ میں ل۔احمد اکبرآبادی کی شناخت موجود ہے لیکن حال ہی میں پروفیسر سیدہ جعفر نے 'تاریخِ اُردو ادب۔ میر سے

ترقی پسند ادب تک' (چار جلدوں) میں شائع کی تو ان چار جلدوں میں ل۔احمد اکبرآبادی کا نہ تو ذکر کیا اور نہ ہی ان کے فن پر اظہار خیال کیا۔ اُردو کے بیشتر نقاد اور محقق جب ل۔احمد اکبرآبادی کی خدمات کا اعتراف کرتے ہیں تو

بلاشبہ ل۔احمد اکبرآبادی اُردو نثر میں ادب لطیف کے نامور ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کا طرز انداز خود یہی بتاتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ کے توسط سے ایک ایسا نیا انداز ایجاد کیا ہے کہ جس کی مثال اُردو میں ملنی مشکل ہے۔

لازمی طور پر دورِ حاضر کے محققین کو بھی اس کا اعتراف کرنا چاہیے۔ نیاز فتح پوری کے رسالہ 'نگار' کے عہد سے لے کر دورِ حاضر تک اُردو کی بیشمار کتابوں میں ل۔احمد اکبرآبادی کی تخلیقی صلاحیت اور ان کے کارناموں کی ستائش کی گئی ہے۔ ل۔احمد کو ادب لطیف کے بنیاد گذار اور معمار کے طور پر تسلیم کرتے ہوئے ڈاکٹر منظر اعظمی یوں رقمطراز ہیں:

''ادب لطیف کے بڑوں میں ل۔احمد کا بھی شمار ہوتا ہے۔ ان کے یہاں رومان پسندی، حسن پرستی اور تحریر میں پاکیزگی ذوق نمایاں ہے۔ ل۔احمد بھی بنیادی طور پر انشا پرداز ہیں اور اسلوب کے حسن پر جان دیتے ہیں۔''

(اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ منظر اعظمی، ص 349)

بلاشبہ ل۔احمد اکبرآبادی اُردو نثر میں ادب لطیف کے نامور ادیبوں میں شمار کیے جاتے ہیں اور ان کا طرز انداز خود یہی بتاتا ہے کہ انھوں نے ترجمہ کے توسط سے ایک ایسا نیا انداز ایجاد کیا ہے کہ جس کی مثال اُردو میں ملنی مشکل ہے۔

ل۔احمد اکبرآبادی کا تمام تر فن معنویت سے ہمکنار اور ربط تسلسل سے ہم آہنگ نظر آتا ہے۔ وہ نہ تو پیچیدہ اسلوب کے علمبردار ہیں اور نہ ہی ژولیدہ بیانی سے کام لیتے ہیں۔ ان کی نثر میں صاف اور سادہ انداز اپنا اثر دکھاتا ہے لیکن اس کے دوران جمالیات اور رومانویت کی پرکاری نثر کی دین بن جاتی ہے اور اس قسم کا اسلوب سب سے پہلے ل۔احمد اکبرآبادی نے ہی اختیار کیا تھا۔ جس کے نتیجے میں اُردو کے رومانوی ادیب و نقاد نیاز فتح پوری نے شدت کے ساتھ ان کے فن اور اسلوب کی تائید ہی نہیں کی بلکہ بعد کے ادیبوں اور نقادوں نے بھی ل۔احمد کے فن کی ستائش کی۔ ل۔احمد کی تحریروں میں جمالیات پرستی اور رومانویت پسندی کے علاوہ حقیقت کے بجائے ماورائی خصوصیت اپنے جلوے دکھاتی ہے جس کے نتیجے میں ترقی پسندی کو رواں رکھنے کے باوجود بھی ل۔احمد کی تحریریں رومانوی تحریک سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔

ل۔احمد کے تخلیقی سرچشمے ہمیشہ جاری و ساری ہیں۔ ل۔احمد کے جس قدر بھی تخلیقی شہ پارے موجود ہیں۔ ان تمام کا تعلق ترجمے سے ہے، چنانچہ 'لالہ رخ'، 'انشائے لطیف'، 'نغمات'، 'زندگی کے کھیل'، 'محبت کا افسانہ'، 'صبح و شام' اور 'ملاحظاتِ نفسی' کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ل۔احمد اکبرآبادی نے بنیادی طور پر ترجمے کی روایت کو اختیار کرتے ہوئے نہ تو لفظی ترجمے کی طرف توجہ دی اور نہ ہی آزاد اور با محاورہ ترجمہ کرنے کی کوشش کی۔ بلاشبہ اُن کی تمام تخلیقی ترجمہ شدہ کتابوں کو تخلیقی ترجمہ میں شامل کیا جائے گا کیونکہ انھوں نے ہمیشہ ناول، افسانے، ناولٹ اور مختصر پاروں کے مرکزی خیال کو انگریزی، روسی، فرانسیسی یا پھر دوسری یوروپی زبانوں سے مستعار لیا لیکن قصہ بننے اور اس کی بیانیہ کیفیت کو نمایاں کرنے کے معاملے میں وہ مکمل طور پر آزاد انداز کو اختیار کرتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اُن کے تمام افسانے، نثر پارے، ناول اور ناولٹ تخلیقی حسیت سے دوچار ہو کر قاری کو متوجہ کرنے کا وسیلہ بن جاتے ہیں۔

ادبی حیثیت سے ل۔احمد اکبرآبادی ایک مایہ ناز قلمکار کا درجہ تو حاصل نہیں کر سکے لیکن اتنا ضرور ہے کہ انھوں نے صرف ترجمے پر توجہ نہیں دی بلکہ تخلیقی صلاحیتوں کو کام میں لاتے ہوئے علم و ادب کی خدمات کی طرف بھی توجہ دی۔ ان کے افسانوی مجموعے 'زندگی کے کھیل۔ دن رات' اور 'انشائے لطیف' کے مطالعے سے خود پتہ چلتا ہے کہ ل۔احمد نے افسانوی تخلیق کے داخلی اور خارجی دونوں پہلوؤں پر خصوصی توجہ دی ہے۔ افسانے کے داخلی پہلوؤں میں قصہ، پلاٹ اور کردار کو اہمیت دی جاتی ہے اور خارجی پہلوؤں میں زبان، بیان، اظہار اور محاورات کا استعمال اہمیت کا حامل ہے۔ ان دو اہم تخلیقی حسیتوں کے پس منظر میں ل۔احمد اکبرآبادی کی افسانوی کائنات کا جائزہ لیا جاتا ہے تو یہ پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے داخلی و خارجی تخلیقی حسیت کو اپنے افسانوں میں جگہ دی ہے۔ ان کا قطعی مقصد ترجمے کی تکمیل کرنا نہیں اور وہ ترجمے کے بنیادی عناصر کو کام میں لانے کے بجائے اپنے تخلیقی رویے کو کام میں لاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ل۔احمد کی افسانوی تخلیقات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ڈاکٹر عبدالودود جب 'اُردو نثر میں ادب لطیف' لکھتے ہیں یا پھر ڈاکٹر منظر اعظمی 'اُردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ' تحریر کرتے ہیں تو ان مقالوں میں ل۔احمد کا ذکر کیے بغیر وہ دو قدم آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ڈاکٹر محمد حسن کی 'اُردو میں رومانوی تحریک' اور ڈاکٹر انور سدید کی 'اُردو ادب کی تحریکیں' کے مطالعے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان تمام ادیبوں اور نقادوں نے ل۔احمد کی تخلیقی خصوصیت کو قبول کیا ہے۔ حد یہ ہے کہ ڈاکٹر یوسف سرمست نے اپنی تصنیف 'بیسویں صدی میں اُردو ناول' تحریر کیا تو اس میں بھی ل۔احمد کا ترجمہ شدہ ناول 'محبت کا افسانہ' کا بطور خاص ذکر کیا ہے جو اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ اُردو کے بیشتر محققین اور ناقدین نے ل۔احمد کی تخلیقی صلاحیتوں کو قبول کیا ہے اور اُردو کے ایک انشا پرداز، افسانہ نگار اور رومانوی ادیب کی حیثیت سے ل۔احمد اکبرآبادی کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے جس کا مقصد یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ایک افسانہ نگار اور مضمون نگار کی حیثیت سے ل۔احمد صرف مترجم کی حیثیت سے شناخت نہیں رکھتے بلکہ ان کی تحریروں میں تخلیقی حسیت اپنا اثر دکھاتی ہے۔

"ل۔احمد نے ترجموں کے علاوہ طبع زاد مضامین بھی لکھے اگرچہ وہ انگریزی، روسی، اطالوی، فرانسیسی اور امریکی ادیبوں کے افسانوں اور شہ پاروں کے ترجمے پر توجہ دیتے ہیں لیکن ان کے بیشتر مضامین اس حقیقت کا انکشاف بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے طبع زاد مضامین لکھنے پر بھی توجہ دی۔"

ل۔احمد نے ترجموں کے علاوہ طبع زاد مضامین بھی لکھے اگرچہ وہ انگریزی، روسی، اطالوی، فرانسیسی اور امریکی ادیبوں کے افسانوں اور شہ پاروں کے ترجمے پر توجہ دیتے ہیں لیکن ان کے بیشتر مضامین اس حقیقت کا انکشاف بھی کرتے ہیں کہ انھوں نے طبع زاد مضامین لکھنے پر بھی توجہ دی۔ انھوں نے جب ہندوستانی شخصیتوں پر مضامین لکھے تو بلاشبہ ان کی تخلیقی حسیت اپنا اثر دکھانے لگی۔ ان کے مضامین 'شاہ مبارک آبرو'، 'نیاز فتح پوری کی ادبیت'، 'اکبرالہ آبادی کی شاعری'، 'نظیر اکبرآبادی کی غزل گوئی'، 'نظیر کا مسلکِ حیات' اور 'کلام وحشت کا ترقی پسندانہ پہلو' کا تعلق ل۔احمد اکبرآبادی کی تخلیقی حسیت سے ہے۔ وہ نہ صرف ان مضامین کے ذریعے اپنے تجربات، مشاہدات اور فکری رویے کو ظاہر کرتے ہیں بلکہ یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے تخلیقیت کو اپنی ہر تحریر میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ حد یہ کہ ترجمے کے دوران بھی وہ تخلیقی

جملوں کی شمولیت پر توجہ دیتے ہیں جس کی مثال ان کی ترجمہ کی ہوئی کتاب 'ہندوستانی ادب کے معمار۔ پریم چند' سے دی جاسکتی ہے۔ یہ کتاب انھوں نے پرکاش چندر گپت کی انگریزی کتاب سے ترجمہ کیا۔ تاہم تخلیقی جملے اس کتاب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ مثلاً کتاب کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اپنی کئی کہانیوں میں پریم چند نے قلب انسانی کے اضطراب یعنی نفسانیت اور شریف النفسی کی کشمکش پر گفتگو کی ہے، جس میں بالآخر شرافت نفسی ہی مظفر و کامران ہوتی ہے۔ وہ بلاشبہ حقیقت کے سچے اور ماہر نقاش ہیں، بہر حال ان کا آدرش واد زندگی کو راہ راست دکھانے کی کوشش ہے۔ یہی سبب ہے کہ انھیں اپنی کہانیوں میں سے 'بڑے گھر کی بیٹی' سب سے زیادہ عزیز تھی۔''

(پرکاش چندر گپت: ہندوستانی ادب کے معمار: پریم چند (مترجم ل احمد اکبرآبادی، ص 106)

اگرچہ انھوں نے پرکاش چندر گپت کی کتاب کا اُردو میں ترجمہ کیا ہے لیکن الفاظ کی ساخت اور پیرایہ بیان کے علاوہ لفظوں کی تراکیب پر توجہ دی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ل۔احمد نے ترجمے کے دوران بھی تخلیقی حسیت کو بروئے کار لاتے ہیں۔ چنانچہ اس فقرے میں بھی 'قلب انسانی کے اضطراب، نفسیات اور شریف النفسی کی کشمکش اور حقیقت کے سچے ماہر نقاش' کی تراکیب اس بات کا ثبوت دیتی ہیں کہ ل۔احمد اکبرآبادی نے ترجمے کے دوران بھی تخلیقی حسیت کو برتا ہے جو ان کی انفرادیت پسندی کی دلیل ہے۔ جیسا کہ بتایا جاچکا ہے کہ ل۔احمد اکبرآبادی نے ترجمے کو بھی تخلیقی قوت سے وابستہ رکھا اور اُردو کے بہت کم ادیب ایسے ہیں جنھوں نے اس رویے کو اختیار کیا ہو۔ اس حقیقت کو بہر حال قبول کرنا پڑے گا کہ ل۔احمد اکبرآبادی نے اپنی ابتدائی تحریروں میں افسانے، مختصر پارے اور ناولوں کے ترجمے کے دوران جس خلاقیت کو ملحوظ رکھا ہے اور جس قدر شدت کے ساتھ رومانویت کو برتا ہے وہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تحریروں میں کم تر ہوتی نظر آتی ہے۔ اس کی وجہ شاید ترقی پسندی اور اس کے بعد کا دور رہا ہو۔ کیونکہ ل۔احمد نے طویل عمر پائی اور 1980 تک اُردو ادب کی بدلتی ہوئی روایت کے علمبردار رہے۔ اس لیے یہ حقیقت محسوس کی جاسکتی ہے کہ ل۔احمد کی تخلیقی حسیت میں دور کے لحاظ سے تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔

ل۔احمد نے اپنی ابتدائی تصنیف 'لالہ رخ' کے دوران جس قسم کا رومانوی مزاج پیدا کیا تھا وہی رومانوی مزاج ان کی آخری تحریروں میں دکھائی نہیں دیتا۔ اس تبدیلی کی سب سے بڑی وجہ ایک تخلیق کار کا اپنے عہد کو

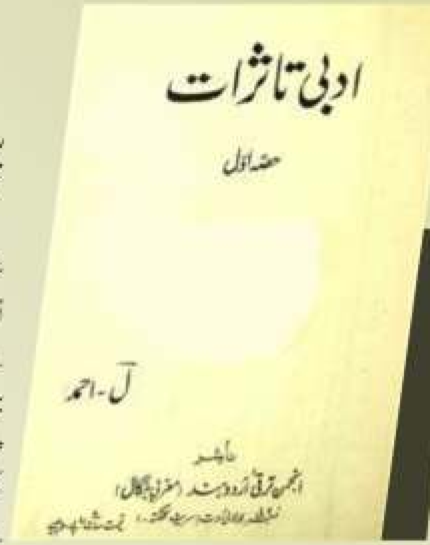

محسوس کرنے کا وہ جذبہ ہے جو ہمیشہ ادیب کو ماحول اور معاشرے سے ہم آہنگ رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ زمانہ اور عمر کے تقاضے بھی ادیب کے فکر و خیال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ل۔احمد کی تخلیقی حیثیت کو سمجھنے کے لیے لازمی ہے کہ ان کی تمام تحریروں کو بہ نظر غائر دیکھا جائے اور اس میں موجود تمام وسائل کو تلاش کیا جائے۔ اس پس منظر میں دیکھا جائے تو ل۔احمد کی تخلیقی حیثیت تین مختلف ادوار میں کام کرتی نظر آتی ہے۔ ابتدا میں ان کی تحریروں پر رومانویت کا اثر غالب ہے اور یہ اثر نہ صرف انھیں انفرادی مقام دلاتا ہے بلکہ اُردو ادب میں یہی رومانویت پسندی اور انشائے لطیف کی نمائندگی انھیں انفرادیت کا تاج پہنا دیتی ہے جس کے بعد ل۔احمد اکبرآبادی کی تحریروں پر اشتراکیت کا غلبہ نظر آتا ہے اور یہ اثر ان کی تحریروں کا جز بن کر نمایاں بھی ہوتا ہے۔ چونکہ ترقی پسند تحریک کے ادیبوں میں یہ غلبہ نمایاں تھا اس لیے ل۔احمد کی تحریروں میں بھی یہ دوسرا اثر تخلیقی حیثیت سے کام کرتا نظر آتا ہے جس کے بعد ل۔احمد کی تحریروں میں تیسرا اثر حقیقت پسندی کا ہے اور یہ اثر ان کے تخلیق پاروں پر بہت کم عرصہ کے لیے لیکن غالب رجحان کے طور پر اہمیت رکھتا ہے۔ اس اعتبار سے ل۔احمد کی تمام تحریریں چاہے ان کا تعلق افسانوی نثر سے ہو یا غیر افسانوی نثر سے طبع زاد مضامین سے ہو یا ترجمہ شدہ فن پاروں سے، ان تمام پر تین مختلف انداز کی نشاندہی یہ ثابت کرتی ہے کہ ل۔احمد اکبرآبادی نے اپنی تمام تر زندگی میں اختیار کردہ اسلوب اور ادب پاروں کو رومانویت، اشتراکیت اور حقیقت پسندی سے وابستہ رکھا اور خود کی زندگی کے تمام معاملات کو اسی خصوصیت سے وابستہ رکھا۔ ان حقائق کے تجزیے کے بعد ل۔احمد کی تخلیقی حیثیت کے سب زریں دور کو بھی نمایاں کرنا ضروری ہے اور بلاشبہ ان کی تخلیقی حیثیت کے تین ادوار میں سب سے بہترین دور وہی کہلائے گا جبکہ انھیں ایک رومانوی ادیب کی حیثیت سے شہرت حاصل ہوئی اور رومانوی تحریک کے علمبرداروں میں ان کا نام شامل کیا گیا۔

ل۔احمد کی بیشتر تصانیف میں جمالیاتی احساس کی شدت اور تخلیق کی نمایاں خصوصیت نمودار ہوجاتی ہے۔ اُن کی تمام ترجمہ شدہ اور تخلیق شدہ کتابوں کے مطالعے سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ ان کی تحریریں نہ تو دل بہلانے کے لیے ہیں اور نہ ہی ادب کی پرورش اور اپنی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کی غرض سے نمایاں کی گئی ہیں بلکہ ان کے ہر فن پارے میں تخلیقی حیثیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے اور اس جلوہ گری کے لیے وہ نئی تشبیہات، استعارات اور جدید ترکیبوں سے کام لیتے ہیں۔ بقول منظر اعظمی:

''دوسرے جمال پرست ادیبوں کی طرح ل۔احمد نے بھی خوبصورت فقرے، تراکیب، تشبیہیں اور استعارے تراشے۔ تیتری کے لیے 'شبنمی لباس والی دوشیزۂ پراں' اور 'نقاشِ فطرت کی اختراعِ جمیل' نوجوان عورت کے لیے 'آتش کدۂ حسن' اور 'خم کدۂ شراب' استعمال کرتے ہیں۔ سرو قد حسن کو 'طوبیٰ قامتی' سے تشبیہ دیتے ہیں۔ محبوب کی آنکھوں کی چمک کے لیے 'انوار تاریک' کی ترکیب تراشتے ہیں۔''

(اردو ادب کے ارتقا میں ادبی تحریکوں اور رجحانوں کا حصہ۔ منظر اعظمی، ص 352)

تخلیق کاری میں ایک اہم وصف لفظوں، جملوں اور فقروں کے ذریعے ایسے تناظر کی نمائندگی کرنا کہ جس سے قاری کو لطف بھی حاصل ہو اور لفظوں کی بندشوں سے نیا آہنگ بھی پیدا ہو۔ اس قسم کی لفظیات کو پیش کرنے میں ل۔احمد اکبرآبادی کی ہمسری کوئی ادیب نہیں کرسکتا۔ جمالیاتی احساس ان کی لفظیات کا ایسا حصہ ہے جس میں آہنگ کی خصوصیات کے ساتھ ساتھ معنویت کی خصوصیات بھی نمایاں ہوجاتی ہیں اور اس عمل کو ل۔احمد اکبرآبادی نے اپنی ہر تخلیق کا حصہ بنایا ہے۔

دور حاضر کو نثر اور فسانوی نثر کے دور کی حیثیت سے مقبولیت حاصل ہوتی جارہی ہے جس کے توسط سے بیانیہ یا Narration کی درجہ بندی اور اس کے مختلف عناصر کی نشاندہی ہوتی جارہی ہے۔ اس پس منظر میں یہ امکان ہے کہ نئی نثر کے مبلغین اور متن میں موجود حقیقتوں کو تلاش کرنے والے ناقدین نہ صرف ل۔احمد اور ان کی تخلیقی حیثیت کی طرف توجہ دیں گے بلکہ ان کی یہ کوشش بھی ہوگی کہ نئے ادبی تناظر میں ل۔احمد کی شخصیت اور ان کے کارناموں کا اعادہ کیا جائے۔

■

Dr. Irshad Ahmed Khan
HOD Urdu (NSB College,
Vazirabad, Nanded- 431604 (MS)

نفاست کمالی

فائز دہلوی

کے کلام میں مقامی رنگ

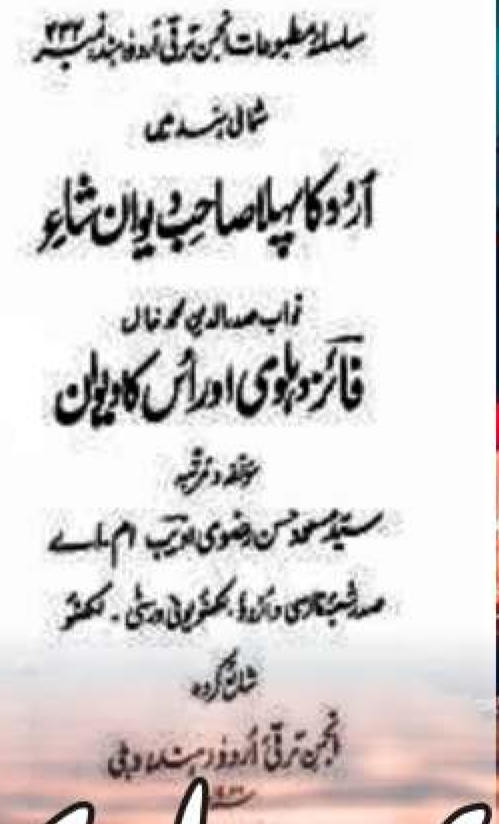
سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) نمبر ۲۳۲
شمالی ہند میں
اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر
نواب صدر الدین محمد خاں
فائز دہلوی اور اس کا دیوان
مؤلفہ و مرتبہ
سید مسعود حسن رضوی ادیب ایم اے
صدر شعبۂ فارسی و اردو، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ
شائع کردہ
انجمن ترقی اردو (ہند) دہلی

شمالی ہند میں جدید تحقیق کے مطابق نواب صدرالدین خاں فائز دہلوی اردو کے پہلے صاحب دیوان شاعر ہیں ان کے آباو اجداد سلطنت مغلیہ کے منصب داروں میں سے تھے اور خود بھی منصب امارت اور جاگیر سے سرفراز تھے۔ غالباً اس لیے وہ اپنے نام کے شروع میں 'نواب' کا اضافہ کرتے تھے۔

فائز دہلوی کا زمانہ سیاسی طور پر بڑے انتشار کا تھا۔ سلطنت مغلیہ دن بہ دن زوال کے تاریک غار کی طرف جا رہی تھی۔ آئے دن بادشاہ تبدیل ہو رہے تھے۔ سیاست کی طاقت بکھر رہی تھی لیکن اردو اپنی تمام تر قوتوں کے ساتھ ترقی کے زینوں کی طرف گامزن تھی۔ شمال میں اردو شاعری اپنا اعتبار قائم کر رہی تھی جبکہ اس وقت تک دکن میں شعروادب کے انبار لگ چکے تھے خصوصاً صنف مثنوی نے بڑی ترقی کر لی تھی۔ فائز کا بہر حال یہ کارنامہ ہے کہ وہ اپنی منصبی ذمے داریوں کو پورا کرتے ہوئے اردو کے دامن کو اپنی شاعری سے 'دامان باغباں' اور 'کف گل فروش' بنا رہے تھے اور اس طرح انھوں نے شاعری میں اپنی ایک امتیازی حیثیت بنالی۔ فنی اور ادبی حیثیت سے اگرچہ

فائز دہلوی بنیادی طور پر فارسی کے شاعر ہیں اور ان کے فارسی کلام کا ایک بڑا ذخیرہ آج بھی موجود ہے پھر بھی ان کو شہرت ان کے اردو دیوان کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ انھوں نے اردو میں باضابطہ شاعری اس وقت شروع کی جب 1720 میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا۔

فائز دہلوی کا مرتبہ زیادہ بلند نہیں ہے لیکن قدامت کو ذہن میں رکھتے ہوئے فائز کی شاعری کا ناقدانہ جائزہ لیں تو فائز کی اہمیت کو تسلیم کرنا ہی پڑے گا۔

فائز دہلوی بنیادی طور پر فارسی کے شاعر ہیں اور ان کے فارسی کلام کا ایک بڑا ذخیرہ آج بھی موجود ہے پھر بھی ان کو شہرت ان کے اردو دیوان کی وجہ سے حاصل ہوئی۔ انھوں نے اردو میں باضابطہ شاعری اس وقت شروع کی جب 1720 میں ولی کا دیوان دہلی پہنچا۔ اس سلسلے میں جمیل جالبی اپنی کتاب 'تاریخ ادب اردو' میں لکھتے ہیں:

''انھوں نے رواج زمانہ کے مطابق دیوان ولی کے آنے کے بعد 1132ھ بمطابق 1720 میں یا اس کے بعد اردو میں شاعری شروع کی۔''

(جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، جلد دوم، نمبر 301

اس سے قبل بہت سے اہل قلم کی طرح اردو کو فارسی زبان کے مقابلے میں حقیر اور بازاری سمجھتے تھے انھوں نے جملہ اصناف میں طبع آزمائی کی لیکن غزل گوئی اور نظم نگاری کو فوقیت حاصل ہوئی۔ فائز کے زمانے میں ایہام گوئی کا دور دورہ تھا۔ حاتم، ناجی، آبرو، مضمون، یکرنگ وغیرہ اردو کے تمام سربرآوردہ شعرا اس رنگ سے رنگے ہوئے تھے۔ بعد میں یہ رنگ ہلکا پڑ گیا اور شاعروں نے اس طرز کو چھوڑ دیا اور دوسروں کو بھی اسے ترک کرنے کی تلقین کی لیکن فائز ایہام گو شاعر نہیں ہیں انہوں نے ولی دکنی کا اثر قبول کر کے انھیں کے طرز پر شاعری شروع کی ان کی 46 غزلوں میں سے 33 غزلیں ولی کی ہی طرز پر لکھی گئی ہیں۔ خطبۂ کلیات میں خود فائز کے اپنے آغاز شباب کی حدت، شوخی اور آزادروی کا ذکر کیا گیا ہے اپنی عاشقانہ اور رومانی افتادِ طبع کی وجہ سے کبھی بھی مضمون آفرینی کی کوشش نہیں کی۔ شوق کے غلبے میں جو کچھ محسوس کیا بلا کم وکاست لکھ دیا اور اس طرح انھوں نے شاعری

میں اپنی امتیازی حیثیت بنالی۔انھیں امتیاز وخصوصیات میں سے ایک خصوصیت ہندوستانی یا مقامی رنگ کی بھی جلوہ گری ہے۔

ان کے کلام میں ہندوستانی عناصر اور مقامی رنگ کی عکاسی بڑی خوبی سے کی گئی ہے۔فارسی اور ہندوستانی عناصر کے امتزاج سے ان کی شاعری میں گنگا جمنی حُسن پیدا ہو گیا ہے۔ابتدا میں ان کی شاعری کی بنیاد فارسی شاعروں کی روایتوں پر کھڑی ہوئی تھی جس کے نتیجے میں فارسی کے اصناف غزل،قصیدہ،مثنوی،اردو میں لائی گئیں۔خیالات اور مواد میں تقلید کی گئی اس طرح فارسی شاعری کی بیجا تقلید اردو شاعری کی روایت بن گئی اس لیے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا کہ اردو شاعری ولی سے غالب کے زمانے تک خارجی اور معنوی حیثیت سے صرف فارسی شاعری کی نقالی کرتی رہی یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری میں ہمیشہ اصلی تجربات و مشاہدات اور ذاتی جذبات واحساسات کی کمی محسوس کی گئی حد تو یہ ہے کہ اردو شعرا بیت کے علاوہ مضامین بندش الفاظ وتراکیب تشبیہات واستعارات میں کورانہ تقلید کرنے لگے نقادوں نے اس سلسلے میں اردو شاعری پر کافی تنقیدیں کی ہیں جو بجا ہیں۔محمد حسین آزاد اپنی شہرۂ آفاق تصنیف 'آب حیات' میں کچھ اس طرح رقم طراز ہیں:

''تعجب ہے کہ فارسی شاعری نے اس قدر خوش ادائی اور خوش نمائی پیدا کی ہے کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے موجب تھے انھیں بھی مٹا دیا چنانچہ خاص وعام پپیہے اور کوئل کی آواز چمیلی کی خوشبو کو بھول گئے۔نسرین و سنبل جو کبھی دیکھی نہ تھی ان کی تعریف کرنے لگے رستم اور اسفند یار کی بلندی کوہ الوندادور بے ستون کی بلندی اور جیحوں اور سیحون کی روانی نے وہ طوفان اٹھایا کہ ارجن کی بہادری ہمالیہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف سے بھری چوٹیاں گنگا جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا۔''

(آب حیات) بحوالہ کلیم الدین احمد اردو شاعری پر ایک نظر ص 2)

کلیم الدین احمد کہتے ہیں:

''فارسی شاعری نے کچھ ایسا سبز باغ دکھایا ہے کہ شعرا اپنی فطری ذہانت اور طباعی،اپنی قوت اور جدت طرازی سے دست بردار ہو کر فارسی شاعری کی تقلید میں منہمک ہو گئے۔'' (اردو شاعری پر ایک نظر)

حقیقت بھی یہی ہے کہ اردو شعرا ہندوستانی ماحول اور آب وہوا میں رہ رہے تھے لیکن ایرانی ماحول کا نقشہ اپنے کلام میں پیش کر رہے تھے۔لیکن فائز دہلوی اور نظیر اکبرآبادی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ان کی شاعری ایرانی فضا میں سانس نہیں لیتی ہے۔ہندوستانی عناصر سے اپنے کلام کو آراستہ و پیراستہ کرتے ہیں اس سلسلے میں فائز کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے مسعود حسین رضوی تحریر کرتے ہیں:

''اردو شاعری پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ مقامی رنگ سے خالی ہے لیکن فائز کا کلام اس اعتراض کی زد سے دور ہے وہ تشبیہوں،استعاروں اور تلمیحات میں خالص ہندوستانی چیزوں سے زیادہ کام لیتے ہیں۔''

(مقدمہ،دیوان فائز مسعود حسین رضوی ادیب ص 830)

فائز ہندوستانی زندگی،ہندوستانی رسم ورواج،تہوار اور میلوں کا منظر اپنے کلام میں بڑی خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں مجنوں گورکھپوری نے نظیر کے بارے میں لکھا ہے جو فائز پر بھی صادق آتا ہے:

''نظیر پہلے شاعر تھے جن کو میں نے زمین کی چیزوں کے متعلق باتیں کرتے ہوئے پایا۔پہلی دفعہ میں نے محسوس کیا کہ شاعر کا تعلق روئے زمین سے بھی ہے۔''

فائز سراپا ہندوستانی ہیں۔ان کے سوچنے کا انداز،تخیل،فکر اور ان کا اسلوب بیان ان کے پیش کردہ مناظر حتیٰ کہ ان کی تشبیہات واستعارات بھی سو فیصد ہندوستانی نظر آتے ہیں فائز کا یہ کمال ہے کہ ہماری زندگی کی چلتی پھرتی تصویر پیش کر دیتے ہیں۔مزید یہ کہ ان کے کلام میں بھرپور صداقت اور واقعیت کی جھلک ملتی ہے۔نظموں کے چند عنوانات دیکھیے۔

تعریف پنگھٹ،تعریف ہولی،بیان میلہ بہتہ،تعریف جوگن،در وصف کاچن،تعریف تمبولن،در وصف بھنگیرن،تعریف گوجری،درگاہ قطب وغیرہ۔

پنگھٹ کا تعلق پورے طور پر ہندوستان سے ہے اس کے نام ہی سے ایک خاص رومانی فضا کا تصور ذہن میں ابھرتا ہے۔جہاں لڑکیاں اور عورتیں پانی بھرنے کو جمع ہوتی ہیں۔کیا ہی خوبصورت منظر نظر آتا ہے۔عاشق مزاج حضرات اس سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔فائز نے اپنی فنکاری اور تخلیقی قوت سے تمام جزئیات کے ساتھ اس منظر کو پیش کر دیا ہے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا جب سیر میں پنگھٹ کا گلزار
کنویں کے گرد دیکھی فوج پنہار
ہر اک پنہار واں اک اپچھرا تی
کنویں کے گرد اندر کی سبھا تی
لے آئی تھی بجریاں اک سندر
لے جاتی اک گگریاں سیس پر دھر
سبن کی رنگ رنگ لہنگا وساری
کنارے ان کے تھی تانکی کناری

ان اشعار میں سارے الفاظ تلمیحات وتشبیہات ہندوستانی ہیں۔پنگھٹ پر ساری لڑکیاں انھیں اپسرا ہی نظر آتی ہیں معلوم ہوتا ہے کہ فائز کی نگاہ میں کوئی بدصورت عورت تھی ہی نہیں۔

نظم ''تعریف ہولی بھی ایک کامیاب اور دلکش نظم ہے۔اس کے واقعات اور مناظر بڑے ہی دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں ان کی رنگ رلیاں اور گل چھرّے کا مزہ لے لے کر تبصرہ کرتے ہیں۔گلال،ابیر،کیسر کے چھینٹے چھینکے جاتے ہیں مرد عورت مستی میں ہنسی مذاق اور ٹھٹھول کرتے ہیں خوشی اور مسرت میں رقص کرتے ہیں فائز کہتے ہیں۔

لے ابیر اور ارگجا بھر کر رومال
چھڑکتے ہیں اور اڑاتے ہیں گلال
سب کے تن میں ہے لباس کیسری
کرتے ہیں صد برگ سوں سب ہمسری
ناچتی گا گا کے ہوری دم بدم
جیوں سبھا اندر کے دربار ارم

تعجب ہے کہ فارسی شاعری نے اس قدر خوش ادائی اور خوش نمائی پیدا کی ہے کہ ہندی بھاشا کے خیالات جو خاص اس ملک کے حالات کے موجب تھے انہیں بھی مٹا دیا چنانچہ خاص وعام پپیہے اور کوئل کی آواز چمیلی کی خوشبو کو بھول گئے۔نسرین وسنبل جو کبھی دیکھی نہ تھی ان کی تعریف کرنے لگے رستم اور اسفند یار کی بلندی کوہ الونداور بے ستون کی بلندی اور جیحوں اور سیحون کی روانی نے وہ طوفان اٹھایا کہ ارجن کی بہادری ہمالیہ کی ہری ہری پہاڑیاں برف سے بھری چوٹیاں گنگا جمنا کی روانی کو بالکل روک دیا۔

بعد میں اس روایت کو نظیر نے کافی آگے بڑھایا اور ہولی کی رنگینی کو زیادہ موثر طریقے سے پیش کیا۔ فائز سے پہلے قلی قطب شاہ نے بھی ہولی بسنت وغیرہ پر خوبصورت نظمیں کہی ہیں۔

نظم 'بیان میلہ بہتہ' میں ایک بازار کی تصویر کشی ملتی ہے جو لال قلعے کے لاہوری دروازے پر لگتا تھا منظر نگاری سے صداقت جھلکتی ہے۔ لوگوں کا ریلا آرہا ہے، شور وغل بڑھ رہا ہے، بازاروں کی چہل پہل بھی بڑھ رہی ہے، ماہ جبیں عورتیں بھی بازار کی رونق میں اضافہ کر رہی ہیں۔ کہیں تماشہ، حلوائی، گلفروش، تنبولن، شراب فروش ہیں کہیں بھگتوں کا ہجوم ہے تو کہیں بھانڈ اور نٹ کا ہنگامہ۔ سبھی اپنی دکانیں سجائے بازار میں جلوہ افروز ہیں ذرا فائز کی زبانی سنیے۔

آج بہتے کا یار میلا ہے
خلق کا اس کنارے ریلا ہے
مرد وزن سب چلے ہیں اس جاں پر
خلق پھیلی کنارے دریا پر
بہل وگاری میں سب چلے نسواں
کوچۂ بازار میں ہوں چپس چاں
اک جانب میں بھانڈ کا ہے شور
دیکھنا ان کا اہل دل کو ضرور

اس زمانے میں جب کہ اردو شاعری گھٹنوں کے بل چل رہی تھی۔ فائز کی نظموں میں تخیل کی فراوانی، تخلیقی صلاحیت، قوت مشاہدہ اور تجربات واحساسات کی تیزی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے وہ بڑی سادگی سے سارے مناظر پیش کر دیتے ہیں۔

کاچن، تنبولن، بھٹیرن، گوجرن یہ تمام مختلف پیشہ ور عورتیں ہیں اور نچلے طبقے سے تعلق رکھتی ہیں لیکن فائز نے ایک عام ہندوستانی نظر سے دیکھا۔ ان عورتوں کے ہندوستانی حسن اور لباس سے بہت متاثر ہیں۔ فائز نے اس زمانے کی عام روش کے خلاف پست طبقے کی گنوار عورتوں کے حسن اور طور طریقے کو اجاگر کیا ہے۔ بعد میں جوش ملیح آبادی نے جامن والیاں اور دیگر مزدور پیشہ جفاکش عورتوں کی تعریف میں نظمیں لکھیں۔ وہ عام زمینداروں اور رئیسوں کے مقابلے میں نچلے طبقے کی حمایت کرتے تھے۔ ان کی نظم 'تنبولن' کے چند اشعار پیش ہیں۔

ایک تنبولن دیکھی میں دل ربا
ماہ رخاں بیچ بہت خوش ادا
بانکری تھی ہاتھ میں اس کے ہری
بیٹھی دکان میں وہ جوں پری
ہونٹا اوپر زیب دیتی تھی دھڑی
گل میں تی موتیاں کی اس کو لڑی
کیلے کے گابھے سے ملائم دو ہات
دیکھ کے مرجھاتے تھے کیلے کے پات
نت دل عشاق کی چوری کرے
ہاتھ میں لے اپنی گلوری کرے

ان اشعار کی یہ خوبی ہے کہ عورت کے حسن وادا کے ساتھ عشوہ وغمزہ اور چاہنے والے کے ساتھ اس کے برتاؤ کو بھی پیش کیا گیا ہے۔

فائز کی شاعری میں کوئی گہری معنویت نہیں ھے لیکن آبرو، ناجی اور دیگر شعرا کے یہاں سے زیادہ مقامی رنگ ملتا ھے۔ ان کی شاعری کی فضا ان کے ذخیرۂ الفاظ اور ان کے رمز و کنایے میں ھندوستانیت کی چھاپ گہری ھے۔ یہی وہ رنگ سخن ھے جو فائز کو اردو کے دوسرے شاعروں سے مختلف کرتا ھے۔

تشبیہات واستعارات کی شیریں ادائیگی کی فکر میں کبھی کبھی شاعر بہک بھی جاتا ہے اور دور از کار تشبیہات انقباض پیدا کرتی ہیں لیکن فائز نے تشبیہات واستعارات کی پیش کش میں بڑی تخلیقی بصیرت اور فن کاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ مسعود حسین رضوی ادیب لکھتے ہیں:

''وہ تشبیہوں استعاروں اور تلمیحوں میں خاص ہندوستانی چیزوں سے زیادہ کام لیتے ہیں مثلاً پلک کو کٹاری، نرم اور نازک گول باہوں کو کمل کی ڈنڈی اور کیلے کا گابھا، ناک کو چمپے کی کلی سے، دلکش، رفتار کو موڑ اور مست ہاتھی کی چال سے تشبیہہ دیتے ہیں حقیقت بھی یہی ہے کہ تشبیہات اور استعارات سے ان کے قوت مشاہدہ اور فن کارانہ بصیرت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔''

(مقدمہ، دیوان فائز دہلوی سید مسعود حسین رضوی ادیب ص 83)

اس سلسلے کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

خوش نما تھا اس کے پگ میں پائے زیب
پیر نارنگی و تلوے تھے سیب
کنک سوں سقادار وہ بدن
کنول ڈال ہے ہاتھ گال ہے چرن
دو کنول دو گل ہیں گال
کلی چمپے کی ناک کو ہے مثال

آوارہ اور اوباش لوگ بھٹیر خانے میں اس طرح پھیلے ہوئے ہیں جیسے آشیانے پر کوے اودھم مچا رہے ہیں۔ کوا ہندوستانی پرندہ ہے۔ کوے کا غول بھی بھی جو منظر پیش کرتا ہے وہ ہندوستانیوں سے پوشیدہ نہیں۔ ہندی شاعری کی پیروی اور تقلید میں معشوق کا استعارہ چاند سے اور عاشق کا چکور سے پیش کیا جاتا ہے جیسے

سب چکورے بھٹیر خانے پر
جیسے کوے ہیں آشیانے پر

فائز نے اپنی شاعری میں ہندوں کے مذہبی عقائد اور معاشرتی طریقوں کا بھی ذکر کیا ہے جیسے اندر کی سبھا، اچھرا وغیرہ فائز کی نظموں میں ان کی غزلوں کی بہ نسبت ہندوستانی عناصر یا مقامی رنگ زیادہ ہیں لیکن ان کی غزلیں بھی مقامی رنگ سے بالکل عاری نہیں ہیں۔ خاص کر عشق میں ان کی ارضیت اور معشوق کی سج دھج بالکل ہندوستانی ہے۔ طرز ادا اور لب ولہجہ پر خالص برج بھاشا اور دہلی کی بولیوں کا اثر ہے۔ غزل کے ایک شعر کی طرز ادا ملاحظہ ہو۔

حسن بے ساختہ لبھاتا ہے مجھے
سرمہ انکھیاں میں لگایا نہ کرو

اس طرح کے اور بھی اشعار ہیں جن کی تلاش میں جانے پر طوالت پائے قلم تھام لیتی ہے۔

فائز کی شاعری کا محاکمہ کرتے ہوئے جمیل جالبی لکھتے ہیں:

''فائز کی شاعری میں کوئی گہری معنویت نہیں ہے لیکن آبرو، ناجی اور دیگر شعرا کے یہاں سے زیادہ مقامی رنگ ملتا ہے۔ ان کی شاعری کی فضا ان کے ذخیرۂ الفاظ اور ان کے رمز وکنایے میں ہندوستانیت کی چھاپ گہری ہے۔ یہی وہ رنگ سخن ہے جو فائز کو اردو کے دوسرے شاعروں سے مختلف کرتا ہے۔''

(ڈاکٹر جمیل جالبی: تاریخ ادب اردو، حصہ دوم ص 305)

اتنی بات تو تسلیم کرنی ہی ہوگی کہ فائز دہلوی نے فارسیت کے اس دور میں مقامی رنگ اور ہندوستانی عناصر کی جلوہ گری سے اردو شاعری کے دامن کو وسیع اور زبان کو تقویت بخشی ہے یہ ان کا طرۂ امتیاز ہے۔

■

Dr. Nafasat Kamali
Asst Professor
Guest Faculty, Dept. of Urdu
C.M. College, Qila Ghaat
Darbhanga-846004 (Bihar)

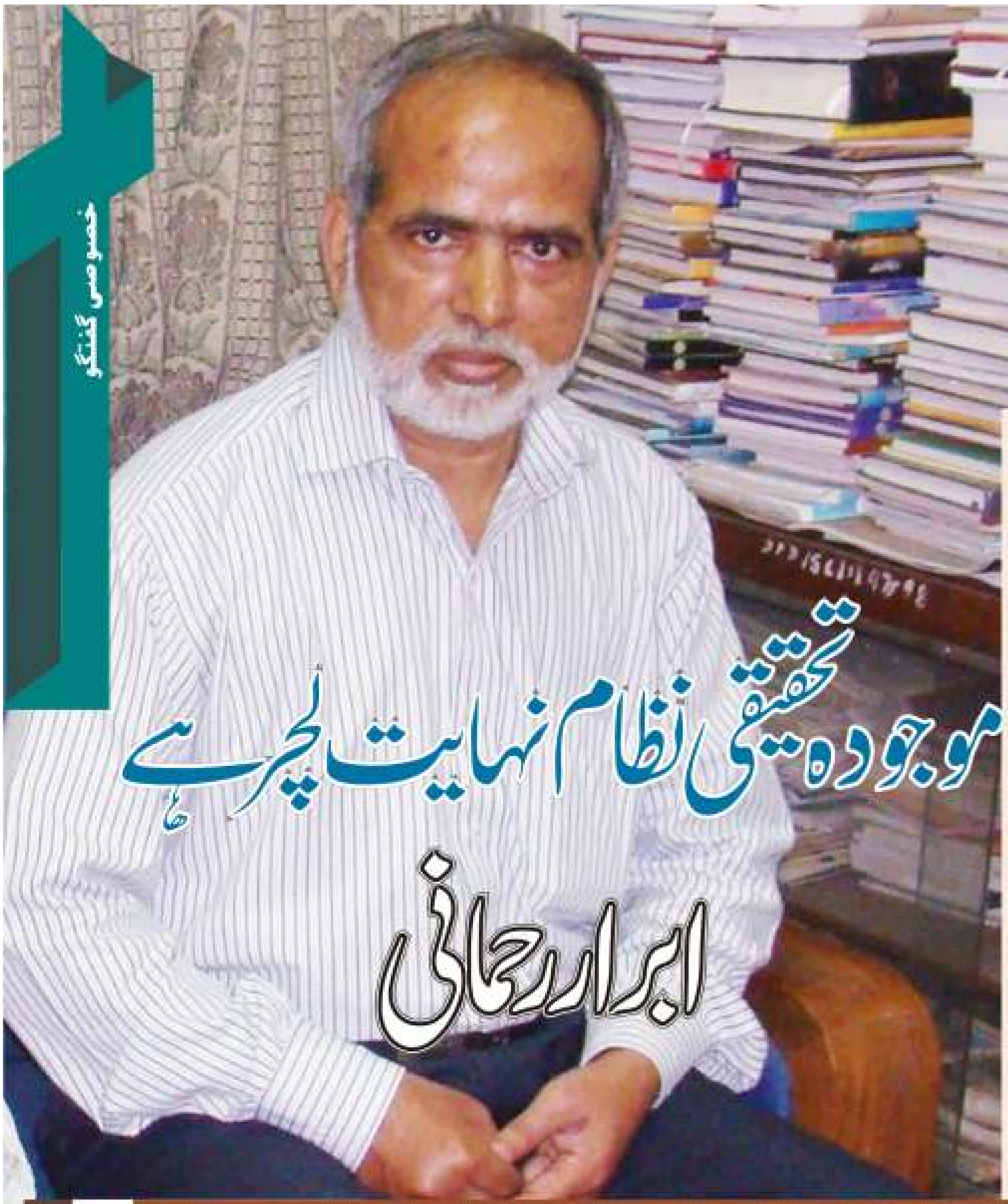

موجودہ تحقیقی نظام نہایت لچر ہے

ابرار رحمانی

غلام علی اخضر

غ ع ا: آپ کی پیدائش اور تعلیم و تربیت کہاں ہوئی؟

ابرار رحمانی: بھائی! آپ نے میری پیدائش سے گفتگو شروع کی ہے۔ میری پیدائش کہیں بھی ہوئی ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ پیدائش اور نام میں کیا رکھا ہے۔ انسان اپنے کارناموں سے پہچانا جاتا ہے۔ پھر بھی آپ نے پوچھ ہی لیا ہے تو میں عرض کرتا چلوں کہ میری پیدائش بہار کے شہر مظفر پور میں 18 مارچ 1960 کو ہوئی۔ جہاں تک تعلیم و تربیت کا سوال ہے تو میں بتا تا چلوں کہ میری ابتدائی تعلیم و تربیت مظفر پور کے محلہ اسلام پور میں اپنی رہائش گاہ پر ہوئی، صبح کو ایک مولوی صاحب آیا کرتے تھے۔ خدا انھیں غریق رحمت کرے نام تو اب یاد نہیں، وہ مزاجاً سخت ضرور تھے لیکن قرآن شریف اتنے اچھے ڈھنگ سے پڑھایا تھا کہ جس کا جواب نہیں۔ اردو میں اگر میرا شین قاف بہت درست ہے تو اس میں بہت کچھ میرے مولوی صاحب کی تربیت کا ہاتھ رہا ہے۔

پھر میری باضابطہ تعلیم کے لیے مظفر پور کے عابدہ ہائی اسکول میں سیدھا چھٹی کلاس میں داخلہ کرادیا گیا، جو میرے لیے ایک بوجھ سے کم نہیں، کیوں کہ میں نے

جہان اردو کے ایک ممتاز، محنت کش اور منفرد طرز کے نقاد، بے باک صحافی اور قابل رشک ادیب ڈاکٹر ابرار رحمانی جنھوں نے تحقیقی، تنقیدی، ادبی، تاریخی، سماجی اور سیاسی تحریروں میں اپنی صلاحیت وجولانیت کا خوب خوب مظاہرہ کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں الفاظ بولتے ہیں۔ صاف گوئی اور سلاست پسندی ان کا مسلک ہے۔ وہ قاری کو بھاری بھرکم الفاظ اور غیر ضروری کنایات وابہامات کے تانے بانے میں الجھائے رکھنے کے قائل نہیں ہیں۔ علم پروری اور ادب دوستی ان کی زندگی کا اہم سرمایہ ہے، جس کا اندازہ اس سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ ایک لمبے عرصے سے بیمار رہنے کے باوجود وہ مسلسل لکھتے پڑھتے رہتے ہیں۔ علم دوست افراد کی ہم نشینی انہیں بہت پسند ہے۔ کورونائی وبا کے دوران ڈاکٹرخان رضوان کے ذریعے میری ملاقات ڈاکٹرابرار رحمانی سے ہوئی۔ کئی دنوں کی مسلسل ملاقات نے ہمیں ان کی صلاحیت اور علمی گہرائی وگیرائی کا گرویدہ بنالیا،چناں چہ میں نے ایک دن ان کے ہاتھ میں ایک پرچہ تھمادیا جس میں انٹرویو کے سوالات تھے۔ پہلے تو وہ تیار نہیں ہوئے مگر ہم نے انہیں جلد ہی راضی بھی کر لیا۔ یہ انٹرویو ان کی ذاتی زندگی، ادبی اور تنقیدی گوشوں اور صحافت سے متعلق ہے۔ اس انٹرویو سے پہلے بھی ان کے دو انٹرویوز شائع ہوچکے ہیں جو کسی خاص نہج پر ہیں۔ میں نے ان سے گریز کرتے ہوئے سہ رخی انداز اس لیے اپنایاتاکہ ان کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ ان کی کتاب زندگی کے وہ گم شدہ اوراق جن سے قارئین عام طور پر بے خبر ہیں؛سامنے آجائیں۔ عام طورپر قاری فنکار کے فن سے تو خوب واقف ہوتا ہے مگر وہ ان خار دار وادی اوردشوار منزل سے بے خبر رہتا ہے جن کی خاک روبی نے فن کار کو کمال بخشاہے - غلام علی اخضر

پانچویں تک پڑھائی کی ہی نہیں تھی۔ چنانچہ میں پڑھائی سے جی چرانے لگا۔ عابدہ ہائی اسکول کا محل وقوع کچھ ایسا ہے کہ کسی کو بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔ ہمیں ایک ایسے بازار سے گزرنا پڑتا تھا جسے بازار حسن کہتے ہیں۔ یہ محلّہ چتر بھج استھان کے نام سے مشہور ہے۔ عام طور پر یہاں جسم فروشی کے نام پر چھاپے پکڑے جاتے ہیں اور گلوکاری، رقص وسرود کے فن کے نام پہ انھیں چھوڑ بھی دیا جاتا ہے۔ اسی چتر بھج استھان میں ایک مزار داتا کمبل شاہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں ہر سال عرس ہوتا ہے،

جس میں سب سے قیمتی چادر وہاں کی طوائفیں چڑھاتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ اس عمل سے ان کے سارے گناہ دھل جاتے ہیں۔ وہاں سے تھوڑی دوری پر مظفر شاہ کا مزار ہے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ شہر مظفر پور انھی کے نام پر ہے۔

خیر! اس کے بعد میں رام پور بھیج دیا گیا۔ جہاں درسگاہ اسلامی میں زبانی ٹسٹ کے بعد میرا داخلہ پانچویں جماعت میں ہوگیا اور میری تعلیم کا سلسلہ اپنی رفتار سے چل پڑا۔ میں نے وہاں آٹھویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ خواہش تھی کہ آگے کی پڑھائی علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی سے کروں گا، لیکن شاید خدا کو یہ منظور نہ تھا۔ میرے والد کی معاشی حالت خراب ہوگئی۔ چنانچہ دو تین سال میں نے مظفر پور میں ہی برباد کردیے۔ سنہ 75 میں، میں عظیم آباد یعنی پٹنہ چلا گیا۔ جہاں میں نے مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ میں فوقانیہ میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ہی میں نے میٹرک، ایک نائٹ اسکول سے کرلیا، اور پھر آئی اے۔ بی اے کی ڈگریاں بھی مدرسہ کے شانہ بہ شانہ ایک مارننگ کالج میں پڑھ کر حاصل کیں۔

غ ع ا: آپ کی پہلی تخلیق کس رسالے یا اخبار میں شائع ہوئی؟

ابرار رحمانی: میری پہلی تخلیق ایک چھوٹی سی کہانی تھی، جو ہندی کی نظم 'چینٹی رانی' پر مبنی تھی۔ یہ کہانی میری درس گاہ رام پور کے سالانہ میگزین 'کرنیں' میں شائع ہوئی، لیکن اب نہ وہ میگزین میرے پاس ہے اور نہ وہ کہانی۔ یوں بھی میری زندگی کے ساتھ بہت ساری کہانیاں جڑی ہوئی ہیں۔ کہاں کہاں اور کون کون سی کہانیاں میں سمیٹ رکھوں۔ یہ کہانیاں کچھ ایسی بھی نہیں کہ انھیں مجموعے کی شکل میں چھپوالوں۔

غ ع ا: آپ اپنی تصنیفات اور ان کے موضوعات سے آگاہ کرائیں؟

ابرار رحمانی: آپ نے بہت اہم سوال کیا ہے۔ میری پہلی تصنیف 'کلیم الدین احمد کی تنقید کا تنقیدی جائزہ' ہے، جو دراصل میرے پی ایچ ڈی کا مقالہ ہے۔ اس مقالے پر میری جتنی تعریف ہوئی اسے میں اپنی خوش نصیبی اور خوش بختی سے تعبیر کرتا ہوں۔ میری دوسری تصنیف میرے مختلف النوع مضامین کا مجموعہ 'تلخ و شیریں' ہے۔ جسے اس کے طرز شیریں اور شگفتہ بیانی کے سبب کافی پسند کیا گیا۔ تیسری کتاب غالب پر مضامین کا مجموعہ 'خزینۂ غالب' ہے۔ یہ مضامین ماہنامہ 'آجکل' میں شائع مضامین کا انتخاب ہے۔ اس کتاب میں 'دیباچہ' کے نام سے تفصیلی تحقیقی مضمون جو غالب کے ایک خط پر مبنی ہے پوری ایک بحث پر محیط ہے۔ یہ بحث ڈاکٹر کمال احمد صدیقی نے شروع کی تھی جسے ناچیز ابرار رحمانی نے آگے بڑھایا تھا اور پھر اس میں کچھ اور حضرات بھی شامل ہوئے۔ بحث دلچسپ تھی لہٰذا اسے کسی طور پر باذوق حضرات کے سامنے پیش کردیا۔ چوتھی کتاب 'جنگ آزادی کا درخشاں باب' ہے، جو اپنی تاریخی حیثیت کی وجہ سے پسند کی گئی۔ اردو میں عام طور پر اس موضوع پر کتابیں تو ہیں، لیکن اس میں کوئی گہرائی و گیرائی نہیں پائی جاتی۔ اس وجہ سے میری یہ کتاب پسند کی گئی اور قبول عام کا درجہ حاصل کرسکی۔ پانچویں کتاب 'سجاد ظہیر کی منتخب تحریریں' ہے جو نیشنل بک ٹرسٹ (این بی ٹی) کے لیے تیار کی گئی تھی۔ اس کتاب کا ٹائٹل کور مقبول فدا حسین کا تیار کردہ ہے۔ اس کتاب کو بھی پسندیدگی کی نظر سے دیکھا گیا۔ میری ایک کتاب 'اداریہ نویسی اور میرے اداریے' عام طور پر اردو ادب میں اور خاص طور پر اردو صحافت میں بہت مقبول ہوئی۔ یہ 'آجکل' میں لکھے گئے میرے 72 اداریوں کا مجموعہ ہے۔ جو جرنلزم کے طلبا کے لیے کافی سودمند ہے۔ یوں تو ادب یا صحافت میں کوئی چیز 'حرف آخر' نہیں ہوتی لیکن ہم نے اپنے کالم کے لیے اگر یہ عنوان سوچا ہے، تو اس کے پیچھے کوئی بات تو ضرور ہے۔ آپ بھی پڑھ کر دیکھیں۔

غ ع ا: آپ کی کاوشوں کو کس طرح اور کہاں کہاں سراہا گیا؟

ابرار رحمانی: اردو رسائل کے قارئین کے سنجیدہ حلقے میں میری کاوشوں کو عام طور پر سراہا گیا۔ ہمارے پاس روزانہ ایسے خطوط آتے رہے جن سے ہماری حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور میری کارکردگی کو اس سے جلا ملتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کچھ قارئین ایڈیٹر کی خوشامد اور چاپلوسی بھی کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے میں نے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کی جس کے لیے مجھے خسارہ بھی جھیلنا پڑا۔ آج کے دور میں سچے اور اچھے قارئین بہت کم ملتے ہیں۔ یوں بھی اب پرنٹ میڈیا کی جگہ الیکٹرنک میڈیا نے لے لی ہے چناں چہ اب خط و کتابت کا وہ سلسلہ نہیں رہا اور کمپیوٹر کے ذریعے خط و کتابت کی عادت نہیں پنپ سکی۔

آمدم برسر مطلب، ہماری کاوشوں کو نہ صرف سنجیدہ قارئین کی طرف سے بنظر تحسین دیکھا گیا بلکہ ملک کی مختلف اردو اکیڈمیوں نے میرے کام کو سراہتے ہوئے میری مختلف کتابوں پر انعامات سے نوازا۔ حالانکہ میں ان انعامات کا قائل نہیں ہوں۔ اردو رسالوں کے صفحات میری اس سوچ کے گواہ ہیں۔ سہ ماہی 'مژگاں' کلکتہ نے تو اس تعلق سے میرے خط کو شائع بھی کیا تھا۔

غ ع ا: 'آجکل' میں آپ بحیثیت مدیر ایک لمبے عرصے تک رہے، ایک مدیر کو کن چیلنجز یا پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے؟

ابرار رحمانی: بے شک میں آجکل جیسے عظیم اور اہم رسالے کا ایک لمبے عرصے تک بلکہ سب سے طویل مدت کے لیے ایڈیٹر رہا۔ اس لمبے عرصے میں ناچیز نے مختلف سرد و گرم صورت حال کا سامنا کیا۔ یہاں دوست و دشمن اور دشمن نما دوست سبھوں سے پالا پڑا اور بہت سے پہچانے بھی گئے اور بہت سے چلمن سے لگے بیٹھے رہے اور اخیر تک ٹھیک سے پہچانے نہیں گئے۔ مختلف اوقات میں مختلف گروہوں سے دو دو ہاتھ کرنے کا موقع ملا۔ جن کا ناچیز نے دنداں شکن جواب بھی دیا۔ لیکن ایک بڑے رسالے کے مدیر کی حیثیت سے اس کی گریما بنائے رکھنا بھی اپنے آپ میں ایک بڑا چیلنج ہوتا ہے۔ لہٰذا اس کا بھی خیال رکھنا ہوتا ہے۔ کسی کی مخالفت کرنا بہت آسان ہوتا ہے لیکن اس مخالفت کو جسٹی فائی کرنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا اپنی شرطوں پہ کیا اور اس پر بھی میں اصرار کروں گا کہ میں نے کچھ غلط نہیں کیا۔ دو ایک مثالیں لیجیے:

ہمارے رسالے میں ہر تحریر خواہ تخلیق ہو، تنقید ہو، تحقیق ہو یا شاعری سب کے لیے ایک معقول معاوضہ دیا جاتا ہے۔ چنانچہ ہم اپنے قلم کاروں سے امید رکھتے ہیں کہ وہ جو بھی چیز برائے اشاعت بھیجیں گے غیر مطبوعہ ہوگی، لیکن افسوس ہمارے بہت سے قلم کار بلکہ سینئر قلم کار نے ہماری اس بات کا سنجیدہ نوٹس نہیں لیا اور انھوں

اردو رسائل کے قارئین کے سنجیدہ حلقے میں میری کاوشوں کو عام طور پر سراہا گیا۔ ہمارے پاس روزانہ ایسے خطوط آتے رہے جن سے ہماری حوصلہ افزائی ہوتی تھی اور میری کار کردگی کو اس سے جلا ملتی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان میں سے کچھ قارئین ایڈیٹر کی خوشامد اور چاپلوسی بھی کیا کرتے تھے۔ ایسے لوگوں سے میں نے ہمیشہ دور رہنے کی کوشش کی جس کے لیے مجھے خسارہ بھی جھیلنا پڑا۔ آج کے دور میں سچے اور اچھے قارئین بہت کم ملتے ہیں۔ یوں بھی اب پرنٹ میڈیا کی جگہ الیکٹرنک میڈیا نے لے لی ہے چناں چہ اب خط و کتابت کا وہ سلسلہ نہیں رہا اور کمپیوٹر کے ذریعے خط و کتابت کی عادت نہیں پنپ سکی۔

نے بارہا ہمارے رسالے کو مطبوعہ تحقیقات کو غیر مطبوعہ کہہ کر دھوکہ دیا۔ چھپنے کے بعد جب ہمارے قارئین کی طرف سے اس کی شکایت ہوتی ہے تو ہمیں تکلیف ہوتی ہے اور ہمیں اپنے قارئین سے معذرت کرنی پڑتی ہے۔ اسی طرح قلم کاروں کا ایک طبقہ ہے جو اپنی چیزیں شائع نہ ہونے پر ہمیں طرح طرح کی دھمکیاں دیتا ہے۔

غ ع ا: کیا مغربی نقد وادب سے متاثر ناقدوں کی وجہ سے خدام اردو ادب کے اندر اردو کے تئیں احساس کمتری پیدا ہوا ہے۔

ابرار رحمانی: آپ نے بڑا اچھا سوال کیا ہے۔ بے شک انگریزی داں نقاد کے شبستان اردو تنقید میں داخل ہونے کے بعد وہ نقاد جو انگلش سے نابلد تھے فطری طور پر سہم سے گئے۔ خاص طور پر کلیم الدین احمد نے جب اردو تنقید پر لکھنا شروع کیا، تو ہلچل سی مچ گئی۔ اس کا ایک فطری نتیجہ یہ ہوا کہ خدام اردو ادب پہلو بدلنے لگے بغلیں جھانکنے لگے اور ان کے قلم میں لرزش پیدا ہو گئی۔ لیکن اس کا فائدہ بھی ہوا، جو اردو تنقید کچھوے کی رفتار سے چل رہی تھی وہ اب کسی تیز رفتار چیتا کی مانند دوڑنے لگی۔ کلیم الدین احمد سے پہلے احتشام حسین اور آل احمد سرور وغیرہ کا طوطی بولتا تھا لیکن جب کلیم الدین احمد نے اردو میں تنقید شروع کی تو پھر عالمی سطح کی بحث ہونے لگی۔ جس میں ہم نہ صرف انگریزی زبان وادب اور فرنچ، اسپینش اور دیگر زبانوں کے ادب کو بھی پڑھا اور سمجھا جانے لگا۔ ایسا نہیں ہے کہ کلیم الدین احمد سے پہلے اردو والے مغربی ادب سے بالکل نابلد تھے بلکہ حالی، شبلی، محمد حسین آزاد اور سرسید وغیرہ مغربی ادب کا مطالعہ کرتے تھے اور حتی الامکان اس سے استفادہ بھی کرتے تھے۔

غ ع ا: یونیورسٹی میں موجودہ ریسرچ کے نظام سے آپ کس قدر مطمئن ہیں؟

ابرار رحمانی: موجودہ ریسرچ نظام لچر ہے۔ طلبہ پوری تھیسس کہیں سے نقل کرکے اپنے نام سے جمع کر دیتے ہیں، اور انھیں بڑے فخر سے مبارک باد پیش کرتے ہوئے ڈگری ایوارڈ کر دی جاتی ہے۔ مجھے ایک معروف یونیورسٹی سے ایم فل کا ایک ڈزرٹیشن موصول ہوا۔ جو موجودہ اردو کے سب بڑے ادیب کی شخصیت اور کارنامے پر لکھا گیا تھا۔ آپ یقین مانیے اس ڈزرٹیشن پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہی میں مایوسی کا شکار ہو گیا۔ اردو ادب میں تحقیق کی اس پستی کو دیکھ کر میں کانپ سا گیا۔ یہ ڈزرٹیشن اس بڑے ادیب پر چھپی تین ضخیم کتابوں سے جستہ جستہ حصے لے کر تیار کیا گیا تھا۔ یہ عام صورت حال ہے۔ اس کے لیے کون ذمے دار ہے؟ نگراں یا طالب علم؟ طالب علم اگر چور ہیں تو اسے شہہ کہاں سے ملی۔ نگراں کی ذمے داری کیا ہوتی ہے۔ کیا صرف ان ڈزرٹیشن یا تھیسس پر بطور نگراں پروفیسر فلاں لکھ دینا کافی ہے۔

غ ع ا: آپ کو کلیم الدین احمد پر ریسرچ کرنے کا خیال کیسے آیا، کوئی خاص وجہ؟

ابرار رحمانی: پی ایچ ڈی میں داخلے کے پہلے سے ہی مجھے اردو تنقید کے تہی دست ہونے کا احساس ہو چلا تھا۔ چنانچہ میں نے مغربی ادب کی طرف بڑی حسرت سے دیکھنا شروع کیا۔ اور میں نے پایا کہ انگریزی ادب اور اردو ادب کو ایک ترازو پر نہیں تولا جا سکتا۔ لیکن اردو میری مادری زبان ہے اور ماں سے محبت نہ ہونا غیر فطری ہے۔ چنانچہ ان دونوں حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کلیم الدین احمد کا چہار دانگ شہرہ تھا۔ کلیم الدین احمد کی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' ایک سروے کے مطابق بیسوی صدی میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ثابت ہوئی۔ چنانچہ میں بھی شعوری لاشعوری طور پر کلیم الدین احمد کا گرویدہ ہو گیا۔ اور میں نے اسی وقت طے کر لیا کہ میں کلیم الدین احمد پر پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے ریسرچ کروں گا۔

> **موجودہ ریسرچ نظام لچر ہے۔ طلبہ پوری تھیسس کہیں سے نقل کرکے اپنے نام سے جمع کر دیتے ہیں، اور انہیں بڑے فخر سے مبارک باد پیش کرتے ہوئے ڈگڑی ایوارڈ کردی جاتی ہے۔مجھے ایک معروف یونیورسٹی سے ایم فل کا ایک ڈزرٹیشن موصول ہوا۔ جو موجودہ اردو کے سب بڑے ادیب کی شخصیت اور کارنامے پر لکھا گیا تھا۔ آپ یقین مانیے اس ڈزرٹیشن پر ایک نظر ڈالنے کے بعد ہی میں مایوسی کا شکار ہوگیا۔ اردو ادب میں تحقیق کی اس پستی کو دیکھ کر میں کانپ سا گیا۔**

غ ع ا: آپ اپنے زمانۂ طالب علمی کے کچھ اہم واقعات پر روشنی ڈالیں؟

ابرار رحمانی: جیسا کہ میں نے اپنی گفتگو کے شروع میں ہی عرض کیا ہے کہ میری تعلیم ایک طرح سے رام پور کی درسگاہ اسلامی سے شروع ہوئی۔ جہاں پانچویں کلاس میں میرا داخلہ ہوا اور وہاں سے میں نے آٹھویں تک اپنا تعلیمی سفر جاری رکھا۔ ہماری درسگاہ رام پور جو ہمارے عرصۂ قیام یعنی سنہ 71 سے 74 تک اپنے عروج پر تھی اور اس درسگاہ میں پورے ملک سے طلبہ آتے تھے۔ اس درسگاہ میں ہم اپنے خرچ پر تعلیم حاصل کرتے تھے۔ انھیں دنوں میرے والد محترم حفیظ الرحمٰن صاحب نے اسلامی رنگ ڈھنگ اپنانا شروع کیا۔ نتیجے میں انھوں نے اچانک ٹھیکیداری کا کام چھوڑ دیا اور ہم سڑکوں پر آ گئے۔ یہ ہمارے زمانۂ طالب علمی کا ایک بہت بڑا واقعہ بلکہ بہت بڑا سانحہ تھا۔ چونکہ وہ بہار کے ایک بڑے سرکاری ٹھیکیدار تھے۔ لاکھوں میں کھیلتے تھے۔ لیکن کوئی بھی بل بغیر رشوت کے پاس نہیں ہوتا تھا انھیں اس کا احساس تو شروع سے تھا لیکن اپنے کنبے کی روزی روٹی چلانے کے لیے کرہاً اور جبراً وہ اس کام کو کرتے رہے لیکن کب تک؟ ایک دن اللہ نے انھیں روشنی دکھائی اور وہ منزل کی تلاش میں نکل پڑے۔ وہ راہ راست پر تو آ گئے لیکن راہ راست پر چلنے کے لیے بھی پیٹ بہر حال بھرا ہونا چاہیے۔ 'بھوکے بھجن نہ ہوئے گوپالا' اور کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ ہم نے رمضان کے روزوں کی مانند دن گزارے۔ رازق بہر حال اللہ ہے اور ہم اس پر توکل کرتے رہے چناں چہ اللہ نے ایک بار پھر انھیں روشنی دکھائی اور وہ جناب حسنین سید صاحب دربھنگہ جو مولانا مودودی کے ساتھیوں میں رہ چکے تھے انھوں نے دہلی کے سہ روزہ دعوت اخبار میں جنرل منیجر کے طور پر کام پر لگوا دیا۔ اس پورے عرصے میں بھوک پیاس کے علاوہ جو چیز سب سے زیادہ متاثر ہوئی وہ میری تعلیم تھی۔ ہم سڑک پر تھے اور سر پر کھلا آسمان۔ لیکن ہم بھی کہاں ماننے والے تھے، ہم نے پٹنہ کا قصد کیا اور پٹنہ میں مدرسہ اسلامیہ شمس الہدیٰ کے مخدوش ہاسٹل میں سر چھپانے کے لیے وہاں داخلہ لے لیا۔ رہنے کا مسئلہ تو حل ہوا لیکن کھانے کا مسئلہ ابھی باقی تھا۔ یہاں بھی خیراتی لنگر کا کوئی نظم نہیں تھا۔ چنانچہ میں نے ٹیوشن پڑھانا شروع کیا یہاں بھی ایک افسوس ناک واقعے سے دوچار ہونا پڑا۔ صرف 25 روپے ماہانہ پر ٹیوشن پڑھاتا تھا وہ بھی مہینہ پورا ہونے پر اس شخص نے ہمیں پیسے نہیں دیے۔ خیر! پٹنہ میں بھی روزوں کی تعداد بڑھتی رہی۔ لیکن ہمارا یقین اس رازق پر اور مضبوط ہوتا چلا گیا۔ میں نے اپنے مدرسے کے چوکیدار کے بیٹے کو پڑھانا شروع کیا جس کے بدلے وہ مجھے دن کا کھانا کھلایا کرتے تھے۔ رات کا مسئلہ بھی اسی طرح حل ہوا کہ پٹنہ کے رمنہ روڈ میں ڈاکٹر محب احمد کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانا شروع کیا اور بدلے میں وہاں رات کا کھانا ملنے لگا۔ اس طرح ہم نے پٹنہ کو اپنا بنا لیا۔ لیکن مدرسہ میں رہتے ہوئے وہاں کے طلبہ پڑھائی کریں یا نہ کریں کھیل کود، غنڈا گردی اور سیاست ضرور کیا کرتے تھے۔ لیکن میں نے ایک چالاکی یہ کی کہ ان سب کے باوجود ایک نائٹ اسکول میں بھی داخلہ لے لیا جہاں بہت سارے لڑکے

پڑھنے کے لیے نہیں مٹرگشتی کے لیے آتے تھے۔

خیر! میں نے جے این یو میں داخلہ لے تو لیا لیکن وہاں بھی پیٹ کا مسئلہ آڑے آیا۔ چنانچہ میرے بہنوئی اجمل حسین نے تین سو روپے ماہانہ پر 'قومی آواز' میں بطور پروف ریڈر رکھوا دیا۔ لیکن تین مہینے کام کرنے کے بعد ایک پیسہ بھی نہیں ملا۔ چنانچہ میں نے 'قومی آواز' چھوڑ دینا مناسب سمجھا۔ اس وقت اردو میں ہندوستان کا سب سے بڑا اخبار قومی آواز کو مانا جاتا تھا۔ اس کا جب یہ حال تھا تو اوروں سے کیا امید کی جاسکتی تھی۔ یونیورسٹی سے مجھے اسکالرشپ مل گئی تھی جو 170 روپے ماہانہ تھی اور جو بعد میں ساڑھے تین سو روپیہ ماہانہ ہوگئی۔ اس سے ہمارا کھانے پینے کا بندوبست ہوگیا۔ دیگر ضروریات کے لیے ہاتھ پیر مارتا رہا لیکن اسی بیچ میری شادی کی بات چل پڑی۔ چوں کہ آپ نے زمانۂ طالب علمی کے واقعات سنانے کا مطالبہ کیا تھا اس لیے میں یہ بات کہہ رہا ہوں زمانۂ طالب علمی کا ایک بڑا واقعہ میری شادی کی شکل میں سامنے آیا۔ پٹنہ کی معروف شخصیت اور بزنس مین جناب محمود عالم صاحب نے ہم کو بتایا کہ آپ کے والد صاحب نے انتقال فرمانے کے ٹھیک پہلے مجھ سے اس رشتے کی بات کی تھی۔ میں نے بھی اپنے والد کی اس آخری خواہش کی تکمیل کی حامی بھرلی۔ چنانچہ 1985 میں نے محمود عالم صاحب کی بڑی صاحبزادی راحت جبیں سے شادی کرلی۔ اس کا منفی اثر میرے ایم فل کے نتیجے پر واضح طور پر پڑا۔

شاید پی ایچ ڈی کی ڈگری کا حصول بھی میرے زمانۂ طالب علمی کے بڑے واقعات میں سے ایک ہے۔ میں نے کلیم الدین احمد جیسے سخت گیر اور بیباک نقاد پر پی ایچ ڈی کرلی۔ اس تھیسس میں میں نے بھی اپنی سخت گیری اور بے باکی کو پوری طرح سے برقرار رکھا۔ اور میں نے ایسا کوئی بھی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا، جس میں کلیم الدین احمد کی مغرب زدگی اور ان کی زیادتیوں کو طشت ازبام نہ کیا ہو۔

غ ع ا: اردو نہ جاننے والوں کے درمیان ہم کس طرح فروغ اردو کے لیے کام کریں؟

ابرار رحمانی: بہت اچھا سوال کیا ہے آپ نے۔ اس کے لیے ذرا ہمیں پیچھے مڑکر دیکھنا ہوگا۔ ایک زمانہ تھا جب ہندوستان میں زندگی کے تمام شعبوں میں اردو کا بول بالا تھا مثال کے طور پر فلموں کو ہی لے لیں۔ فلموں میں کام کرنے کے لیے اردو کا جاننا نہایت ضروری سمجھا جاتا تھا اور پوری فلم انڈسٹری میں چاہے وہ ہیرو ہیروئن ہوں یا ہدایت کار یا اس سے متعلق دوسرے شعبے مثلاً نغمہ نگاری اور موسیقی سبھوں کے لیے اردو کا جاننا ضروری نہایت ضروری تھا۔ دوسری طرف جب اس ضرورت کے تحت اردو رسم الخط کی ثقالت اور پیچیدگی اردو زبان کی ترویج و ترقی میں آڑے آنے لگی تو رسم الخط کی تبدیلی پر زور دیا جانے لگا اور عصمت چغتائی اور ان جیسے دوسرے اردو ادیبوں نے اس کا اسکرپٹ دیوناگری ہندی کرنے کی وکالت شروع کردی۔ کچھ حضرات اسے رومن اسکرپٹ میں لکھنے کا مشورہ دینے لگے۔ جہاں تک آپ کے سوال "غیر اردو داں حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جاسکتی ہے؟" تو عرض ہے کہ جب تک دوسری زبانوں کے اسکرپٹ کا سہارا لیا جاتا رہے گا اس زبان کے تعلیم و تعلم اور درس و تدریس میں پریشانی آتی رہے گی۔ ہمیں براہِ راست جس زبان کو سیکھنا اور سکھانا ہے ہمیں اسی زبان کو استعمال کرنا ہوگا۔ عام طور پر بہت سے اردو والے اسے مختلف اسکرپٹ کے ذریعے سے اردو زبان کو سیکھنے اور سکھانے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ جب کہ میرا تجربہ ہے اردو زبان ہو یا کوئی اور زبان اس کو اسی کے رسم الخط میں سیکھنا اور سکھانا ضروری معلوم ہوتا ہے بلکہ یہی صحیح طریقہ نظر آتا ہے۔ میں جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں غیر اردو داں طلبہ خاص طور پر ہسٹری کے طلبہ کو اردو پڑھاتا تھا۔ اردو کا سیکھنا ان طلبہ کے لیے لازمی تھا کہ تاریخ کی تحقیق و تفتیش میں اردو کی شد بد کا ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ دور متوسط کی تاریخ بلکہ جدید تاریخ میں بھی سرکاری دستاویزات، بادشاہ کے فرامین اور احکامات اردو اور فارسی میں ہی ہوا کرتے تھے اس لیے اس رسم الخط سے واقفیت ضروری تھی۔ ہاں تو میں ان غیر اردو داں طلبہ کو پڑھایا کرتا تھا اور ہمیں سب سے زیادہ آسان اور عام فہم کتاب حیات اللہ انصاری کی 'اردو پرائمر' دس دن میں اردو' بہت مفید اور کارآمد معلوم ہوئی۔ ہم اس اردو کتاب کے توسط سے دس دن میں اردو تو نہیں سکھا پاتے تھے لیکن یہ ضرور ہے کہ ہم ایک سمسٹر میں ہر طالب علم کو لالا، تالا سے شروع کرکے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' تک پڑھنے لکھنے اور سمجھنے کے قابل بنا دیا کرتے تھے۔

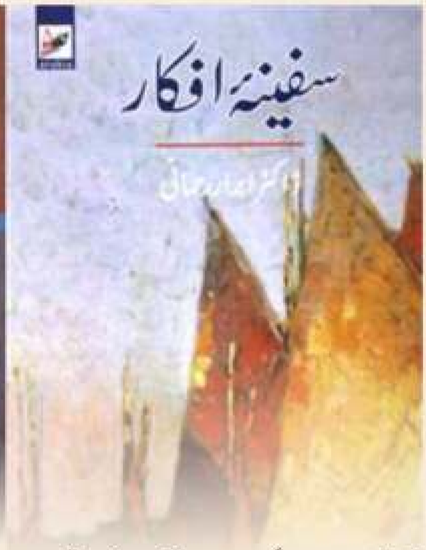

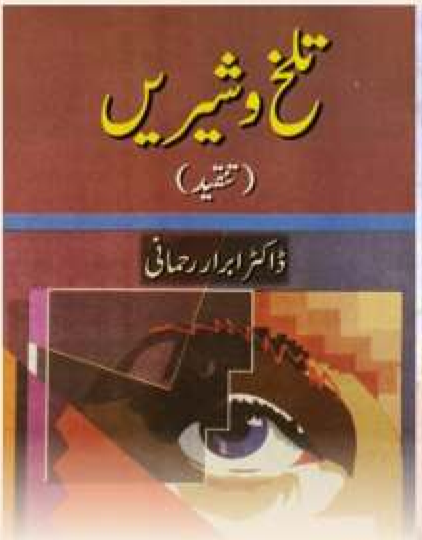

غ ع ا: کیا کوئی زبان صرف شعر و ادب کی بنیاد پر ترقی کرسکتی ہے۔ کیا سائنسی، سماجی اور سیاسی مواد کے بغیر اسے ثروت مند بنایا جاسکتا۔

ابرار رحمانی: تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ کوئی بھی زبان جس میں سائنسی و سماجی مواد کی کمی ہو تو یہ ایک بہت بڑی کمی ہے۔ اور اس میں کمی کا احساس تو ہوگا ہی۔ جس کے منفی اثرات پڑنا لازمی ہیں۔

غ ع ا: نئی نسل کے صحافیوں کے لیے آپ کچھ کہنا چاہیں گے؟

ابرار رحمانی: میں نے اپنے بزرگ صحافیوں میں حیات اللہ انصاری اور عشرت علی صدیقی سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ بطور خاص عشرت علی صدیقی بہت دور اندیش صحافی تھے۔ چنانچہ کل کیا ہونے والا ہے۔ ایک ہفتے بعد کیا ہوگا اور ایک مہینے کے بعد کیسا ماحول ہوگا، ان سب کا اندازہ انھیں بہت پہلے سے ہوجاتا تھا۔ چنانچہ اسی حساب سے تیاری بھی کرلیتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ جب کشمیر کے وزیر اعلیٰ شیخ عبداللہ موت و زیست کی جنگ لڑ رہے تھے تو عشرت علی صدیقی نے ان پر ان کی زندگی میں ہی ایک اچھا سا اداریہ لکھا، اچھی اور خوبصورت سی کتابت کروائی اور بہترین پروف ریڈنگ کرنے کے بعد ہمیں یہ کہتے ہوئے کہ دس دن میں اسے قومی آواز میں لگا دینا۔ ایسا ہی ہوا واقعی وہ بہت دور اندیش تھے۔ میں ان کی دور اندیشی کا قائل ہوگیا۔

ہم اپنی نئی نسل کے صحافیوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اپنے بزرگ صحافیوں سے کسب فیض ضرور کریں لیکن پرانی لکیروں کو پیٹتے نہ رہیں۔ بلکہ اپنے حال کی فضا اور ماحول کو پیش نظر رکھتے ہوئے محنت، لگن، بے باکی، بے خوفی اور سچائی کے ساتھ کام کرتے رہیں۔ ایک دن یقیناً آپ ایک اچھے صحافی، ایک اچھے ادیب اور ایک اچھے انسان ثابت ہوں گے۔

■

Gholam Ali
Samar Apartment R-197/401
4th Floor Jogabai Extn.
Jamia Nagar New Delhi
Mob: 7275989646

تذکرۂ حسینی کی

ادبی، تاریخی اور انتقادی ارزش و اہمیت

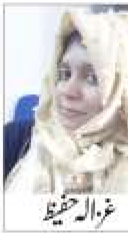

غزالہ حفیظ

ہندوستان میں تذکرہ نویسی کا رواج زمانۂ قدیم سے ہی چلا آرہا تھا۔ اس ملک میں بہت سے تذکرے لکھے گئے ہیں جن کو تاریخی، علمی، انتقادی اور ادبی اعتبار سے بہت اہمیت حاصل رہی ہے لیکن بارہویں صدی ہجری تذکرہ نویسی کے اعتبار سے خصوصی اہمیت وعظمت کی حامل رہی ہے اس زمانے میں فارسی زبان کے متعدد تذکرے تالیف ہوکر منظرعام پر آئے حتیٰ کہ اردو شاعروں کے تذکرے بھی فارسی زبان ہی میں لکھے گئے، جنھوں نے اردو اور فارسی دونوں ہی زبانوں کے ادب کو وقیع اور ذی قیمت بنانے میں ایک اہم اور بنیادی کردار ادا کیا۔ بارہویں صدی ہجری میں تالیف کیے گئے اہم اور قابل ذکر تذکروں میں خزانۂ عامرہ، سرو آزاد، صحف ابراہیم، گلزار ابرار، مجمع النفائس، باغ معانی، سفینۂ ہندی، تذکرۂ معاصر، تذکرۃ الشعرا، سفینۂ خوشگو، کلمات الشعرا، مراۃ الشعرا، ید بیضا، شام غریباں، عقد ثریا، ریاض الشعرا، گل رعنا، منتخب حاکم، خلاصۃ الافکار، تذکرہ نو بہار وغیرہ قابل ذکر ہیں، ان کے علاوہ بھی بے شمار فارسی تذکرے منظر عام پر آئے جن کی علمی وادبی اہمیت نے اہل وطن ہی کو نہیں بلکہ خود اہل زبان کو بھی ان سے استفادے پر مجبور کر دیا۔ اسی عہد کا ایک مشہور ومعروف تذکرہ 'تذکرہ حسینی' ہے جو کہ بارہویں صدی ہجری کے ایک قدآور علمی وادبی شخصیت میر حسین دوست سنبھلی کا ترتیب دیا ہوا ہے۔ یہ تذکرہ فارسی ادب میں خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ یہ تذکرہ میر حسین دوست سنبھلی کا ایک بہترین اور عظیم ادبی کارنامہ ہے یہ بارھویں صدی ہجری میں لکھے جانے والے تذکروں میں نمایاں مقام اور انفرادی اہمیت رکھتا ہے۔

حسین دوست سنبھلی ہندوستان کے ایک تاریخی شہر 'سنبھل' سے تعلق رکھتے تھے۔ سنبھل قدیم زمانے سے ہی علم وادب کا مرکز شمار کیا جاتا ہے۔ روہیلکھنڈ فارسی زبان وادب کی تاریخ میں انفرادی اہمیت کا حامل ہے اور سنبھل کا علاقہ اسی کا ایک حصہ ہے۔ یہ علاقہ فارسی زبان وادب کی تاریخ میں دہلی سلطنت کے قیام کے بعد 'کٹھر' کے نام سے جانا جاتا رہا ہے۔ قدیم زمانے میں یہ شہر علم وادب کے اعتبار سے مرکزی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ تاریخ کی کتابوں اور پرانی دستاویزوں میں اس جگہ کو 'سرکار سنبھل' لکھا گیا ہے۔

ابتدائی دور سے لے کر آج تک اس شہر میں علم و ہنر کے ہر میدان میں ممتاز، نامور اور مقبول شخصیات پیدا ہوئی ہیں، جن میں 'شیخ حاتم سنبھلی'، 'شیخ احمد سرہندی'، 'مجدد الف ثانی'، 'مولانا تاج الدین سنبھلی' وغیرہ جیسے دانشوران ادب کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ مذکورہ بالا دانشوروں کے علاوہ بھی بے شمار علما، ممتاز ادبا، معروف فضلا اور غیر معمولی صلاحیت رکھنے والے فنکار اور صناع بھی موجود رہے ہیں۔ اس جگہ سے تعلق رکھنے والے کئی تاریخ نویس، تذکرہ نگار اور سیاسی رہنما پوری فارسی دنیا میں آج بھی احترام وقدر کی نظروں سے دیکھے جاتے ہیں۔ ان عظیم شخصیات میں صاحب کتاب 'اسراریہ' 'سید کمال سنبھلی' جیسے مورخ کا نام بھی شامل رہا ہے اور 'میر حسین دوست سنبھلی' جیسے تذکرہ نگار بھی جو اس صدی اور اس شہر کی اہم شخصیت شمار کیے جاتے ہیں۔ میر حسین دوست سنبھلی کی عالمانہ اہمیت وعظمت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کو اپنے زمانے میں مختلف خطابات اور القاب سے نوازا گیا تھا مثلاً 'افضل العلما'، 'مورخ بے عدیل'، 'ماہر علوم خفی وجلی' وغیرہ، انھیں شہر سنبھل کے پہلے تذکرہ نگار ہونے کا شرف بھی حاصل ہے، میر حسین اپنے عہد کے اردو و فارسی زبان کے بہترین شاعروں میں بھی شمار کیے جاتے تھے لیکن افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ فارسی ادب کی اتنی اہم اور مشہور شخصیت کے حالات زندگی کے سلسلے میں ہمیں کوئی تسلی بخش معلومات نہیں ملتی ہیں، البتہ خود انھوں نے اپنے تذکرے میں اپنی زندگی کے مختصر حالات کے متعلق ایک خاکہ پیش کر دیا ہے جس سے ان کی حیات وخدمات کے بارے میں تھوڑی بہت آگاہی حاصل ہو جاتی ہے۔ اس دور کے تذکروں میں ان کا نام 'میر حسین دوست'، تخلص حسینی یا ذاکر اور وطن سنبھل لکھا گیا ہے مثلاً صاحب تذکرہ 'گلشن سخن' ان کے نام اور وطن کے سلسلے میں لکھتا ہے:

''اسمش میر حسین دوست، متوطن مراد آباد سنبھل۔''

(گلشن سخن: تذکرہ شعرائی اردو، مبتلا مردان علی خان مبتلا لکھنوی مرتبہ مسعود حسن رضوی ادیب، نظامی پریس لکھنؤ، 1965، ص 24)

اس کے علاوہ اس دور کے ایک اور مشہور ومعروف تذکرے 'تذکرۂ عشقی' میں حسینی کا وطن مراد آباد اور تخلص ذاکر تحریر کیا گیا ہے صاحب تذکرہ نے اس سلسلے میں مندرجہ ذیل الفاظ لکھے ہیں:

''ذاکر تخلص، موسوم بہ میر حسین دوست از ساکنان مراد آباد بود، احوالش معلوم نیست''

(تذکرہ عشقی، شیخ محمد وجیہ الدین عشقی عظیم آبادی مترجم ومرتب عطاء الرحمن عطا کاکوی، رئیس ادارہ تحقیقات عربی وفارسی، پٹنہ، 1969، ص 78)

میر حسین دوست سنبھلی کی تعریف وتوصیف نہ صرف ان کے معاصرین نے کی ہے بلکہ متاخرین بھی ان کے بے پناہ علم وادب کے معترف ہیں اور ان کو اپنے دور کی یگانہ عصر ادبی شخصیت تصور کرتے ہیں۔ ان کے ادبی آثار نہ صرف ان کے دور میں قابل استفادہ رہے تھے بلکہ بعد کے لوگوں نے بھی ان سے بھرپور استفادہ کیا ہے اور آج بھی کر رہے ہیں۔ تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ میں میر حسین کے بارے میں مندرجہ ذیل عبارت نقل کی ہے:

''میر حسین دوست ابن سید ابوطالب ساکن سنبھل میں ضلع مراد آباد۔ آپ نے 1749 میں تذکرۂ حسینی مرتب کیا تھا جو 1875 میں مطبع نول کشور نے شائع کیا تھا۔ آپ نے 19 سال کی عمر میں دہلی میں جاکر شیخ فضل قدس سرہٗ سے اکتساب علم کیا تھا، وہاں طویل عرصہ تک قیام کیا اور شعرائے باکمال کی صحبت میں رہ کر شاعری میں کمال حاصل کیا۔ بھا کا شاعری میں میر غلام نبی غلام عابدی سے استفادہ کیا۔ میر صاحب موصوف حضرت مرزا مظہر جان جاناں دہلوی (1195ھ مطابق 1781) کے بھی استاد تھے۔''

(تاریخ شعرائے روہیلکھنڈ جلد چہارم، سید تعظیم علی نقوی شایان بریلوی، ص 2619 کراچی)

میر حسین دوست سنبھلی کے خاندان کے متعلق بھی کوئی تسلی بخش اطلاعات فراہم نہیں ہوتی ہیں البتہ ان کے اپنے تذکرے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے والد کا نام مولوی سید ابو طالب تھا جو اپنے عہد کے دانشوروں میں ایک مشہور اور مایہ ناز شخصیت شمار کیے جاتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اپنے والد ہی کی نگرانی میں شروع ہوئی لیکن جائے تاسف یہ ہے کہ اس عظیم شخصیت کی باضابطہ ابتدائی تعلیم کے سلسلے میں بھی ہماری معلومات نا کے برابر ہیں۔ ان کے تذکرے سے ہی پتہ چلتا ہے کہ میر حسین دوست سنبھلی جب 19 سال کے ہوئے تو وہ اپنے وطن عزیز کو خیر آباد کہہ کر' شیخ فضل اللہ' کی خدمت میں پایۂ تخت شاہ جہاں آباد یعنی دہلی پہنچے اس سفر کا مقصد حصول علم تھا۔ دہلی کی دلکش علمی فضا نے ان کے مزاج پر بڑے مثبت اثرات مرتب کیے اور یہاں انھوں نے یکسوئی کے ساتھ تحصیل علم کی طرف توجہ کی اور اپنے دور کے مروجہ علوم پر دستگاہ حاصل کرنے کے لیے سخت محنت کی اور دہلی کے مشہور ومعروف اساتذہ سے کسب فیض کیا۔ شیخ فضل اللہ کی شخصیت نے بھی ان کے ذہن پر بڑے گہرے اور ہمہ گیر نقوش قائم کیے، میر حسین فارسی زبان وادب پر گہری نگاہ رکھتے ہیں، ان کے آزاد مزاج کو شعر و شاعری سے بہت رغبت تھی۔ دہلی میں ان کو کئی باکمال شاعروں کی بھی صحبت میسر آئی جن کی وجہ سے ان کو شعر کہنے کی تحریک ملی، حالانکہ ان کے کلام کا کوئی مجموعہ ہم تک نہیں پہنچا ہے صرف جستہ جستہ اشعار کتابوں کی زینت بنے ہوئے ہیں، جن سے ان کے ایک قادر الکلام شاعر ہونے کا احساس ہوتا ہے۔

'تذکرہ حسینی' میر حسین دوست سنبھلی نے بسم اللہ کے بعد اللہ پاک کی ثنا و ستائش و توصیف سے شروع کیا ہے اور اس کے بعد اپنا مختصر ترین تعارف پیش کرتے ہوئے 'تذکرہ حسینی' کا سبب تالیف بیان کیا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس تذکرے میں جانے انجانے راہ پاجانے والی اغلاط کے لیے معذرت بھی طلب کی ہے۔

مولف نے یہ تذکرہ اپنے زمانے کی مشہور، معروف اور نامور شخصیت حضرت شاہ شرف الدین کے نام معنون کیا ہے ان کی تحریروں سے اس بات کا بھی بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں شاہ شرف الدین کی ذات گرامی سے والہانہ لبستگی اور شیفتگی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے تذکرے میں بھی ان کی تحسین وتوصیف میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا ہے۔ ذیل میں چند سطور نقل کی جارہی ہیں۔

'تذکرہ حسینی' منشی نول کشور سے چھپ چکا ہے اور اس کے علاوہ ڈاکٹر کشور جہاں زیدی نے اس کا اردو ترجمہ بھی کر دیا ہے جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ یہ تذکرہ ادبی، تاریخی اور انتقادی اعتبار سے خاصا پر ارزش ہے اور دانشوروں نے ہر زمانے میں اس پر اپنی توجہ مبذول رکھی ہے۔

یہ تذکرہ شیخ ابوالحسن خرقانی سے شروع ہو کر یوسفی خراسانی پر اختتام پزیر ہوتا ہے۔ الفبائی ترتیب کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس میں صاحب تذکرہ نے بغیر کسی تفریق وترتیب کے متقدمین اور معاصرین دانشوروں اور صوفیوں کا ذکر کیا ہے اس تذکرہ میں شعرا، عارفین، سلاطین، صلحا، عارفین، مشائخ اور ادیبوں وغیرہ کا ذکر قدرے مختصر انداز میں کیا گیا ہے لیکن بعض عارفین، شاعروں اور صوفیوں وغیرہ کے تفصیلی حالات بھی بیان کیے گئے ہیں مثلاً خواجہ معین الدین چشتی، شیخ نجم الدین کبری، شیخ عبدالقادر جیلانی، شیخ مجد الدین بغدادی اور حضرت نظام الدین اولیا وغیرہ کا ذکر بہت تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے خاص طور پر اس تذکرے میں صوفی شاعروں کے متعلق بڑی سیر حاصل اور پر مغز گفتگو کی گئی ہے اور ان کے احوال وکمالات کو بہت شرح وبسط کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ اب ذیل میں چند افراد کے نام دیے جارہے ہیں جن کے متعلق صاحب تذکرہ نے بڑی تفصیلی گفتگو کی ہے اور ان حضرات کے بارے میں جتنی بھی معلومات فراہم ہو سکتی تھیں وہ سب بہم پہنچائی ہیں اور ان کی زندگی کے ہر قابل ذکر واقعے کو بیان کرنے کے سلسلے میں غیر معمولی دلچسپی دکھائی ہے مثلاً شیخ ابوالحسن خرقانی، ابوسعید ابوالخیر، احمد جام، ابواسمٰعیل، شیخ جلال الدین آذری، بایزید بسطامی، بیدل، جلال الدین رومی، عبدالرحمان جامی، حسن دہلوی، حافظ شیرازی، خسرو دہلوی، وطواط جمال الدین سلیمان، مرزا شرف جہاں قزوینی، شیخ فریدالدین گنج شکر، قطب الدین محمد بختیار کاکی، قاسم انوار، شیخ عبدالقادر جیلانی، خواجہ معین الدین چشتی، نظام الدین گنجوی، نجم الدین کبری وغیرہ جیسے علما و مشائخ کا ذکر بڑے ہی تفصیلی، دل چسپ اور پر شکوہ انداز میں قلم بند کیا ہے۔

اب ذیل میں کچھ ایسے شاعروں، ادیبوں اور مشائخ وغیرہ کے نام دیے جارہے ہیں جن کے بارے میں صاحب تذکرہ حسینی نے بہت ہی کم اور مختصر اطلاعات فراہم ہیں بلکہ کہیں کہیں تو حسینی نے صرف ان کے نام ہی درج کیے ہیں یا پھر محض ایک یا دو سطروں میں ان کا تعارف پیش کر دیا ہے اور شاعر کے ایک یا دو شعر یا محض ایک رباعی یا قطعہ وغیرہ دے کر ہی بات ختم کر دی ہے جس کی وجہ سے اس کی تحریروں میں یک گونہ تشنگی پیدا ہوگئی ہے جو پڑھنے والے کو کسی خاص سمت کی طرف گامزن نہیں کر پاتی۔ ان میں سے کچھ خاص شاعروں اور مصنفوں وغیرہ کے نام ہیں۔ آصف، ابراہیم شیرازی، ابوطالب تبریزی، اہلی، اپی، اتقا، انیسی، ایوب، اسی، اصلی، اسیر، اصغر، افضلی، محمد کاظم آگاہ، آلی، آمین، مرزا تقی مازندرانی، ثبات، باقر، برہان، بردی، بساط، پیام، تعظیمائی، ثبات، جعفر، جنوی قندہاری، حمیدی، حبیب، حشامی، حجت، حسن، حسین، حضری، حاصلی، حقیر، حیدر، خاکسار، خاکی، خاوری، خلقی، خلیق، خلیل، خیالی، خالص، دانا، دردمند، دری، دوست، دوستان، راسخ، راسخ، راسخ، رسا، رضا، رضوان، رونقی، رہبری، زکی، زاہد، سامی، سوزی، سہلی، شعلہ، شکوی، شمشی، صادقی، صانعی، صحفی، صدقی، صرفی، ضیفے، طالب، طاہر، ملاطا فروغی، فسونی، فوجی، فیضی، قابل، قاضی، قاسمی، قانعی، قسمت، کاسب، کاہی، کمالی، لدنی، مائلی، متاسب، مجاور، مجنون، محترم، محمد بیگ، محسن، ندیم، نسبت، نظام، نکہت، نوراللہ، نہانی، واحد، والی، واثق، وحدت، وحشت، ہاشم، ہجرے، ہلالی، ہمتی، لائق، یقینی اور یوسفی وغیرہ۔ ان کا ذکر بڑے ہی سرسری اور غیر جامع انداز میں پیش کیا گیا ہے اور دیگر تاریخی کتابوں یا تذکروں میں بھی ان کا کوئی ذکر نہیں ملتا جس کی وجہ سے ہم ان کے بارے میں کوئی حتمی اور یقینی رائے پیش کرنے سے قاصر ہو جاتے ہیں۔

تذکرہ حسینی میں مذکورہ شاعروں کی تعداد کے سلسلے میں محققین کے درمیان زبردست اختلاف پایا جاتا ہے، بعض دانشوران ادب نے ان کی تعداد 200 بتائی ہے جبکہ سید علی رضا نقوی نے اپنی کتاب 'تذکرہ نویسی در ہندو پاک' میں ان شعرا کی تعداد 445 بتائی ہے اس کے بر خلاف مشہور ومعروف محقق آقائے گل چین معانی کے مطابق طبع شدہ کتاب میں ان شاعروں اور ادیبوں کی تعداد 564 کے آس پاس ہے اس سلسلے میں وہ مندرجہ ذیل عبارت نقل کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تذکرہ ایست مختصر در تراجم پانصد و شصت و چہار نفر از شعراء و فضلا و ملوک و عرفاں قدیم و جدید بہ ترتیب الفبا کہ یتمنا با حضرات امیر (ع) شروع شدہ و بہ یوسفی طبیب ختم شود۔''

(تاریخ تذکرہ ہای فارسی، احمد گلچین معانی جلد اول، مشہد ایران، 1347، ص 210)

'تذکرہ حسینی' کی ایک قابل ذکر خصوصیت یہ بھی ہے کہ اس میں شاعرات کے بارے میں بھی بڑی دلکش اور دلچسپ معلومات فراہم کی گئی ہے مطبوعہ تذکرہ حسینی میں تقریباً سات '7' ایسی شاعرات کا ذکر ملتا ہے جو اپنے عہد کی بہترین اور فی البدیہہ شعر کہنے والوں میں سرفہرست تھیں اور انھوں نے نہایت دل کش اور شیریں شاعرانہ آثار یادگار چھوڑے ہیں مثلاً ایک جگہ صاحب تذکرہ نے

مشہور شاعرہ بی بی دولت کے بارے میں ایک حکایت نقل کی ہے کہ یہ خاتون بے بصارت لیکن بابصیرت شاعرہ تھیں اور اچھے شعر کہنے کے ساتھ ساتھ نہایت شوخ طبع اور خوش مزاج بھی تھیں سمرقند کی رہنے والی تھیں ایک مرتبہ جب امیر تیمور نے سمرقند پر حملہ کیا اور اتفاق سے ان کی ملاقات دولت سے ہوگئی۔ فی الفور ایک شعر پڑھا۔

آتش در شہر سمرقند باد　　　　این تمر لنگ چو اسپند باد

ترجمہ: سمرقند شہر میں آگ (روشنی) اس طرح قائم رہے اور تیمور لنگ اسپند کی طرح یہاں رہے۔

بادشاہ یہ شعر سن کر بہت زیادہ متاثر ہوا اور تہہ دل سے اس کی حاضر جوابی اور ذہانت کا قائل ہو گیا اس نے فوراً اس شاعرہ سے اس کا نام پوچھا؟ جواب ملا 'دولت' بادشاہ نے کہا دولت تو اندھی نہیں ہوتی ہے، دولت نے شوخ انداز میں جواب دیا کہ اگر دولت اندھی نہ ہوتی تو تم جیسے لنگڑے کے پاس نہ آئی ہوتی۔

اس تذکرے میں اکثر بادشاہوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے اور ان کی شاعرانہ عظمتوں کے سلسلے میں بڑی قیمتی اور پرارزش آرا قلم بند کی گئی ہیں یہ اپنی نوعیت کا غالباً پہلا ایسا تذکرہ کہا جاسکتا ہے جس میں صاحب تذکرہ نے شاعروں کے ساتھ ساتھ بادشاہوں کے متعلق بھی اپنی قیمتی آرا کو پیش کیا ہے جب کہ اس دور کے بیشتر تذکرہ نویسوں نے صرف شاعروں، ادیبوں اور عارفوں وغیرہ کے حالات ہی قلم بند کرنے پر اکتفا کیا ہے لیکن یہ حسینی کا خاص وصف ہے کہ اس نے ہر شاعر کو اپنے تذکرے میں جگہ دی ہے خواہ وہ کسی مقام اور منصب پر فائز ہو یا اس نے کوئی بھی پیشہ اختیار کیوں نہ کیا ہو حتی کہ کفش گر، نقارچی، موچی، نقاش، داروغہ، بیل بوٹے بنانے والے لوگوں کو بھی اپنے تذکرے کی زینت بنایا ہے جو اس بات کا ثبوت ہے کہ حسینی صرف اور صرف علم و فن کا قدر دان تھا اس کے نزدیک پیشے سے کوئی چھوٹا بڑا، اچھا برا، اعلیٰ ادنیٰ اور امیر غریب نہیں تھا بلکہ انسان کا علم و فن اس کے نزدیک اہمیت رکھتا تھا اس کے علاوہ اس میں صاحب کتاب نے کئی ایسے بادشاہوں کا ذکر کیا ہے جو صاحب سیف ہونے کے ساتھ صاحب قلم اور نکتہ سنج بھی تھے اور انھیں بادشاہت کے ساتھ ساتھ شعر و شاعری میں بھی مہارت تامہ حاصل تھی۔

اس تذکرے کی ایک اور اہم خصوصیت یہ ہے کہ صاحب تذکرہ نے اپنے تذکرے میں کچھ ایسے اشخاص کے بارے میں بھی بتایا ہے جو غیر معروف اور گمنام ہیں اور ان کا ذکر اس عہد کی دیگر کتابوں میں نہیں ملتا ہے اور اگر ملتا بھی ہے تو بہت ہی مختصر، غیر جامع اور تشنہ ہے۔ اگر ہم میر حسین دوست سنبھلی کی انتقادی صلاحیتوں کا مطالعہ ومحاسبہ کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ صاحب تذکرہ بہترین انتقادی صلاحیتوں کا مالک تھا اور خود بھی شعر کہتا تھا اس لیے شعر کے محاسن ومعائب پر اس کی گہری نظر تھی وہ شعر کے حسن وقبح کا ایک بہترین ناقد ادب کی طرح محاسبہ ومعاینہ کرتا ہے اور بعض اوقات شاعروں کے کلام کا دوسرے شعرا کے کلام کے ساتھ موازنہ کرتا ہے اور اپنے نظریات کا برملا اظہار بھی کرتا ہے۔

میر حسین دوست نے اپنی کتاب تذکرہ حسینی میں کئی ایسے مشہور ہندو شاعروں کا بھی ذکر کیا ہے جو شعر گوئی میں اہل زبان کے مساوی مقام ومرتبہ کے حامل تھے اور ان کی اہمیت وعظمت کا لوہا صرف اہل زبان نے بھی مانا تھا۔ ان ہندو شعرا میں ایک اہم اور قابل ذکر نام منشی امانت کا ہے یہ ایک قادر الکلام شاعر تھا جو لال پور کے کھتری خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس شاعر کی شہرت گرد ونواح میں پھیلی ہوئی تھی، منشی امانت رائے کا قابل ذکر کارنامہ یہ ہے کہ اس نے 'بھاگوت' اور 'نایکا بھید' وغیرہ کا ہندی زبان سے فارسی زبان میں ترجمہ کیا تھا جس کو فارسی زبان وادب میں قبول عام حاصل ہوا، اس کے علاوہ ایک اور اہم ہندو شاعر منشی چندر بھان برہمن کا ہے جو کہ اکبر آباد سے تعلق رکھتا تھا وہ بادشاہ شاہ جہاں، شہزادہ دارا اور اورنگ زیب عالمگیر وغیرہ جیسے عظیم مغل سلاطین کے درباروں سے وابستہ تھا۔ اس نے کئی منثور آثار کے علاوہ اپنا ایک بہترین دیوان بھی یادگار چھوڑا ہے۔

تذکرہ حسینی میں ایک اور اہم اور قابل ذکر ہندو شاعر محمد افضل سرخوش ہے سرخوش جو کہ عالمگیر کے دور کا ایک اہم ہندو شاعر ہونے کے علاوہ ایک بہترین نثر نویس تصور کیا جاتا ہے، مذکورہ بالا ہندو شاعروں کے علاوہ بھی کئی اور شاعروں کا ذکر ملتا ہے اور صاحب تذکرہ نے بڑی کشادہ ظرفی اور وسیع النظری کے ساتھ ان کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ تذکرۂ حسینی کا طرز نگارش بہت سادہ، سہل اور رواں ہے اختصار میں جامعیت اس تذکرے کا وصف خاص ہے صاحب تذکرہ بہت مختصر اور نپے تلے الفاظ میں کسی شاعر یا ادیب کے بارے میں اس کے احوال وکلام کو پیش کرتے ہیں جو بات دیگر تذکرہ نویس کئی کئی صفحات میں رقم کرتے ہیں ان کو میر حسین چند جملوں میں بیان کر دیتے ہیں اور اتنے سلیقے اور ہنر مندی کے ساتھ اطلاعات فراہم کرتے ہیں کہ کچھ مقامات کو چھوڑ کر زیادہ تر مواقع پر ان کی تحریر مختصر لیکن جامع ہے جو پڑھنے والوں کی تمام تر توجہ اپنی طرف مبذول کر لیتی ہے۔

محاسن کے ساتھ ساتھ اس تذکرے میں کچھ معائب بھی پائے جاتے ہیں مثلاً اس تذکرے میں تاریخی اعتبار سے کوئی نفع بخش مواد نہیں ملتا بلکہ بعض اوقات تو اس میں تاریخی اعتبار سے بڑی فاش غلطیاں دکھائی دیتی ہیں مثلاً انھوں نے شاہنامہ کے متعلق بتایا ہے کہ یہ کتاب چار سال میں مکمل کی گئی جبکہ صاحب شاہنامہ یعنی فردوسی نے لکھا ہے۔

بسی رنج بردم بدین سال سی
عجم زندہ کردم بدین پارسی

ترجمہ: میں نے ایران کی تاریخ کو زندہ کرنے کے لیے بڑی تکالیف برداشت کیں اور پورے تیس سال تک میں اس کام میں لگا رہا۔

مذکورہ بالا شعر سے پتہ چلتا ہے کہ فردوسی نے شاہنامہ 30 سال میں مکمل کیا تھا اور تحقیق سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ اس شاہکار کارنامے کو 30 سال کی طویل مدت میں پایہ تکمیل کو پہنچایا گیا تھا۔ اس کے علاوہ صاحب تذکرہ نے ایرانی شاعر خواجو کرمانی کو سعدی شیرازی کا معاصر بتایا ہے جو درست نہیں ہے اور آصفی ہروی کو شیرازی بتایا ہے، اسی طرح کے دیگر تاریخی اغلاط اس تذکرے میں دکھائی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ تذکرہ نویس نے اپنے تذکرے کو حرف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا ہے لیکن جب ہم اس کا حروف تہجی کے اعتبار سے مطالعہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ پوری طرح سے حروف تہجی کی بھی پابندی نہیں کی ہے یعنی تذکرے میں حروف تہجی کے مطابق احوال وآثار بیان کرنے کے بجائے ان سے انحراف بھی کیا گیا ہے، اس کے علاوہ اس تذکرے کی ایک اور خامی یہ ہے کہ اس میں بعض مواقع پر فحش اور غیر مہذب واقعات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ بایں ہمہ یہ تذکرہ اپنے عہد کے بہترین تذکروں میں سے ایک شمار ہوتا ہے اور از روز تالیف تا امروز محققین کی توجہ کا مرکز بنا رہا ہے۔

مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ تذکرۂ حسینی ادبی، تاریخی، علمی اور انتقادی اعتبار سے بارہویں صدی ہجری کے فارسی ادب کے بہترین اور قابل ذکر تذکروں میں سے ایک ہے۔ اس تذکرے میں بعض اوقات بڑی اہم، ذی قیمت اور منفعت بخش معلومات مل جاتی ہیں اور یہ اس تذکرے کی بے پناہ ادبی، انتقادی اور تاریخی اہمیت وافادیت ہی ہے کہ اس کتاب کو ہمیشہ دانشوران ادب کی جانب سے پذیرائی اور اہمیت حاصل رہی ہے۔ اس کے ذریعے بے شمار گمنام شاعروں اور ادیبوں کو زندگی حاصل ہوئی ہے۔

■

Ghazala Hafeez
Research Scholar, Dept of Persian
Jawaharlal Nehru University
New Delhi - 110067
Mob.: 9205844702
Email.: ghazalahafeez786@gmail.com

اردو شاعری میں جذبۂ امن و انسان دوستی

پھلیل سنگھ

اردو شاعری میں انسان دوستی کا جذبہ بہت پہلے سے ہے۔اور یہ ہو بھی کیوں نہ کہ ایک ایسی زبان جس کی پرورش و پرداخت میں مختلف النوع زبانوں کا خون شامل ہو۔ اور جو ایک طول مدت تک صوفیائے اکرام کی گود اور سائے میں پلی بڑھی ہو۔تو ایسی زبان میں انسان دوستی، محبت و اخوت کا پیدا نہ ہونا کیسے ممکن ہو سکتا ہے اس طرح اردو شعری ادب میں یہ موضوع کلاسیکل شعرا کے یہاں سے ملنا شروع ہو جاتا ہے۔

فرشتے سے بہتر ہے انسان بننا
مگر اس میں پڑتی ہے محنت زیادہ

—حالی

اردو شاعری کا ذکر جب اور جہاں بھی ہوتا ہے تو بعض افراد کا ذہن سب سے پہلے حسن وعشق، لالہ وگل اور لطف و انبساط کی دنیا میں سانس لینے لگتا ہے۔جب کہ اردو شاعری یہاں تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا موضوعاتی دائرہ بہت وسیع ہے۔اس کی عنواناتی کہکشاں مختلف النوع موضوعات اور گوناگوں مسائل سے بھری پڑی ہے۔اس کے دامن میں حیات وکائنات کا غالباً ہر وہ پہلو موجود ہے جو عالمی سطح کے شعری ادب میں دیکھنے کو ملتا ہے۔یہ الگ بات ہے کہ چند لوگ اسے محض سیر وتفریح کے رموز و نکات تک محدود سمجھتے ہیں جب کہ یہ ان کی کم فہمی اور تنگ نظری ہے۔اردو شعری ادب کی تاریخ پر اگر نگاہ کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ ادب بھی عالمی شعری ادب کی طرح اپنے سماج ومعاشرے سے نہ صرف انگلی ناخن کا رشتہ رکھتا ہے بلکہ یہ اپنے شروعاتی عہد سے لے کر عصر حاضر تک اس کے گوناگوں مسائل ومعاملات سے الجھتا اور ان کی مسلسل ترجمانی کرتا چلا آرہا ہے۔اس کے موضوعاتی کینوس میں کبھی حسن وعشق نے پناہ لی اور کبھی حسن فطرت اس کا مسئلہ قرار پایا اور کبھی یہ دین و مذہب کی طرف رجوع ہوا، تو کسی وقت قومیت وحب الوطنی اس کا مرکز توجہ ٹھہرے، یعنی یہ ادب ہر دور میں تقاضائے وقت کسی نہ کسی سماجی و معاشرتی مسئلے سے برابر وابستہ اور الجھتا رہا ہے اور جس میں اس کا ایک خاص موضوع انسان دوستی بھی رہا ہے۔

اردو شاعری میں انسان دوستی کا جذبہ بہت پہلے سے ہے۔اور یہ ہو بھی کیوں نہ کہ ایک ایسی زبان جس کی پرورش و پرداخت میں مختلف النوع زبانوں کا خون شامل ہو۔اور جو ایک طول مدت تک صوفیائے اکرام کی گود اور سائے میں پلی بڑھی ہو۔تو ایسی زبان میں انسان دوستی، محبت واخوت کا پیدا نہ ہونا کیسے ممکن ہو سکتا ہے اس طرح اردو شعری ادب میں یہ موضوع کلاسیکل شعرا کے یہاں سے ملنا شروع ہو جاتا ہے۔لیکن اس سے پیش تر کہ اس موضوع کو اردو شاعری میں تلاشا جائے مناسب ہوگا کہ چند سطریں جذبۂ انسان دوستی کی تمہید میں لکھی جائیں کہ انسان دوستی کیا ہے۔ویسے تو جذبۂ انسان دوستی اپنے معنی ومفہوم کے اعتبار سے ایک وسیع تر تصور ہے لیکن مختصراً یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ انسان دوستی سے مراد انسانی ذہن کا وہ رویہ جو بلا تفریق کسی مذہب وملت کے بنی نوع انسان، اس کی عظمت و بزرگی کی بقا، اس کی بہتری اور خوشحالی کی تلقین کرتا ہو بشر دوستی کہلاتا ہے۔مثال کے طور پر ساحرلدھیانوی کے چند اشعار دیکھیے۔

تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا
جو توڑ دے ہر بند وہ طوفان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا
تو امن کا اور صلح کا ارمان بنے گا
انسان کی اولاد ہے انسان بنے گا

ساحر کے ان الفاظ سے یہ بات صاف عیاں ہوتی ہے کہ انسان دوستی انسان کا ایک ایسا فطری جذبہ کہلاتا ہے۔جو انسان اور اس کے وجود کو نہ صرف بلا تفریق خلوص ومحبت سے دیکھتا ہے بلکہ سماج ومعاشرے کو انسانیت واخوت کا پیغام دیتے ہوئے منافرت اور مذہبی سخت گیری سے نجات پانے کا بھی درس دیتا ہے۔تاریخ گواہ ہے کہ سماج میں جب بھی کسی فرقے یا قوم کے مابین کوئی خلل، تفاوت یا

کسی قسم کی بدامنی پیدا ہوئی تو باہمی تناؤ سے بکھرے لوگوں کو قریب لانے اور ان میں آپسی بھائی چارہ قائم کرنے کا عمل اسی جذبہ انسان دوستی نے انجام دیا ہے۔اس جذبے نے ہر زمانے میں سماج کو توڑنے کے بجائے یکجا کرنے کا کام کیا ہے۔اس میں وہ خواہ مذہب وملت کی بات ہو یا شیخ و برہمن کا مسئلہ یا پھر کسی دوسرے نوعیت کے رنگ و نسل کے امتیازات ہوں یعنی انسان دوستی نے معاشرے کی ہر برائی کو اپنا نشانہ بناتے ہوئے صرف انسانیت اور رواداری کو فروغ بخشا ہے، جس کی ایک منھ بولتی مثال ہمارے سامنے سقراط، مہاتما بدھ، کبیر، خسرو، نانک، سور داس، بابا فرید، معین الدین چشتی، بلھے شاہ، رابندر ناتھ اور

تاریخ گواہ ہے کہ سماج میں جب بھی کسی فرقے یا قوم کے مابین کوئی خلل، تفاوت یا کسی قسم کی بد امنی پیدا ہوئی تو باھمی تناو سے بکھرے لوگوں کو قریب لانے اور ان میں آپسی بھائی چارہ قائم کرنے کا عمل اسی جذبہ انسان دوستی نے انجام دیا ہے۔اس جذبے نے ہر زمانے میں سماج کو توڑنے کے بجائے یکجا کرنے کا کام کیا ہے۔ اس میں وہ خواہ مذہب و ملت کی بات ہو یا شیخ و برہمن کا مسئلہ یا پھر کسی دوسرے نوعیت کے رنگ و نسل کے امتیازات ہوں یعنی انسان دوستی نے معاشرے کی ہر برائی کو اپنا نشانہ بناتے ہوئے صرف انسانیت اور رواداری کو فروغ بخشا ہے۔

مدر ٹریسا جیسے جید عالموں کی قربانیاں ہیں۔جنھوں نے ہر حال میں انسانیت مساوات اور امن وآشتی کے لیے اپنے آنسو بہائے۔شعروادب خواہ کہیں کا بھی ہو اس کا بنیادی مقصد زندگی کی خیر خواہی ہوتا ہے۔اسی لیے دنیا کا ہر اچھا تخلیق کار ہمیشہ خوب سے خوب تر زندگی کی جستجو میں متحرک اور کوشاں رہتا ہے۔اور اپنے اعلیٰ شعور اور ارفع تخیل کے ماتحت نہ صرف عالمی مسائل کا سامنا بلکہ ان سے زخمی ہوتے ہوئے انسانی بدحالی کے خلاف اپنی آواز بھی بلند کرتا ہے۔تخلیق کار چوں کہ حساس ترین، دردمند اور بقول اقبال ایک ''دیدور شخص ہوتا ہے''۔جو سماج کے ہر پہلو و معاملے کو عام آدمی سے ہٹ کر سنجیدگی، غیر جانبداری سے دیکھتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اس کے ذہن و دل میں انسانیت رواداری اور محبت جیسے جذبات و کیفیات بے ساختہ پیدا ہوتے ہیں۔یہ بات پہلے ہی عیاں ہو چکی ہے کہ اردو شاعری میں جذبۂ انسان دوستی زمانۂ قدیم سے اردو کے تخلیق کاروں کو جھنجھوڑتا چلا آ رہا ہے۔تاہم بغور اگر دیکھا جائے تو کلاسیکل شعرا میں انسان دوستی کے باقاعدہ نقوش ہمیں قلی قطب شاہ، حاتم، میر، سودا، نظیر اور میر درد جیسے معتبر شاعروں کے یہاں سے دیکھنے کو ملتے ہیں۔یہ اردو کے وہ ممتاز انسان دوست سخن طراز ہیں جنھوں نے متعلقہ جذبے کو اس وقت اپنے کلام میں برتا جب انسان اپنے سماج کے گونا گوں مسائل مثلاً مذہب وملت کی راسخ النظری اور اقتدار کی سخت گیری وغیرہ سے جوجھ رہا تھا لیکن باوجود اس کے ان حساس، دردمند اور انسان دوست شاعروں نے انسانیت، رواداری اور محبت کا پرچم بلند کرتے ہوئے ایک مشترکہ معاشرہ قائم کرنے کی بھرپور کوششیں انجام دیں جس کا اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔

میں نہ جانوں کعبہ و بت خانہ مے خانہ کوں
دیکھتا ہوں ہر کہاں دستہ ہے تجھ مکھ کا صفا

محمد قلی قطب شاہ

سنو ہندو مسلمانو کہ فیضِ عشق سے حاتم
ہوا آزاد قیدِ مذہب و مشرب سے اب فارغ

حاتم

وارستہ کر دیا جسے الفت نے بس وہ شخص
کب دام کفر و رشتۂ اسلام میں پھنسا

جرأت

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

میر تقی میر

ہم عشق کے بندہ ہیں مذہب سے نہیں واقف
گر کعبہ ہوا تو کیا بت خانہ ہوا تو کیا

آصف الدولہ

درد دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

میر درد

ہندو ہیں بت پرست، مسلماں خدا پرست
پوجوں میں اس کسی کو جو ہو آشنا پرست

سودا

جذبۂ انسان دوستی کی یہ روایت جب اسداللہ خاں غالب اور ان کے معاصرین کے یہاں پہنچتی ہے تو اس دور میں اسے برتنے کا ڈھنگ یا منظوم کرنے کے طور طریقے کافی حد تک بدل جاتے ہیں۔بالخصوص غالب کے یہاں یہ موضوع ان کے اعلیٰ تخیل وشعور کے زیر اثر ایک فلسفیانہ اور استفہامیہ رنگ اختیار کر لیتا ہے اور غالب اس موضوع کو اپنے ہم عصروں کے بالمقابل بڑے فن کارانہ انداز میں اظہار خیال کرتے ہیں۔مثال کے طور پر چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

غالب

کفر و اسلام کی کچھ قید نہیں، اے آتش
شیخ ہو یا کہ برہمن ہو، پر انسان ہو

آتش

اردو زبان کے حوالے سے جیسا کہ پہلے ہی کہا جا چکا ہے کہ یہ زبان بزرگان دین اور صوفی سنتوں کا لگایا ہوا ایک پودا ہے۔یہ کسی ایک مخصوص طبقے تک محدود نہیں بلکہ یہ پورے عالم انسانیت کا درد اپنے سینے میں رکھتی ہے اور یہ ہر اس فرد کی ہو جاتی ہے جو اسے اپنے سینے سے لگاتا ہے۔اس طرح یہ صرف ایک زبان ہی نہیں بلکہ ایک سیکولر و اخلاقی تہذیب کا مقام بھی رکھتی ہے۔اس کے سامنے جو بھی عہد و زمانہ آیا اس نے اسے سنوارنے کا ہی نہیں اسے تہذیبی و اخلاقی بنانے کی بھی بھرپور کوشش کی۔ہندوستان کی تاریخ میں 1857 کی جنگ اور تقسیم ہند سے بھلا کون واقف نہیں جب سارا ملک بقول فیض ''ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم سے لہولوہان ہو رہا تھا اور سماج کی ریڑھ کمزور ہو چکی تھی یعنی جب اس کے چاروں طرف قتل و غارت، بدامنی و انتشار کا ماحول چھایا تھا تب ایسے پر آشوب وقت میں بھی اردو شاعری نے معاشرے کو یکجا و قریب تر کرنے میں اپنا کلیدی رول نبھایا اور ملک کو آزاد، حالی، اقبال، فیض اور فراق جیسے معتبر تخلیق کار و شعرا عطا کیے۔جو اردو کے وہ شعرا کہلاتے ہیں جنھوں نے اپنی فہم و فراست سے جہاں ایک طرف اردو ادب کو مالا مال کیا، تو وہیں اپنے حساس مزاج اور انسان دوست جذبے کے تحت سماج و معاشرے کو خوب سے خوب تر کرنے میں اپنی بے مثال خدمات انجام دیں۔جس کا بخوبی اندازہ مندرجہ ذیل اشعار سے ہوتا ہے۔

بڑھاؤ نہ آپس میں ملت زیادہ
مبادہ کہ ہو جائے نفرت زیادہ

الطاف حسین حالی

کیا اب بھی مجھ پہ فرض نہیں دوستی کفر
وہ ضد سے میری دشمنِ اسلام ہو گیا

اسماعیل میرٹھی

مل کر چلو کہ آخر ہو دونوں بھائی بھائی
بھائی سے کیا لڑائی، بھائی سے کیا برائی

سرور جہاں آبادی

فرقہ بندی ہے کہیں، اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اقبال

جب گوشۂ دنیا میں پرستش ہو وفا کی
کعبہ ہے وہی اور وہی بت خانہ ہے میرا

چکبست

نہ ہندو، نہ گبرو مسلماں بنو
اگر آدمی ہو تو انساں بنو

جوش ملیح آبادی

جمیل اس دل میں وسعت ہے، کہ بندہ ہوں محمد کا
محبت مجھ کو عیسیٰ سے عقیدت مجھ کو گوتم سے

جمیل مظہری

خدمتِ خلق خدا ہے بندگی در بندگی
ہے یہی انسانیت، خلاقِ انسان کی قسم

احسان دانش

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں

فیض

مذکورہ بالا شعرا کے علاوہ ان کے ہم عصروں کے یہاں بھی بشر دوستی کے عناصر کوٹ کوٹ کر بھرے ہوئے ہیں۔ جن کا تذکرہ کرنا یہاں باعث طوالت محال ہے۔ تاہم اس ضمن میں سیماب اکبرآبادی، ساحرلدھیانوی، مجاز، مخدوم، سردار جعفری، شکیل بدایونی اور کیفی اعظمی جیسے شعرا قابل ذکر ہیں۔ اس طرح جذبۂ محبت و انسان دوستی کی اس مستقل روایت کو ہم جب عہد حاضر کی شاعری میں ٹٹولتے ہیں تو یہاں بھی اس کے آثار زرخیز ہی نظر آتے ہیں۔ عہد حاضر کے شعرا نے اس موضوع کو مختلف انداز میں اپنے کلام میں پیش کیا ہے۔ آج کا معاشرہ جہاں ایک طرف سائنس، ٹیکنا لوجی اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے مادیت کا شکار ہے۔ تو وہیں دوسری جانب یہ اس مادی نشے و صارفیت میں دُھت ہو کر اپنے اخلاقی اقدار و انسانی قدروں سے دور بھی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج انسان عرش و خلا میں اگرچہ جہاز گھما رہا ہے، ہوا میں گفتگو کر رہا ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ ذہنی و نفسیاتی طور پر بہت پریشان کن ہے۔ Consumerism اور تجارتی اغراض نے اسے اس قدر گھیر لیا کہ اسے اپنی خودغرضی اور انا کے آگے انسانیت، اخوت اور رواداری جیسی عظیم قدریں بھی خشک لگنے لگی ہیں۔ بقول اقبال:

''ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو''

اور یہ حقیقت ہے کہ موجودہ انسان زر و دولت کے پھیر میں اتنا سخت گیر ہو چکا ہے کہ اسے مال و دولت اور تجارت کے علاوہ سب کچھ بے معنی اور سیاہ دکھائی پڑتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہی سماجی و معاشرتی انتشار، دہشت گردی، فرقہ پرستی، فریب کاری اور نسلی تعصبات وغیرہ ہیں اور اس کی سب سے بڑی وجہ علم و ادب سے دوری بنانا ہے۔ جب کہ دانشوران ادب کا ماننا ہے کہ ادب ایک محبت ہے، طاقت ہے۔ ادب ہی ہے جو کسی درد و مسئلے کی تہہ تک پہنچ کر اسے سمجھنے کا وسیلہ فراہم کرتا ہے۔ اور یہ سچائی بھی ہے کوئی بھی سماج و معاشرہ جب کسی قسم کی تفریق یا بدامنی کا شکار ہوتا ہے تو اسے یکجا اور موافق بنانے میں ایک انسان دوست تخلیق کار ہی اپنا کلیدی رول انجام دیتا ہے۔ بقول بشیر کشتواڑی۔

آنکھ کی مانند شاعر ہے کسی نے سچ کہا
مبتلائے درد کوئی ہو تو شاعر رو دیا

اس طرح اس جذبۂ انسان دوستی کو جب ہم اس عہد صارفیت میں اردو شعرا کے کلام میں دیکھتے ہیں تو یہ فی الوقت شعرا بھی اس کا بھرپور مقابلہ کرتے نظر آتے ہیں اور اپنے بالیدہ شعور و تخیل کے زیر اثر نہ صرف اس کی عقدہ کشائی کرتے ہیں بلکہ اپنے انسان دوست مزاج و جذبے کے زیر اثر اخوت و سلامتی اور انسانیت کا پرچم بھی بلند کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر چند نمونے پیش ہیں۔

کوئی ہندو، کوئی مسلم، کوئی عیسائی ہے
سب نے انسان نہ بننے کی قسم کھائی ہے

ندا فاضلی

آج کا معاشرہ جہاں ایک طرف سائنس، ٹیکنا لوجی اور انٹرنیٹ کے ذریعے سے مادیت کا شکار ہے۔ تو وہیں دوسری جانب یہ اس مادی نشے و صارفیت میں دُھت ہو کر اپنے اخلاقی اقدار و انسانی قدروں سے دور بھی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ آج انسان عرش و خلا میں اگرچہ جہاز گھما رہا ہے، ہوا میں گفتگو کر رہا ہے۔ تاہم اس کے باوجود یہ ذہنی و نفسیاتی طور پر بہت پریشان کن ہے۔

سات صندوقوں میں بھر کر دفن کر دو نفرتیں
آج انسان کو محبت کی ضرورت ہے بہت

بشیر بدر

مجھے کعبہ و دیر سے لے چلو
بڑا شور ان کارخانوں میں ہے

عرش صہبائی

میرا مذہب عشق کا مذہب جس میں کوئی تفریق نہیں
میرے حلقے میں آتے ہیں تلسی بھی اور جامی بھی

قیصر شمیم

میں نے دشمن کو بھی دشمن نہیں سمجھا ہے فدا
میرا پیغام محبت ہے۔ یہ گھر گھر لکھ دے

فدا کشتواڑی

ماحول میں نہ اس قدر تلخی بڑھایئے
حالات کو معمول پر للہ لایئے

عشاق کشتواڑی

بگڑی کو جو سنوار دے اس کو مرا سلام
جو دل جلوں کو پیار دے اس کو مرا سلام
انسانیت کے نام پہ جو بھی خلوص سے
انساں کو اپنا پیار دے اس کو میرا سلام

بشیر کشتواڑی

القصہ مختصر یہ کہ اردو شاعری دیگر مسائل و معاملات کے علاوہ امن و اخوت اور انسان دوستی کی کئی مثالیں بھی بھری پڑی ہیں یہ صرف فرد کے سیر و تفریح یا مشاعرے تک محدود نہیں اس کے کشادہ دامن میں کائنات کے مختلف النوع رنگ موجود ہیں۔ یہ اردو شاعری ہی ہے جس نے اپنے شروعاتی دور سے سماج و معاشرے کو مشترکہ، اخلاقی اور خوب سے خوب تر قدروں کا حامل بنانے میں اپنا کلیدی رول ادا کیا ہے۔ اس نے جہاں ایک طرف حسن فطرت و عشقیہ موضوعات کو اپنے اندر سمویا ہے تو وہیں اس نے سیاسی، سماجی، نفسیاتی، دینی، انقلابی، قومی، حب الوطنی نیز انسانی و اخلاقی اقدار کی بھی بھرپور ترجمانی کی ہے اور ہر عہد میں تفریق و تنفر کو مٹانے کا بھرپور مقابلہ کیا ہے۔ انھیں مذکورہ بالا شعرا اور ان کے کلام سے یہ پیغام لینا چاہیے کہ اردو شاعری ایک سیکولر، انسان دوست اور اخلاقی شاعری ہے۔ اس طرح اب راقم اپنا یہ مضمون حالی کے اس شعر پر ختم کرتا ہے۔

یہی عبادت ہے یہی دین و اماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

■

Phulel Singh
Room No.: 154, Periyar Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:8130934281

حامدی کاشمیری کی اکتشافی تنقید: نظری اساس

مسعود احمد

تنقید بھی الہامی یا کشفی ہو سکتی ہے، یہ چونکانے والا نظریہ ہے۔ ہمارے یہاں اس نظریے کے بنیاد گزار حامدی کاشمیری ہیں۔ ان کا دور جدیدیت کے دور سے ہم آہنگ ہے۔ کم و بیش جدیدیت کے ابتدائی دور سے ہی انھوں نے تنقیدی دنیا میں قدم رکھا۔ موصوف تنقید سے اکتشافی عمل کو پورا کرنے کا تقاضا کرتے ہیں۔ انھوں نے یہ تقاضا یک لخت نہیں کیا بلکہ وہ اس نظریے سے پہلے اصلاحی تنقید، رومانوی تنقید، ترقی پسند تنقید اور نفسیاتی تنقید کا بغور مطالعہ کر چکے تھے۔

متذکرہ دبستانوں میں ان کی توجہ نفسیاتی تنقید پر رہی۔ نفسیاتی تنقید کی ابتدا فرائڈ (Sigmund Freud) کے نظریۂ تحلیل نفسی سے ہوتی ہے۔ انھوں نے اس نظریے میں انسانی ذہن کو تین سطحوں میں تقسیم کیا ہے۔ شعور، تحت الشعور اور لاشعور۔ مذکورہ نظریے کی بنیاد سائنس ہے، تاہم اسے دوسرے علوم میں بھی خاطر خواہ برتا گیا۔ اس تصور کو ادب نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ اس میں بھی اولیت شاعری کو حاصل ہے۔ شاعری کی عظمت کو بیان کرتے ہوئے فرائڈ نے خود کہا کہ میں جہاں بھی انسانی نفسیات کی تلاش کو گیا، وہاں میں نے اپنے سے پہلے ایک شاعر کو موجود پایا۔ گویا شاعر ماہر نفسیات سے بھی ایک قدم آگے کا مقام رکھتا ہے۔ اس طرح نفسیاتی تنقید کا ایک علیحدہ دبستان وجود میں آتا ہے۔ اس تنقید کا منصب فن پارے کے ساتھ فن کار کی نفسیات کا گہرائی سے مطالعہ کرنا ہے۔ تحلیل نفسی کے اس عمل اور ادب کے رشتے پر روشنی ڈالتے ہوئے حامدی کاشمیری لکھتے ہیں:

''ادب کی تخلیق میں متذکرہ بالا نفسیاتی محرکات کے علاوہ بعض شعوری اور لاشعوری الاصل محرکات کی نشاندہی بھی ہو سکتی ہے۔ ان میں عدم تحفظیت اور ادھورے پن کا نفسیاتی احساس ہے جو معاندانہ ماحول، بچپن کی محرومیوں، جسمانی حد بندیوں، سماجی دباؤ، اخلاقی بندشوں، تنہائی اور فطرت کے دشمنانہ روپ سے پیدا ہو سکتا ہے۔ عدم تحفظیت اور ادھورے پن کے احساس کو موت کی بھیانک، نہ ٹلنے والی اور ناقابل فہم قوت دوچند کرتی ہے۔ چنانچہ فن کار کو ایک دائمی نفسیاتی کرب کا سامنا رہتا ہے۔ اس کرب سے بچنے یا اس کی شدت کو کم کرنے کے لیے وہ ایک مثالی دنیا کی تخلیق کرتا ہے اور بقول گراہم ہاگ 'جن خواہشوں کی تکمیل حقیقت مسترد کرتی ہے، فن ان کا متبادل فراہم کرتا ہے۔' لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ایسا ہوتا ہے؟۔ کیا فن تحفظیت اور تکمیلیت کے احساس کی ضمانت بن جاتا ہے؟ ظاہر ہے ایسا نہیں ہوتا۔ شیکسپیئر کے المیہ ڈرامے، ورڈس ورتھ کی لوسی نظمیں، میر اور غالب کا کلام اور ایلیٹ کی نظمیں انسان کے عوارض کا مداوا نہیں کرتیں، وہ اس کے برعکس زندگی کے المیے کے احساس کو شدید تر کرتی ہیں۔ اس لیے نفسیاتی محرکات کا جائزہ لیتے ہوئے فن کار کی باطنی زندگی کی گہرائیوں میں اتر کے، کسی ایسی خلقی خصوصیت کی تلاش ناگزیر ہے جو بنیادی محرک کا درجہ رکھتی ہے اور آفاقی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کی قوت رکھتی ہے۔

(حامدی کاشمیری، اکتشافی تنقید کی شعریات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2015، ص 21)

فن پارہ اور فن کار کے نفسیاتی مطالعے کے سلسلے میں حامدی کاشمیری ایک قدم اور آگے بڑھتے دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے مطابق ایک نقاد کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ دوران تخلیق پیش آنے والے تجربات میں شامل ہو۔ ایسا کرنے کے لیے اسے فن کار کے باطن میں جھانکنے کی مشکل سے گزرنا ہوگا۔ صرف نقاد خود ہی شامل نہ ہو، بلکہ اس عمل میں اسے قاری کی شرکت کو بھی لازمی بنانا ہے۔ بظاہر اس اقتباس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حامدی کاشمیری فن پارے سے زیادہ اہمیت فن کار کو دے رہے ہیں۔ جب کہ حقیقت اس سے مختلف ہے۔ دراصل حامدی کاشمیری فن پارے سے معانی برآمد کرنے کے قائل نہیں ہیں۔ معانی و مفہوم تلاش کرنے والی تنقید کو وہ ودری یا تشریحی تنقید کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ان کا نقاد سے یہ مطالبہ رہتا ہے کہ وہ فن پارے کے اندرون میں داخل ہو۔ اس اندرون سے وہی تجربات حاصل ہوں گے جن سے فن کار دوران تخلیق گزرا ہے۔ تو کیا یہاں پر حامدی کاشمیری فن کار کی شخصیت کو دوبارہ ٹھونس رہے ہیں۔؟ نہیں، وہ ان تجربات سے آگہی کا

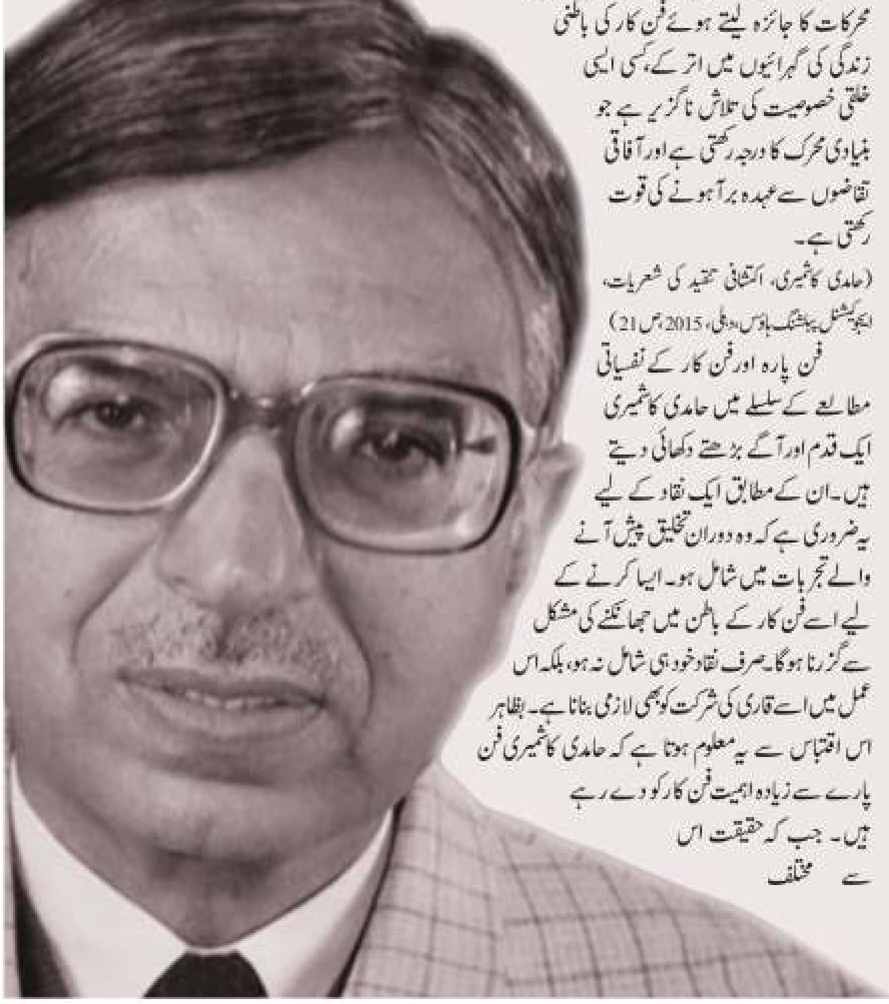

حصولِ فن پارے میں فن کے موجود لہو سے کرنا چاہتے ہیں۔اس عمل میں وہ نقاد سے یہ تقاضا بھی کرتے ہیں کہ یہ تجربات قاری تک بھی اسی صورت میں پہنچنے چاہئیں۔

یہاں حامدی کاشمیری نقاد پر دوہری ذمے داری عائد کرتے ہیں۔پہلے تو فن کار کے دوران تخلیق کیے گئے تجربات سے گزرنا ہی جوکھم بھرا کام ہے،پھر اس عمل میں قاری کی شرکت کو بنائے رکھنا نقاد کو مزید امتحان میں ڈال دیتا ہے۔حامدی کاشمیری اس نظریے کے قائل بیسویں صدی کے چھٹے دہے سے ہیں۔یہ دور جدیدیت کا دور آغاز مانا جاتا ہے۔جدیدیت نے ترقی پسندی کے برعکس کلاسیکیت کی جانب رجوع کیا۔اس رجحان سے منسلک ادیبوں اور نقادوں نے فن پارے میں فن کار کی انفرادی حیثیت پر زور صرف کیا۔مزید برآں اس رجحان کے تحت متن کو بنیادی اہمیت حاصل رہی۔اس رجحان کے بعد مابعد جدیدیت کے نام سے ایک نئے رجحان نے سر اٹھایا۔ساختیات و پس ساختیات کا ظہور بھی اسی دور میں ہوا۔ ان تمام رجحانات میں فن پارے کو مرکزی عنصر کے طور پر دیکھا جاتا رہا۔ساختیات و پس ساختیات کا زور متن کے لسانیاتی مطالعے پر تھا۔اسے دوسرے لفظوں میں ہیئت پسندی بھی کہا جاتا ہے۔

حامدی کاشمیری نے ان تمام رجحانات کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ان کی ابتدائی تحریریں جدیدیت سے متاثر نظر آتی ہیں۔تاہم جلد ہی انھوں نے اپنے لیے ایک نئی راہ تلاش کرلی۔ان کی اسی جستجو کی بدولت اکتشافی تنقید کا نظریہ سامنے آیا۔ایک مفروضہ رائج العوام ہے کہ اچھا تنقیدی ذہن ہی اچھی تخلیق کرسکتا ہے۔اس مفروضے میں قدرے صداقت ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ کیا تخلیق کار کے لیے پہلے باقاعدہ نقاد بننا ضروری ہے؟یا نقاد کا تخلیق کار ہونا لازمی ہے؟جواب میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ دونوں صفات شانہ بہ شانہ چلتی ہیں۔لیکن اگر ہم شعر کے الہامی یا کشفی ہونے پر مکمل اکتفا کرلیں تو پھر تنقیدی ذہن کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے۔؟ایسی صورت حال میں ہمیں شعر کے حوالے سے اپنے عقیدے کو بدلنا پڑتا ہے۔اس عقیدے کی تبدیلی کے ساتھ ہی ہم شعر میں ریاضت کے قائل ہوجاتے ہیں۔

اکتشافی تنقید کیا ہے۔؟ اس کا تقاضا کیا ہے۔؟ ادب میں اس کی ضرورت کیوں پڑی۔؟ان تمام سوالات کو حامدی کاشمیری کی زبانی سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔موصوف نے 'اکتشافی تنقید کی شعریات' کے عنوان سے ایک کتاب شائع کی۔اس کتاب میں تنقیدی مضامین شامل ہیں۔یہ مضامین کتابی شکل اختیار کرنے سے پہلے مختلف جرائد و رسائل میں چھپ کر ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بن چکے تھے۔بعد میں انھیں حامدی کاشمیری نے کتابی صورت میں یک جا کردیا۔دراصل حامدی کاشمیری یکا یک ادب میں اکتشافی نظریہ کو پیش نہیں کرتے۔وہ پہلے کائنات اور انسان کے باہمی رشتے میں اکتشافی نقطہ نظر اپناتے ہیں۔اس سلسلے میں وہ بہت سارے سوالات اٹھاتے ہیں۔یہ سوالات ان کے مضمون بعنوان 'آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز' میں درج ہیں۔موصوف کے ایسے سوالات میں درج ذیل سوالات اہمیت رکھتے ہیں:

1 انسان فطرت پر قابو پانے کی سعی مکمل کیوں کرتا ہے؟
2 ایسا کرتے وقت اسے جس متناقض صورت حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے وہ اسے resolve کرنے کے جتن کیوں کرتا ہے؟
3 وہ دیگر مخلوقات کی طرح اپنی زندگی کی بنیادی ضروریات حاصل کرکے خاموشی سے سپرد خاک ہونے پر راضی کیوں نہیں؟
4 وہ کائنات کے مشکل ترین مسائل پر کیوں سوچتا ہے؟
5 اپنی سوچ کو مخالف حالات سے متصادم پا کر اپنے آپ کو مختلف الجھنوں کا ہدف کیوں بننے دیتا ہے؟
6 ایسا کرکے وہ خود ہی ذہنی پریشانی کو کیوں دعوت دیتا ہے؟

ایسے سوالات کم و بیش زندگی کے ہر شعبے سے جڑے انسان کے ذہن میں گردش کرتے ہیں۔صوفیا کے نزدیک کشف و عرفان محبوب حقیقی سے ملنے کے اہم ذرائع ہیں۔جب انسان اپنے مالک حقیقی سے صحیح معنوں میں لو لگاتا ہے تو اس پر بہت سے اسرار کا پردہ منکشف ہوتا ہے۔وہ کائنات کی باریکیوں سے خاطر خواہ جانکاری لینے کا اہل ہوجاتا ہے۔کائنات ایک تغیر پذیر شے ہے۔اس میں آئے روز نئے نئے واقعات و حادثات کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔اقبال کے لفظوں میں یہاں تغیر کے سوا کسی بھی شے کو دوام حاصل نہیں ہے۔غالب بھی اسی کائناتی تغیر کے معتقد نظر آتے ہیں۔ان کا یہ شعر اس معنے کی صحیح ترجمانی کرتا ہے۔

آرائش جمال سے فارغ نہیں ہنوز
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں

اس خیال کو اقبال نے دہرایا اور کہا

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید
کہ آرہی ہے دمادم صدائے کن فیکون

کائنات کا یہی مکاشفاتی عمل انسانی تجسس کا باعث بنتا ہے۔ہر نئی کائناتی تبدیلی کے ساتھ انسانی ذہن فکر کی ایک نئی منزل کو سر کرتا ہے۔حامدی کاشمیری اس ضمن میں کائنات اور انسان کے رشتے کو بیان کرتے ہوئے انسانی تجسس Curiosity کی وکالت کرتے ہیں۔وہ اسے انسان کی بہترین خوبیوں میں شمار کرتے ہیں۔

وہ اپنی اکتشافی تنقید کے نظریے میں انسان کے اسی تجسس سے بحث کرتے ہیں۔وہ فن پارے کو ایک ایسے تجربے سے موسوم کرتے ہیں جو لسانی نظام کے تحت معرض وجود میں آیا ہو۔موصوف جدیدیت کے نقادوں کی طرح فن پارے کی انفرادیت کے قائل ہیں۔وہ متن کے آزاد مطالعے پر متفق ہیں۔البتہ ان کا استدلال اس بات کو لے کر ہے کہ اگرچہ ہم متن سے خالق متن کو بے دخل بھی کردیں تب بھی خالق متن کے بین المتن گردش کر رہے لہو سے انکار نہیں کیا جاسکتا ہے۔یہ نقاد کا منصب ہے کہ وہ اس لہو کی تپش اور روانی دونوں کو محسوس کرے۔اس لہو کے پیچھے کارفرما تجربات کا سراغ لگائے۔اور ان تجربات کو اس طرح منظر عام پر لائے کہ وہ قاری کے لیے کسی پریشانی کا سبب نہ بنیں۔حامدی کاشمیری اکتشافی تنقید کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

1 ''شاعری بنیادی طور پر ایک طلسم کارانہ تخلیقی فن ہے۔شاعر لفظ و پیکر کے علامتی برتاؤ سے تجربات کے طلسم کدے تخلیق کرتا ہے۔ان طلسم کدوں تک عام قاری کی رسائی ممکن نہیں،اس لیے ایک صاحب نظر نقاد کی رہنمائی ناگزیر بن جاتی ہے۔'' (ایضاً،ص 66)

2 ''تنقید کا کام،جیسا کہ ذکر ہوا شعری لسانیات کے وسیلے سے تخیلی دنیا کی سایہ گوں فضاؤں میں صاعقہ پوش وقوعات کی شناخت کرنا ہے،اور قاری کو ان کی ندرت، معنویت اور جمالیاتی تاثیر کا احساس دلانا ہے یعنی تنقید کو ایک اکتشافی کردار انجام دینا ہے۔'' (ایضاً،ص 66)

> **وہ اپنی اکتشافی تنقید کے نظریے میں انسان کے اسی تجسس سے بحث کرتے ہیں۔وہ فن پارے کو ایک ایسے تجربے سے موسوم کرتے ہیں جو لسانی نظام کے تحت معرض وجود میں آیا ہو۔موصوف جدیدیت کے نقادوں کی طرح فن پارے کی انفرادیت کے قائل ہیں۔وہ متن کے آزاد مطالعے پر متفق ہیں۔**

حامدی کاشمیری نے اول الذکر اقتباس میں قاری کی درجہ بندی کی ہے۔ان کے نزدیک قاری کی دو قسمیں ہیں۔ایک باذوق قاری جسے نقاد بھی کہا جاتا ہے اور دوسرا عام قاری۔عام قاری فن پارے کا مطالعہ کسی مخصوص نقطۂ نگاہ سے کرتا ہے،اس کی پیچیدگیوں سے ناواقف ہوتا ہے۔اس قسم کے قاری کا مقصد متن سے صرف حظ حاصل کرنا ہوتا ہے۔یہاں ایک اور بات کا اعادہ ہوتا ہے کہ

حامدی کاشمیری قاری اساس تنقید کے مبلغ ہیں۔ جب وہ نقاد سے یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ اسے تخلیقی تجربوں سے گزرتے وقت قاری کو بھی شامل رکھنا ہے تو اس سے قاری کی موجودگی کا صاف اشارہ ملتا ہے۔ لیکن اس امر میں اولیت باذوق قاری یا نقاد کو حاصل ہے۔ کیونکہ عام قاری متن کے درون خانہ میں داخل نہیں ہوسکتا ہے۔ اگر داخل ہو بھی جائے تب بھی تخلیقی تجربات میں اپنی موجودگی کو یقینی بنانا اس کے بس سے باہر ہے۔

ادب اور تھیوری میں پیدا کی جانے والی تفریق کو حامدی کاشمیری نے غیر ضروری بتایا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ادب میں سر اٹھانے والی ہر تحریک، رجحان، یا نظریے کو ابتدا میں سخت مخالفت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ سرسید کی اصلاحی تحریک ہو یا ترقی پسند تحریک، رومانوی تحریک ہو یا ادب کی نفسیاتی توضیح، جدیدیت و مابعد جدیدیت اور ساختیات و پس ساختیات جیسی تھیوریز اور رجحانات کو بھی تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ وجہ یہی بیان کی جاتی رہی کہ ان رجحانات سے ادب کی اصل روح مجروح ہوتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ان رجحانات کے مخالفین نمایاں مبلغین کی صورت میں سامنے آئے۔ حامدی کاشمیری 1960 سے اس نظریے کے قائل ہیں کہ متن کا مطالعہ اکتشافی نقطہ نگاہ سے کیا جانا چاہیے۔ ایسا کرتے وقت بنیادی حیثیت معنی کی نہ رہ کر تخلیقی تجربے کی ہوجاتی ہے۔ اس تجربے کی وکالت مغربی نقادوں میں کولرج، ایلیٹ اور بریڈلے وغیرہ کے یہاں ملتی ہے۔ تاہم ان علما نے تجربے کو شعر کے معنی و مفہوم کے طور پر لیا ہے۔ یہاں پر حامدی کاشمیری اپنے نظریے میں ان سے مختلف نظر آتے ہیں۔ ان کے نزدیک تجربہ دراصل تخلیقی نوعیت کا ہے۔ اس کا منشا متن سے معانی برآمد کرنا بالکل نہیں۔ اگر معانی (ظاہری و باطنی) برآمد کرنا ہی سب کچھ ہے تو پھر یہ تنقید درسی یا تشریحی کہلائے گی۔ اس صورت حال میں تنقید اپنے اصل منصب سے انصاف نہیں کرسکے گی۔ اس لیے نقاد کو تخلیقی تجربے میں شامل ہوکر متن کے اسرار کو منکشف کرنا ہے۔ یہاں پر حامدی کاشمیری شعر اور تنقید کے اکتشافی رشتے کو واضح کرنے کے لیے مختلف مغربی و مشرقی علما کا سہارا لیتے ہیں۔

شعر کے الہامی نظریے کو متذکرہ بالا عالموں کی زبانی بیان کرکے حامدی کاشمیری اپنے نظریے کے لیے زمین ہموار کررہے ہیں۔ ادب کے اسی الہامی پہلو کو وا کرنے اور اس سے خاطر خواہ مستفید ہونے کے لیے تنقید کو بھی کشف کا سہارا لینا ہوگا۔ بظاہر اس تنقیدی نظریے کا اطلاق مشکل نہیں ناممکن دکھائی دے رہا ہے۔ لیکن غور کرنے پر ہر باذوق قاری اس نظریے کا حامی نظر آنے لگتا ہے۔ یہ تنقیدی عمل قاری کو ایک نوع کا اعتماد فراہم کرتا ہے۔ اس اعتماد کی بدولت قاری کو متن پیاز کے چھلکے کی مانند نظر آنے لگتا ہے۔ یہی اعتماد ہر نقاد کو دوسرے نقاد سے منفرد و ممتاز کرتا ہے۔ موصوف کے اس تنقیدی نظریے پر علما نے اعتراضات جتائے۔ یہاں تک کہ اردو ادب کے نظریہ ساز نقاد شمس الرحمٰن فاروقی نے ان کے متعلق کہا کہ حامدی کاشمیری چاہتے تو تھیوری سے دامن بچا کر نکل سکتے تھے، لیکن انھوں نے یہ عمل شعوری طور پر انجام دیا جو کہ غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ سید محمد عقیل نے اپنی خود نوشت 'گئو دھول' میں حامدی کاشمیری کے اس تنقیدی نظریے پر استہزایہ انداز میں اعتراض کیا۔ ہم جانتے ہیں کہ سید محمد عقیل آخری دم تک ترقی پسند تحریک کے حامی رہے۔ اس تحریک کی محبت یا لگاؤ میں انھوں نے شمس الرحمٰن فاروقی پر بھی ایسے متعدد الزام لگائے جنھیں پڑھ کر قاری دم بخود رہ جاتا ہے۔ وہ سید اعجاز حسین کو رسالہ 'شب خون' کا برائے نام ایڈیٹر بنادینے کا ذمے دار بھی فاروقی صاحب کو ٹھہراتے ہیں۔ ترقی پسندی اور جدیدیت کی سرد جنگ میں سید محمد عقیل احتشام حسین کے اس جملے کی کھل کر تائید کرتے ہیں کہ 'شب خون' رسالہ آگے چل کر ہمارے کلاسیکی ادب پر شب خون مارے گا۔ سید محمد عقیل نے اپنی خودنوشت میں احتشام حسین کے اس جملے کو صحیح ثابت کرنے کے لیے 'شب خون' اور جدیدیوں بالخصوص شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے اچھوتے انکشافات کیے ہیں۔ ان کے نزدیک حامدی کاشمیری بھی جدیدیت سے وابستہ مفکرین میں سے ہیں۔ اپنے اس دعویٰ کی دلیل میں وہ حامدی کاشمیری کی کتاب 'معاصر تنقید' کا ذکر کرتے ہیں۔ ان کے خیال میں حامدی کاشمیری کی جانب سے ترقی پسندوں کے خلاف اپنایا گیا رویہ دراصل ان کے جدیدیت پسند ناقد ہونے کا ثبوت ہے۔ موصوف کی یہ رائے کافی مضحکہ خیز ہے۔ ایک جانب وہ اس بات کے شدت سے قائل ہیں کہ تنقید جانب داری کو برداشت نہیں کرسکتی، دوسری جانب ان کی یہ رائے بذات خود جانب داری کی مثال ہے۔

سید محمد عقیل نے ان باتوں کا اظہار اپنی خودنوشت سوانح حیات میں کیا ہے۔ ان کا یہ اقتباس اس بات پر دال ہے کہ حامدی کاشمیری اچھے تخلیق کار ہیں اور انھیں اسی پر قناعت کرلینی چاہیے۔ تنقید میں ان کی سعی غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ انھوں نے حامدی کاشمیری کی تنقید پر متعصبانہ ہونے کا الزام لگایا ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ حامدی کاشمیری اپنی کتاب 'معاصر تنقید' میں ترقی پسند تحریک کے متعلق کیا کہتے ہیں، جس سے سید محمد عقیل چراغ پا ہوگئے۔

حامدی کاشمیری نے اپنی کتاب 'معاصر تنقید' میں

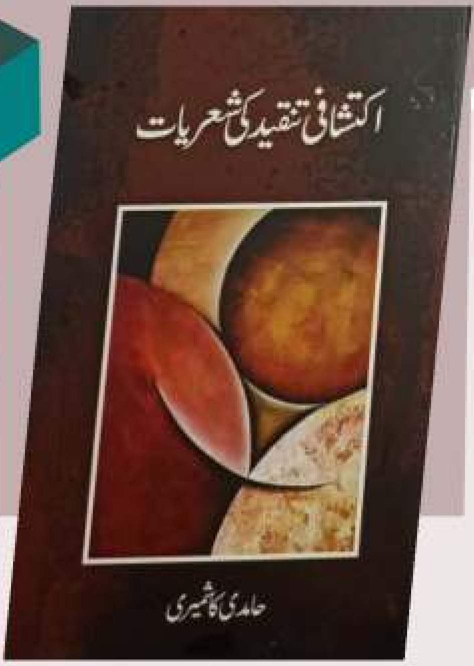

اکتشافی نقطۂ نظر کو برقرار رکھا ہے۔ ان کی یہ کتاب پہلی بار جنوری 1992 میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں موصوف مروجہ تنقیدی نظام سے حد درجہ غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ ان کے مطابق معاصر تنقید میں کم و بیش تمام نقادوں کی جانب سے صحافتی، درسی یا تشریحی طریقہ کار روا رکھا گیا ہے۔ نیز فن کے بجائے فن کار کی شخصیت، ماحول اور تحریکی وابستگی کو اساسی حیثیت دی گئی ہے۔ جس سے تنقید کی روح مجروح ہوتی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے نقاد، نقاد نہ رہ کر ایک شارح، مورخ یا مبصر بن جاتا ہے۔ حامدی کاشمیری اپنی اس کتاب میں کچھ حد تک کلیم الدین احمد کے طرف دار نظر آتے ہیں۔ انھوں نے کلیم الدین احمد کی کتاب 'اردو تنقید پر ایک نظر' کو تنقیدی دنیا میں پہلی معروضی کوشش سے تعبیر کیا ہے۔ کلیم الدین احمد کی اردو تنقید کے متعلق دی گئی آرا کو موصوف نے نعرہ حق سے تعبیر کیا ہے۔ حامدی کاشمیری اپنے نظریہ تنقید کو کلیم الدین احمد کی اسی کوشش کی اگلی کڑی گردانتے ہیں۔ ان کے مطابق جب کلیم الدین احمد نے اردو میں تنقید کے وجود کو فرضی کہا (اور یہ سچ تھا) تو ناقدین آگ بگولہ ہو گئے۔ وہ اس سلسلے میں سید احتشام حسین اور سید اعجاز حسین کا بطور خاص ذکر کرتے ہیں۔

اسی طرح حامدی کاشمیری نے آل احمد سرور اور احتشام حسین کے اقتباسات بھی درج کیے ہیں۔ موصوف کے مطابق ان علما کے یہ اقوال دراصل ان کی ادبی بوکھلاہٹ کی پیداوار ہیں۔ ان کے مطابق کلیم الدین احمد نے مروجہ تنقیدی بتوں کو للکارا، نتیجتاً انھیں ایسے اعتراضات کا سامنا کرنا پڑا۔

غالباً حامدی کاشمیری کے اسی موقف نے سید محمد عقیل کے ذہن میں یہ غلط فہمی پیدا کی کہ وہ ان کی تنقید کو متعصبانہ، معاندانہ و جانبدارانہ کہیں۔ حالانکہ حامدی

کاشمیری کتاب کے آغاز میں اس بات کی وضاحت کر چکے ہیں کہ میرا یہ مطالعہ معروضی اور فنی اساس ہوگا۔ اس میں اگر کسی نقاد کا نام شامل نہ ہو تو اسے میری پسند و ناپسند یا تعصب سے منسوب نہ کرکے زیرِ نظر مطالعے کی نوعیت اور اسکوپ پر محمول کیا جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ حامدی کاشمیری نے اس کتاب میں صرف ترقی پسند تنقید کی سرزنش کی ہے۔ انھوں نے جدیدیت اور مابعد جدیدیت کے زیرِ اثر منظر عام پر آنے والی تنقید کی خامیوں سے بھی پردہ اٹھایا ہے۔ ان کے مطابق بیسویں صدی کی چھٹی دہائی کے بعد کی تنقید سے ادب شناسی کے نئے امکانات روشن ہوئے۔ البتہ یہ تنقید بھی فن کے مستور تخلیقی تجربے تک قاری کی رسائی کو ممکن نہیں بنا سکی۔ باوجود حامدی کاشمیری کے اس واضح اعتراف کے سید محمد عقیل انھیں جدیدیت کا حامی نقاد ثابت کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ سید محمد عقیل کا یہ رویہ متعصبانہ اور ترقی پسند نقادوں سے غیر ضروری لگاؤ کی عکاسی کرتا ہے۔ انھیں سید اعجاز حسین سے گہری انسیت تھی۔ ایسے میں حامدی کاشمیری اعجاز حسین پر تنقید کر کے سید محمد عقیل کے وار سے کیسے بچ سکتے تھے۔ اس لیے موصوف نے موقع پاتے ہی حامدی کاشمیری کو نقاد کے منصب سے غائب کرنے کی سفارش کر دی۔ حامدی کاشمیری کے اس نظریہ تنقید کو قمر رئیس نے اپنی تنقید کا نشانہ بنایا۔ موصوف نے حامدی کاشمیری کی کتاب 'معاصر تنقید' پر بات کرتے ہوئے اسے بیسویں صدی کی گمراہ کن کتاب قرار دیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون 'اکتشافی تنقید کا نظریہ: ایک جائزہ' میں حامدی کاشمیری کو جدیدیت کا کٹر حامی بتایا ہے۔ ان کے مطابق حامدی کاشمیری اپنے اکتشافی تنقید کے مطالعے میں بدترین جانبداری اور افراط و تفریط کا شکار ہوئے ہیں۔ ان کا یہ بھی کہنا ہے کہ یہ حامدی کاشمیری کا کوئی ذاتی نظریہ نہیں ہے۔ ان کے خیال میں حامدی کاشمیری جس 'تخیلی صورت حال' پر بار بار زور دے کر اپنی انفرادیت کا سکہ جمانا چاہتے ہیں وہ دراصل شاعری کے تجربے کی لسانی، تخلیقی اور جمالیاتی تشکیل ہے۔

علاوہ ازیں دوسرے ادیبوں نے حامدی کاشمیری کے اس نظریے پر کھل کر تنقید کی۔ ایسی تنقیدوں کو پڑھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کے پیچھے حامدی کاشمیری کے خلاف کوئی منظم سازش کام کر رہی تھی۔ اس سلسلے میں پروفیسر افضل امام کا نام نمایاں ہے۔ انھوں نے 'تذکرے' میں چھپے اپنے ایک مضمون بعنوان 'معاصر تنقید' میں حامدی کاشمیری کے خلاف خوب بھڑاس نکالی۔ موصوف کی جانب سے اپنائے گئے موقف کو دیکھ کر ایک لمحے کے لیے لگتا ہے کہ ان کا مطمح نظر حامدی کاشمیری کے نظریہ تنقید کے بجائے ان کی شخصیت ہے۔ اپنے متذکرہ مضمون میں وہ اس طرح گویا ہیں۔

''فاضل مصنف اپنی جس نئی اکتشافی تنقید کا ذکر فرماتے ہیں وہ اردو میں ہی کیا یورپی زبانوں میں بھی تقریباً ناپید ہے۔ غالباً پروفیسر حامدی کاشمیری کچھ اس طرح کی اکتشافی تنقید کے ایک نئے دبستان کے بانی بننا چاہتے ہیں۔ بہرکیف میں اسے تعصباتی تنقید پر محمول کروں گا۔''
(حامدی کاشمیری، اکتشافی تنقید کی شعریات، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، 2015، ص 67)

افضل امام کے اس اقتباس سے دو باتوں کا اعادہ ہوتا ہے۔ پہلی یہ کہ اس طرح کی تنقید مغربی ادب میں ناپید ہے۔ ان کی اس دلیل پر ہمیں اعتراض ہے۔ اعتراض کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی یہ کہ حامدی کاشمیری اپنے نظریے کی وضاحت میں بار بار کہہ چکے ہیں کہ اکتشافی تنقید کا نظریہ ان کا ذاتی ہے اور وہ اسے ترقی یافتہ ادب میں ایک نئے تجربے کے طور پر دیکھتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ اس تنقید کا مغربی ادب میں نہ ہونا کوئی عیب نہیں، خوبی ہے لیکن اس خوبی کو برداشت کرنے کا مادہ ہمارے نقادوں میں نہیں ہے۔ نقادوں کے اس طرح کے رویے سے ان کے احساس کم تری کا اندازہ ہوتا ہے۔ ہم اسی علم، تصور یا نظریے کو قبول کرتے ہیں جس پر مغرب زدگی کی مہر ثبت ہو۔ اس میں بھی ہم Selective ہو جاتے ہیں۔ ترقی پسند نقاد یا جدیدیت، مابعد جدیدیت، ساختیات و پس ساختیات سے منسلک علما اگر مغربی تصور نقد کا اطلاق اردو ادب پر کریں تو ٹھیک ہے۔ یہی کام اگر کلیم الدین احمد یا حامدی کاشمیری کریں تو معتوب ٹھہرا دیے جاتے ہیں۔ یہ انتہائی متعصبانہ رویہ ہے۔ اپنے لوگوں کو برداشت نہ کرنا کسی بھی ڈسپلن اور قوم کے حق میں مفید ثابت نہیں ہو سکتا ہے۔

دوسری بات میں، افضل امام اسے متعصبانہ تنقید کہتے ہیں۔ اس کی وجہ حامدی کاشمیری کی جانب سے نئی تنقید کے بانی بننے کی کوشش کو بتاتے ہیں۔ یہ بات اپنے آپ میں مضحکہ خیز ہے۔ ان کے اس یک طرفہ فیصلے کے بعد حامدی کاشمیری نے ان اعتراضات کا جواب دینے کی ضرورت کو شدت سے محسوس کیا۔ اسی دوران 'معاصر تنقید' پر ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر خورشید احمد، شافع قدوائی اور ڈاکٹر افضال حسین کے مابین ایک مباحثہ ہوا۔ انھوں نے 'معاصر تنقید' کی خوبیاں شمار کرتے ہوئے اسے فکر انگیز کتاب قرار دیا۔ البتہ انھوں نے اس میں اپنائے گئے طریق نقد کی صحت پر بعض شبہات کا اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر خورشید احمد، شافع قدوائی اور ڈاکٹر افضال حسین نے حامدی کاشمیری کے نظریہ تنقید پر کافی اعتراضات جتائے ہیں۔ حامدی کاشمیری نے موٹے طور پر تین اعتراضات کو اپنی کتاب 'اکتشافی تنقید کی شعریات' میں درج کیا ہے۔ پھر ان کے مفصل جوابات بھی دیے ہیں:

اس میں موصوف نے اپنے تنقیدی نقطۂ نظر کو مزید واضح انداز میں پیش کرنے کی سعی کی ہے۔ وہ بار بار اسی امر پر زور دیتے ہیں کہ متن کے خود مکتفی مان لینے کے باوجود بھی متن کی رگ و ریشے میں مصنف کے گردش کر رہے لہو سے انکار ممکن نہیں ہے۔ نقاد کا یہ کام ہے کہ وہ اس لہو کی حرارت کو محسوس کرے۔ اس احساس کے دوران اسے خود متن کے رگ و ریشے میں اترنا ہوگا۔ ساتھ ہی اس عمل میں قاری کی شرکت کو بھی یقینی بنانا ہے۔ تبھی جا کر تنقید کا حق ادا ہو سکے گا۔ ورنہ تنقید کی نوعیت درسی یا تشریحی یا صحافتی انداز سے آگے نہیں بڑھے گی۔ حامدی کاشمیری کے اس تنقیدی نظریے کو خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی، البتہ شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، عتیق اللہ اور قدوس جاوید جیسے علما نے چند حوصلہ افزا خیالات کا اظہار ضرور کیا ہے۔ شمس الرحمن فاروقی کے مطابق حامدی کاشمیری کے خیالات و نظریات سے مکمل اتفاق رکھنا ضروری نہیں اور مجھے بھی نہیں ہے تاہم ان کی علمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گوپی چند نارنگ نے حامدی کاشمیری کی اس کوشش کو تنقیدی دنیا میں ایک نئی روشنی سے تعبیر کیا۔ قدوس جاوید کے نزدیک متن کا مکاشفانہ مطالعہ حامدی کاشمیری کا خاصہ ہے۔

مختصراً یہ کہ حامدی کاشمیری ادبی تعصب کا شکار ہوئے ہیں۔ ادب میں نئے تجربات یا تصورات کو متعارف کرانے کا سلسلہ حامدی کاشمیری سے شروع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ اس وقت تک حقیقت پسندی، رومان پسندی، ترقی پسندی، جدیدیت و مابعد جدیدیت وغیرہ جیسے نظریات کو ہاتھوں ہاتھ لیا جا چکا تھا۔ کیا وجہ ہے کہ حامدی کاشمیری کے اس نظریے سے علمی اختلاف کم اور ذاتی اختلاف زیادہ کیا گیا؟ کیا اس لیے کہ حامدی کاشمیری اپنا کوئی حلقہ بنانے میں ناکامیاب رہے؟ جیسے فاروقی اور نارنگ صاحب نے بنائے یا حامدی کاشمیری کا کشمیری ہونا ان کا عیب مانا گیا؟ بہر حال حقیقت جو بھی رہی ہو، اتنا طے ہے کہ حامدی کاشمیری کی جانب سے یہ ایک نئی، بے باک اور بت شکنی کی عملی پہل تھی۔ وقت آنے پر اسے اس کا جائز و مناسب مقام ضرور ملے گا۔

■

Masood Ahmed
Room No.: 302 E, Bramhamputra Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mob.:7042181225

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ھی کی ایک شکل ھے جس میں کتاب کے مواد' اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ھے- کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیا ت کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ھیں- اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رھی ھے' خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ھی مفید تھا- تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ھے اس لیے مبصرین کو چاھیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید' افراط و تفریط' بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اھم اور افادی نکات کی نشاندھی کریں- اردو کے علاوہ انگریزی' ھندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ھوتی ھیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ھو گا-

اردو ہندی فکشن میں اساطیر

مصنف: ناز قادری

صفحات: 290، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: امتیاز احمد علیمی، S-2/5A تیسری منزل، فاطمہ اپارٹمنٹ جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

فکشن تنقید میں ناز قادری ایک اہم نام ہے۔ ان کی حالیہ تصنیف 'اردو ہندی فکشن میں اساطیر' 2021 میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان سے شائع ہوکر منظر عام پر آئی ہے۔ یہ کتاب اپنی نوعیت کی منفرد اور اہم کتاب ہے یہ اردو اور ہندی اساطیر کو سمجھنے میں بہت معاون ہے۔ پروفیسر ناز قادری نے اپنی اس تحقیقی وتنقیدی کتاب میں اساطیری موضوعات ومسائل اور اسطوری اسالیب کو مختلف حوالوں سے سمجھنے اور سمجھانے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ آٹھ ابواب پر مشتمل یہ ان کی تحقیقی وتنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب کی 'تقدیم' میں ڈاکٹر یوسف سرمست نے قاضی عابد کی کتاب 'اردو افسانہ اور اساطیر 2002' اور ڈاکٹر یحییٰ نشیط کی کتاب 'اسطور فکر و فلسفہ اردو شاعری میں' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''کتابوں کے عنوان سے ظاہر ہے کہ یہ دونوں کتابیں اساطیر کے بارے میں نہیں ہیں ڈاکٹر ناز قادری پہلے اسکالر ہیں۔ انھوں نے صرف 'اساطیر' کو اپنا موضوع بنایا اور اتنا اچھا کام کیا ہے کہ اس موضوع کا حق ادا ہو گیا ہے'' اس میں کوئی شک نہیں کہ یقینا یہ اہم معتبر اور مستند کام ہے مجھے نہیں معلوم کہ یہ مقدمہ کب کا لکھا ہوا ہے لیکن جہاں تک میرے علم میں ہے اس سے قبل پروفیسر شکیل الرحمٰن کی کتاب 'اساطیر کی جمالیات' 2009 میں عرشیہ پبلیکیشنز سے شائع ہو چکی ہے اور دوسری مرتبہ کتاب پروفیسر قمر رئیس کی ہے جس کا نام ہندوستانی اساطیر اور فکر و فلسفہ کا اثر اردو زبان و ادب پر' ہے یہ بھی 2009 میں ہی اردو اکادمی دہلی سے شائع ہو چکی ہے۔ تو پہلے اسکالر ہونے کا جواز کیا ہے جب کہ اس موضوع پر دو سے زائد کتابیں آچکی ہیں۔ اگر یہ مذکورہ کتابوں سے قبل لکھی جا چکی تھی اور کسی وجہ سے منظر عام پر آنے میں تاخیر ہوئی تب تو پہلے اسکالر ہونے کا جواز ہے ورنہ نہیں۔ بہرکیف پروفیسر ناز قادری کی کتاب اور ان کے کام کی نوعیت مذکورہ کتابوں سے منفرد ہے۔ یہ کتاب ایک منفرد اور بنیادی رجحان سے بحث کرتی ہے جس کی حقیقت کا ہمیں علم نہیں کہ کس طرح ہماری جڑوں میں وہ پیوست ہے۔ چونکہ ہم اساطیر اور صنمیات سے گھرے ہوئے دیس میں رہتے ہیں جس کی تفہیم اردو اور ہندی تخلیق کاروں کی تخلیقات کی روشنی میں کرنے کی اس کتاب میں کامیاب سعی کی گئی ہے۔ اس کتاب میں 'حرف چند' اور 'تقدیم' کو چھوڑ کر کل آٹھ عناوین قائم کیے گئے ہیں جن میں پہلا عنوان 'موضوع سے وابستہ مسائل ومباحث' ہے۔ اس میں مصنف نے انسان کے ارتقا کی تاریخ میں آگ، پانی، پہیہ اور زبان کی خاص اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے آگ اور مختلف ممالک میں اس سے وابستہ اساطیر، دیوی دیوتاؤں اور زبان جو بنیادی طور پر اظہار کا ایسا وسیلہ ہے جو انسان کے اندر پیدا ہونے والے تاثرات، ہیجان، تکلیف، محبت، نفرت، دکھ، سکھ، ہمدردی اور رحم جیسے ہر جذبے اور کیفیتوں کو ظاہر کرتے ہیں اس کی مدد سے متعلق تصورات کے علاوہ پوری دنیا میں قدرتی اور سماجی مظاہر کے تعلق سے جو اساطیر ملتی ہیں ان سب کو مستند حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان 'اساطیر اور مہاتی قصوں کا تصور ایک مجمل مطالعہ' ہے۔ اسطور جو انگریز لفظ Myth کا ترجمہ ہے جو اردو میں بطور اصطلاح رائج ہو گیا ہے۔ عربی میں Myth کے لیے 'اسطورۃ' کا لفظ ہے اور اردو میں 'اسطور' مستعمل اور رائج بھی ہے۔ اردو میں اسطور کے علاوہ دیومالا، اصنام اور خرافات جیسے الفاظ بھی متبادل اصطلاح کے طور پر رائج ہیں لیکن اسطور کا چلن زیادہ عام ہے کیونکہ اس سے کئی اور لفظ بھی بنائے جاسکتے ہیں جیسے اسطوریت، اسطوریات، اساطیر، اساطیری، اسطوری وغیرہ اسی طرح مختلف تراکیب بھی بنائی جاسکتی ہیں جیسے اسطور اساس، اسطور شکن، اسطور ساز، اساطیر القدیم، اساطیر الاوّلین وغیرہ۔ اس طرح مذکورہ اصطلاح کی وضاحت اور اس کی لغوی اور اصطلاحی تعریف اور اس کی تعبیر وتشریح کرتے ہوئے مغائر اور مماثل دونوں کی وضاحت کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ مختلف محققین اور ناقدین کی آرا کی روشنی میں اپنے نقطۂ نظر کو بھی واضح کیا ہے۔ اس لیے اساطیر کے لغوی اور اصطلاحی معنی اور مفہوم کی تفہیم کے سلسلے میں یہ باب ایک طرح سے کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔

تیسرا عنوان 'ادب پر اساطیر اور مہاتی قصوں کا اطلاق' ہے۔ اس میں اساطیر جو در اصل تہذیبی اور ثقافتی علامتیں ہیں اور دنیا کی مختلف ثقافتوں کے مطالعے میں اساطیری علامتوں کی جو اہمیت ہے اس پر تفصیل سے روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ 'اساطیری مطالعے سے ان تہذیبوں سے تعلق رکھنے والے انسانی گروہوں کی افتادِ طبع، ان کی اخلاقیات، ان کی ذہنی زندگی اور ان کے نظریات وعقائد کا پتہ لگا سکتے ہیں بلکہ تہذیبی

مطالعے سے بھی ہم ان اساطیری جڑوں تک پہنچ سکتے ہیں جن کا ایک وسیع پس منظر ہوتا ہے۔ اس طرح ادب میں اساطیر اور مہماتی قصوں کا اطلاق کس طرح کیا جاتا ہے اس حصے کے ذیلی عناوین مثلاً قبائلی بصیرت، اساطیر اور تمثیل، اسطور کی علامتی توضیح، اسطور اور دوسرے علوم و مکاتب، اسطور اور نفسیات، اسطور اور مذہب وغیرہ ہیں۔ مذکورہ حوالوں سے اس کی اطلاقی نوعیت کو واضح کیا گیا ہے۔

چوتھا عنوان 'افسانوی ادب میں اساطیر کا مطالعہ' ہے۔ اس میں پہلے تخلیقی اور غیر تخلیقی نثر کے حوالے سے تفصیلی روشنی ڈالتے ہوئے اس کے اختصاص و امتیاز کو واضح کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اساطیری ادب کی تاریخ پر مجملاً روشنی ڈالی گئی ہے۔ علاوہ ازیں مختلف اصناف مثلاً ڈرامہ، داستان، افسانہ میں جن اساطیر کو پیش کیا گیا ہے ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے رامائن اور مہابھارت میں پیش کیے گئے اساطیر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس طرح انھوں نے قدیم ترین تخلیقات سے لے کر جدید تر اردو شعر و ادب کی تخلیقات میں اساطیر کے جو اثرات ملتے ہیں ان کو پیش کرنے کی سعی کی ہے۔

مذکورہ چاروں عنوانات کے تحت مصنف نے ادب اور اساطیر کے مابین جو ربط اور گہرا تعلق ہے اس کو تحقیقی نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ اس کے بعد پانچواں عنوان اردو کے ادیب 'راجندر سنگھ بیدی کے فن میں اساطیر' اور چھٹا عنوان 'انتظار حسین کے فن میں اساطیر' ہے ان دونوں اردو ادیبوں کے علاوہ ہندی کے دو معروف تخلیق کاروں کی تخلیقات میں اسطور کو تلاش کر کے اس کے افہام و تفہیم کی کوشش کی گئی ہے۔ کتاب کے ساتویں عنوان 'راہی معصوم رضا کے فن میں اساطیر' اور آٹھویں عنوان 'کملیشور کے فن میں اساطیر' کے تحت ان دونوں کی تخلیقات میں موجود اسطوری بیانیے کو سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی گئی ہے۔

مذکورہ تمام مباحث کی قرأت کے بعد یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب یقیناً اپنی نوعیت کی اہم اور مستند کتاب ہے۔ اس کا مطالعہ اساطیر اور اس کی روایت کے افہام و تفہیم میں بہت معاون ثابت ہوگا۔ کتاب ہر اعتبار سے بہتر اور دیدہ زیب ہے۔ امید ہے علمی و ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

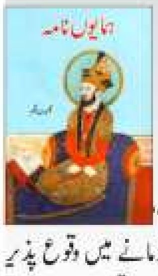

ہمایوں نامہ

مصنف: گلبدن بیگم، مترجم: عثمان حیدر مرزا
صفحات: 92، قیمت: 55 روپے، چھٹی طباعت: 2021
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: عبدالرحمٰن، ریسرچ ایسوسی ایٹ، شعبۂ اردو، دہلی یونی ورسٹی،

تاریخ ایک ایسا موضوع ہے جس سے گذرے ہوئے زمانے میں وقوع پذیر حالات و معاملات اور شخصیات کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے لیے کسی مخصوص کتاب یا فن پارے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ سارے شواہد جو اس دور میں لکھے گئے یا جن میں اس عہد کے لوگوں کا بیان ہو وہ تاریخ کا حصہ ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر اگر ہنگامہ غدر کی تاریخ کو لکھا جائے تو اس دور کے اخبارات، خطوط اور تصنیفات تاریخی شواہد کا اہم مرجع ہوں گے۔ مورخین نے 1857 کے ہنگامہ آزادی اور دہلی میں مسلمانوں پر انگریزوں کے مظالم کے تاریخی شواہد کے طور پر غالب کے خطوط میں مذکور واقعات پر انحصار کیا ہے۔ زیر نظر کتاب اگرچہ ترکی آمیز فارسی زبان میں لکھی گئی ہے، مغلوں کی طرز زندگی، ان کی مہمات اور رسم و رواج کے باب میں ایک اہم مرجع ثابت ہو سکتی ہے۔

یہ کتاب سلطنت مغلیہ کی ایک ہونہار، ذی علم اور ذہین خاتون گلبدن بیگم کی تصنیف ہے جو اکبر بادشاہ کی خواہش کی تکمیل میں لکھی گئی ہے۔ مترجم کے قول کے مطابق یہ کتاب ادھوری ہے لیکن جتنا بھی مواد اس میں موجود ہے اس سے سلطنت مغلیہ کے دو عظیم فاتحین، ان کی سرگرمیوں اور ان کے عادات و اطوار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

گلبدن بیگم، ہمایوں بادشاہ کی بہن اور بابر کی بیٹی تھیں؛ اس لیے بابر اور ہمایوں کی زیادہ تر مہمات کے بارے میں انھوں نے اپنے بزرگوں سے سنا اور دیکھا تھا، اس کتاب میں انھی واقعات کو سوانح کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔ بیان کا طریقہ داستانی رنگ میں رچا بسا نظر آتا ہے۔ قصہ در قصہ پلاٹ قاری کو اپنے حصار میں باندھے رکھتا ہے۔ بھائیوں اور رشتے داروں کی معاونت، تحفے تحائف، معرکہ آرائی وغیرہ کا بیان دلچسپ انداز میں ملتا ہے۔ ابراہیم لودھی سے معرکہ آرائی اور رانا سانگا کی شکست کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل نہ صرف جوانمردی سے لڑتے تھے بلکہ ان کی جنگی تدابیر و مہارت ان کی کامیابی و کامرانی کا باعث ہوا کرتی تھی۔ مثلاً ابراہیم لودھی اور رانا سانگا کے ساتھ سپاہیوں کا ایک جم غفیر تھا جب کہ بابر کے پاس گنے چنے جوان تھے لیکن اس تدبیر سے انھوں نے اپنے سپاہیوں کو آراستہ کیا کہ ابراہیم لودھی کے پاؤں اکھڑ گئے، اور ایک سال بعد وہی حال رانا سانگا کا بھی ہوا۔

چونکہ مورخین کسی واقعے کو تفصیل مکمل کے بجائے اختصار مفصل کی بنیاد پر بیان کرتے ہیں، جب کہ سوانح میں چھوٹی چھوٹی باتوں کا ایسا ذکر ملتا ہے جو بڑی بڑی باتوں کی خمیر ثابت ہوتی ہیں۔ اس لیے اس کتاب میں مذکور واقعات تاریخ ہند کے ان شواہد اور حقیقت کے ترجمان ہیں؛ جہاں تک عام قاری کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مغل ہندوستان پر یہاں کے چھوٹے چھوٹے راجاؤں کی دعوت پر آئے جن میں رانا سانگا کا نام اہمیت کا حامل ہے: ابراہیم لودھی کو شکست دینے کے لیے بابر کو رانا سانگا نے ہی ہندوستان آنے کی دعوت دی تھی، لیکن جب وہ شمالی ہند پر قابض ہو گیا تو یہ بات اسے ناگوار گگی اور خود بابر کے مقابلے کے لیے کھڑا ہو گیا۔

اسی طرح مغلوں کی تہذیب، عمارتوں کی تعمیر، عمارتوں کا خاکہ، ان کی آرائش و زیبائش کے حوالے سے اس کتاب میں جو بیان ملتا ہے، اس سے ان کے طرز بود باش پر نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ بابر بادشاہ کی وفات کے بعد قرآن خوانی کے لیے حفاظ کا تقرر اور ان کے لیے فتح پور سیکری کے علاقے کا وقف کرنے کے بیان سے ان کے رسم و رواج اور تہذیب و ثقافت پر نمایاں روشنی پڑتی ہے۔ جو سلطنت مغلیہ کے مطالعے کے لیے ناگزیر ہے۔

بانوے صفحات پر مشتمل اس ترجمے میں ہمایوں بادشاہ کی تخت نشینی سے لے کر مرزا کامران کو اندھا کیے جانے تک کے واقعات کا ذکر ہے، جس کا عرصہ تقریباً بائیس سال ہوتا ہے۔ یعنی جس نسخے تک مترجم کی رسائی ممکن ہوئی وہ ادھورا ہے۔ مترجم کا خیال ہے کہ ممکن ہے کہ مفقود اوراق میں ہمایوں بادشاہ کے وفات تک کے حالات درج ہوں۔

مختصر یہ کہ یہ کتاب ہمایوں بادشاہ کی نامکمل سوانح عمری ہے جس میں بابر کے مہمات، ان کے خانگی مسائل، تخت نشینی اور دیگر رہن سہن کے بارے میں تفصیل سے لکھا گیا ہے۔ جس سے نہ صرف سلطنت مغلیہ کے عروج اور ہندوستان میں بابر کی آمد کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ ان کی مہمات اور ان میں درپیش مسائل کے سمجھنے میں آسانی ہوتی ہے۔ فنی اعتبار سے یہ کتاب بیک وقت داستان، تاریخ اور سوانح نگاری کا بہترین مجموعہ ہے جس میں ترجمہ نگاری کے فن نے چار چاند لگا دیا

ہے۔ عبارت میں کہیں جھول نہیں ہے۔ زبان صاف ستھری اور عام قاری کی فہم سے قریب تر ہے۔ مترجم نے دیباچے کی شکل میں پوری کتاب کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری کا ذہن نفس کتاب کے مطالعے کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ نفس کتاب کا ترجمہ 82 صفحات پر محیط ہے۔ آخر کے دس صفحے پر اصلاحات و حل مشکلات کو شامل کیا گیا ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور عمدہ ہے۔ امید کی جاتی ہے کہ یہ کتاب قارئین میں پسند کی جائے گی۔

آئینۂ جہاں: کلیات قرۃ العین حیدر (جلد دوم)

مرتب: جمیل اختر

صفحات: 624، قیمت: 275 روپے، دوسری اشاعت: 2021

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: محمد طاہر صدیقی، E-235/2، تیسری منزل

ابوالفضل انکلیو پارٹ II، شاہین باغ، اوکھلا، نئی دہلی ۔ 25

قرۃ العین حیدر اردو فکشن کی جدید دور کی مشہور و معروف ادیبہ ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں و افسانوں میں 'شعور کی رو' کی تکنیک استعمال کی ہے۔ انھیں ادب کے سب سے بڑے انعام گیان پیٹھ ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ 'آئینہ جہاں' جلد دوم کی ترتیب و تدوین کے لیے جمیل اختر نے ایک اہم کاوش کی ہے۔ قومی اردو کونسل نے انھیں کلیات قرۃ العین حیدر کو مختلف جلدوں میں ترتیب دینے کا پروجیکٹ کیا فرمایا جسے انھوں نے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی کوشش کی ہے۔

ڈاکٹر جمیل اختر نے قرۃ العین حیدر کے فکشن پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اس کے علاوہ انھوں نے 2002 میں قرۃ العین حیدر کے انٹرویوز کا ایک مجموعہ بھی 'نوائے سروش' کے نام سے مرتب کیا اور بذات خود بھی ایک طویل ترین بات چیت کی جو 2005 میں 'انداز بیاں اور' کے نام سے کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ نئے دریافت شدہ افسانوں کو شامل کر کے انھوں نے اس کلیات کی جلد دوم کی اہمیت و افادیت میں چار چاند لگا دیے ہیں۔

قرۃ العین حیدر کے مستند افسانوی مجموعے کل چار ہیں ستاروں سے آگے (1946)، شیشے کے گھر (1954)، پت جھڑ کی آواز (1966) اور روشنی کی رفتار (1982)۔ ان چاروں کے علاوہ بہت سے افسانوی مجموعے قرۃ العین کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ مرتب نے جلد دوم میں 'قندیل چین' کے نام سے ایک نیا افسانوی مجموعہ ترتیب دیا ہے جسے اس میں شامل کیا گیا ہے۔ اس میں مندرجہ ذیل افسانے شامل ہیں: ایک شام، ارادے، دریچے کے سامنے، خوابوں کے محل، دھندلکوں کے پیچھے، میری گلی میں ایک پردیسی، زندگی کا سفر، دوسرا کنارہ، شیشے کے گھر جو ٹوٹ گئے، برسوں کی برف، وہی زمانہ وہی فسانہ وغیرہ۔

کلیات قرۃ العین حیدر (آئینہ جہاں) جلد دوم میں کل 133 افسانے شامل کیے گئے ہیں جن میں بہت سے افسانے ایسے ہیں جو اس سے قبل کسی مجموعے میں شامل نہیں ہوئے تھے، البتہ رسائل میں شائع ہو چکے تھے۔ مرتب نے انھیں تلاش بسیار کے بعد مختلف رسائل سے حاصل کیا ہے۔ بہت سے رسائل ایسے ہیں جو کب کے بند ہو چکے ہیں اور ہندوستان کے چند کتب خانوں میں ہی ان کی فائلیں موجود ہیں۔ ایسے افسانوں کی تعداد تقریباً 27 ہے۔ انھیں حاصل کرنے کے لیے انھوں نے پاکستان کا سفر بھی کیا ہے۔

اس جلد میں 1960 سے لے کر اب تک کے افسانے شامل ہیں۔ افسانہ نگاری کے لحاظ سے یہ زمانہ قرۃ العین حیدر کی زندگی کا سنہرا دور ہے۔ بھرپور فکری و فنی بالیدگی، شعور کی پختگی، سماجی و سیاسی مسائل سے آگہی اور عصری حسیت اس دور کے افسانوں میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان افسانوں میں ہند و پاک کی تقسیم کے بعد کی صورت حال، مہاجرت اور اس کے مسائل اور بین الاقوامیت کے مسائل، عالمی پیانے پر ہونے والی جنگوں سے تہذیبی غارت گری، تہذیبی آمیزش سے شخصیت کی تلاش کا مسئلہ، عالمی سیاحت، بدلتی قدریں، سماج و معاشرے کا زوال وغیرہ زیر تحریر آئے ہیں۔ ان کے کرداروں میں بڑی وسعت ہے۔ ہر جگہ ہر طبقے کے کردار ہیں جن کے مختلف طرح کے مسائل اور خیالات ہیں۔ ان کے اسلوب میں رنگا رنگی ہے۔

اس جلد میں شامل درج ذیل افسانے تازہ دریافت ہیں جو کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں، دکھلایئے لے جا کے تجھے مصر کا بازار، میں پوری ڈوبت ڈری، آوازیں، شربت والی گلی، تار پر چلنے والی، سنگھاردان، بڑے آدمی، آخر شب کے ہمسفر، ایک پرانی کہانی، تلاش اور طلسمی قالین وغیرہ۔

قرۃ العین حیدر کے افسانوں کے مطالعے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مصنفہ نے مغرب کے انداز میں مشرقی روح آمیزش کر کے نئے طرز کے افسانے کی پہلی بار اردو میں بنیاد رکھی۔ بیانیہ کی جگہ نئے بیانیہ یعنی خود کلامی، شعور کی رو اور فلیش بیک کی تکنیک، پلاٹ لیس ماحول پر مبنی اور غیر کرداری افسانے لکھے، ہر افسانہ ایک سے بڑھ کر ایک ہوتا تھا اس لیے قاری کو ان کی ذہنی افتاد کا صحیح اندازہ کرنے میں دشواری پیش آتی تھی۔ ہر افسانے کے بعد رائے میں تبدیلی کرنی پڑتی تھی۔ امید ہے کہ کلیات کی یہ جلد طلبا، اساتذہ، ریسرچ اسکالرز اور عام قاری دلچسپی سے پڑھیں گے، اس سے بھرپور استفادہ کریں گے اور کلیات قرۃ العین حیدر جلد دوم عوام و خواص میں مقبولیت حاصل کرے گی۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066

NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159

E-mail: ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تهذیب و تاریخ

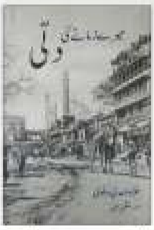

میرے زمانے کی دلی [یادداشت]

مرتب: ڈاکٹر مظہر احمد
صفحات: 332، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: ایم۔ آر۔ پبلی کیشنز، نئی دہلی
مبصر: پروفیسر اشتیاق احمد، جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

دلّی اور شاہ جہانی دلّی صرف ایک مقام نہیں؛ بلکہ ایک ثقافت کا نام ہے۔ اس میں قدیم ہندوستانی عناصر کے ساتھ مسلم ثقافت اور خصوصاً مغلیہ کلچر کے اثرات ملتے ہیں اور ان ہی کی مناسب ترکیب سے شاہ جہانی ثقافت یا اردو تہذیب نے جنم لیا۔ ایک عرصے تک پلی اور بڑھی، ترقی کے مراحل طے کیے۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب اس کے تار و پود بکھر گئے اور اس کی آغوش میں پلنے والے خوش مذاق افراد تتر بتر ہوگئے۔ ایسے ہی افراد میں ایک نام 'ملا واحدی' کا بھی ہے۔

ملاّ واحدی (1888-1976) دہلی کے اہم خاندان کے فرد تھے۔ ان کے آبا و اجداد شاہی خاندان سے بہت قریب رہے تھے۔ اس لیے شاہی آداب و رموز اور اصول وضوابط سے اچھی آگہی رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ کسی مخصوص ثقافت سے اس قدر قریب ہوکر کوئی شخص ان کے لسانی برتاؤ سے لاعلم کیوں کر ہوسکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واحدی صاحب نے قلعۂ معلّٰی سے اپنی خاندانی قربت کے ساتھ وہاں بولی جانے والی زبان پر بھی فخر کیا ہے اور اس کا انھیں حق حاصل ہے۔

ملا واحدی کی قلمی اور تحریری تربیت ایک حد تک خواجہ حسن نظامی دہلوی کے زیر اثر ہوئی۔ وہ نظامی صاحب سے مرید بھی تھے۔ اسی وجہ سے نظامی صاحب کے متعلق ان کے تاثرات میں عقیدت کے ساتھ شاگردی کی جھلک بھی ملتی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ دونوں کے قلمی سفر کی کہانی بھی یہی ہے۔ دراصل خواجہ صاحب کی تحریروں کے محرک اور اولین قاری بھی ملا واحدی ہی تھے۔ مختلف حیلوں سے انھیں لکھنے پر یہی ابھارا کرتے تھے۔ ایک عرصہ تک 'نظام المشائخ' جیسا مشہور زمانہ رسالہ بھی دونوں نے مل کر چلایا۔

تقسیم ہند کے بعد ملاّ واحدی 20 اکتوبر 1947 کو ہوائی راستے سے مع اہل وعیال پاکستان منتقل ہوگئے اور کراچی میں مقیم ہوئے۔ ابتدائی ایام میں مشکلات کا سامنا رہا، لیکن پھر زندگی بدلی اور دھیرے دھیرے سکون واطمینان قائم ہوگیا۔ یہاں کے قیام کے دوران دلّی اور اہالیانِ دلّی کی یاد نے انگڑائی لی اور پھر یہ انسیت قرطاس ابیض پر رقم ہوتی گئی اور 'میرے زمانے کی دلّی' [مطبوعہ: 1956، نظام المشائخ کراچی]، 'دلّی جو ایک شہر تھا' [مطبوعہ:....] اور 'دلّی کا پھیرا' [مطبوعہ: 1959] وغیرہ رقم ہوتی گئیں۔ ملا واحدی خود لکھتے ہیں:

''اب ہم یہی کرسکتے ہیں کہ دلّی کی تصویر محفوظ کردیں۔ تاکہ آنے والی نسلیں اس تصویر سے تھوڑا بہت اندازہ لگالیں کہ ہماری دلّی کیا تھی۔ ورنہ آنے والی نسلیں نہیں، یہ آج کل کے بچے بھی دلّی کو نہیں جانیں گے... اس کتاب میں تو میں ذاتی تاثرات قلم بند کرنا چاہتا ہوں کہ دلّی کے فلاں مشہور شخص اور فلاں غیر مشہور شخص میں، میں نے کیا خاص بات محسوس کی۔'' (مظہر احمد: مقدمہ، میرے زمانے کی دلی، ص: 27)

ان اقتباسات سے بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ملا واحدی نے اپنی تصنیف میں گذشتہ دہلی کا مرقع پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس ضمن میں انھوں نے مشہور و غیر مشہور افراد و کردار کے شخصی اور سماجی نقش کو درشانے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب پانچ عناوین پر مشتمل ہے:

(1) دلّی چھوڑنے سے پہلے —— اس میں تقسیم اور ہجرت کے سلسلے میں دہلی میں ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات اور امن وامان کی کوششوں کو بیان کیا گیا ہے۔
(2) دلّی چھوڑنے کے بعد —— اس میں دلّی سے ہجرت کر کے راول پنڈی پہنچنے اور کراچی کے دور قیام کی روداد پیش کی گئی ہے۔
(3) دلّی کی اہمیت —— دلّی کی بھولی بسری کہانیوں کو دور حاضر کے ثقافتی تناظر میں بیان کیا گیا ہے۔
(4) دلّی کے نوزخم —— اس میں ملا واحدی نے تاریخی سیاق میں گفتگو کی ہے۔ دلّی کے اُجڑنے اور بسنے کی مختلف کہانیوں کو اس میں جمع کردیا گیا ہے۔
(5) میرے زمانے کی دلّی —— یہی اس کتاب کا سب سے اہم اور منفرد باب ہے۔ اسی کے لیے یہ پوری کتاب مرتب کی گئی ہے۔ دیگر مضامین صرف تمہید اور پس منظر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ کتاب کا سب سے طویل مضمون بھی یہی ہے۔ اس مضمون میں ملا واحدی نے اپنے زمانے کی دلّی کے سماجی، ادبی، ثقافتی اور سیاسی حالات کے تناظر میں یہاں بسنے والے قدیم و جدید کرداروں کو ابھارنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔

اس کی مقبولیت و اعتنا کا اندازہ دیوان سنگھ مفتون ایڈیٹر 'ریاست' کے درج ذیل جملوں سے کیا جاسکتا ہے:

''اس ہفتے ملاّ واحدی کی نئی تصنیف 'میرے زمانے کی دلّی' شائع ہوگئی، جس کی سوا تین سو صفحات ضخامت ہے اور جسے دہلی کے پچاس برس کی مستند تاریخ قرار دیا جانا چاہیے۔''

(مظہر احمد: مقدمہ، میرے زمانے کی دلی، ص: 31)

مصنف نے جس ایمان داری اور خلوص کے ساتھ یہ مرقعے بنائے ہیں، اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ان کا درد دل کس قدر شدید ہے۔ مصنف نے سلیس اور سادہ اسلوب اور بے تکلف پیرائے میں ان باتوں کو بیان کردیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ زیر تبصرہ تصنیف دہلوی تمدن و معاشرت کی تاریخ ہونے کے ساتھ دہلی مرحوم کا نوحہ بھی بن گئی ہے۔ اس میں دلچسپی اور اثر انگیزی کے ساتھ مصنف کی اشک باری بھی جذب ہوگئی ہے۔

ڈاکٹر مظہر احمد [ایسوسی ایٹ پروفیسر ذاکر حسین دہلی کالج/ ایوننگ] نے اس کتاب کو تہذیب وترتیب کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اس پر وہ ہمارے شکریے کے مستحق ہیں کہ دہلوی نثر کے ایک اچھے قلم کار کو نئے سرے سے پڑھوانے کا بیڑہ اٹھایا ہے۔ یہ اڈیشن کتابت وطباعت کے اعتبار سے دیدہ زیب اور صاف وشفاف ڈھنگ سے شائع ہوا ہے۔ اس کے آغاز میں مرتب نے مفصل مقدمہ کے ساتھ کتاب کے آخر میں فرہنگ بھی ملحق کردی ہے۔ اس کے علاوہ دہلی کی اہم تاریخی عمارتوں جن کا اس کتاب میں ذکر ہوا ہے؛ ان کا البم بھی شامل کردیا ہے۔ نیز سب سے اہم بات یہ ہے کہ کتاب کے آخر میں 'انڈکس' بھی ملحق کردیا گیا ہے۔ اس کی وجہ سے مخصوص حالات میں کسی شخص/ مقام کے بارے میں ملا واحدی کے تاثرات کو فوراً معلوم کرلینا بہت آسان ہوگیا ہے۔

مجھے امید ہے کہ یہ کتاب طلبہ کے ساتھ اردو کے صاحبِ ذوق اساتذہ کے لیے بھی قابل استفادہ ثابت ہوگی۔

پونے کی جدید تاریخ اردو ادب

مصنف: قاضی مشتاق احمد

صفحات: 215، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

مبصر: کیپٹن ڈاکٹر ایم ایم شیخ،

روضہ باغ، اورنگ آباد۔ 431001 (مہاراشٹر)

یہ زبانِ اردو کی شیرینی و دلکشی ہے کہ اس نے مراٹھی زبان وادب کے مرکز پونے جیسے علاقے میں عوام کے دلوں میں بھی جگہ بنائی اور یہاں اردو زبان دن بہ دن اپنی سحر طرازیوں سے دلوں کو مسخر کر رہی ہے۔

پونہ ایک تہذیبی اور تعلیمی شہر ہے جسے عام طور پر مشرق کا آکسفورڈ اور دکن کا علی گڑھ بھی کہا گیا ہے۔ اس طرح یہ پونا یونیورسٹی اور کئی تعلیمی اداروں اور جدید انفارمیشن ٹکنالوجی کا اہم مرکز بھی ہے۔ پونا فلم اور ٹیلی ویژن انسٹی ٹیوٹ کی وجہ سے بھی شہرت رکھتا ہے۔ قاضی مشتاق احمد کی یہ کتاب 'پونے کی جدید تاریخ اردو ادب' میں اردو زبان و ادب میں پونے شہر کی خدمات پر محیط ہے۔ اس موضوع پر تحریر اور تخلیق کا سلسلہ اولاً ایک محقق مرزا حمید بیگ تجمل قادری صاحب کا مرہون منت ہے۔ بقول ان کے پونہ میں حیدرآباد دکن سے آئے ہوئے پہلے شاعر و روحانی ہستی سید یٰسین مرتضیٰ شاہ قادری تھے۔ ان کی کاوشوں سے یہاں کے باشندوں کی روحانی اور علمی تربیت ہوئی جس کی وجہ سے لوگ اردو ادب کی طرف مائل ہوئے۔ یہاں مروج تین رسم الخط مراٹھی جو بال بودھ کہلائی اور موڑی اور فارسی نستعلیق بھی اہمیت کی حامل رہی۔ اس طرح گیسوئے اردو کو سنوارنے میں جنوبی ہندوستان سے یہاں آکر بسنے والے مفکرین، شعرا، ادبا اور دانشوروں کا بڑا رول رہا ہے۔

پونے کی تاریخ پر ہم اگر طائرانہ نظر ڈالیں تو معلوم ہوگا کہ ایک عرب کمانڈر 'زباریہ' نے یہاں ایک Inner Fort کی تعمیر کی اور ایک قصبے کی بنیاد رکھی جو پہلے ایک معمولی سا دیہات تھا۔ اس کے اطراف کچھ برہمن اور تجارت پیشہ افراد آباد تھے۔ کثیر تعداد میں مسلمانوں کی رہائشیں اور آمد کے سبب مسجدیں اور درگاہیں بھی وجود میں آتی گئیں۔ پونے کی تاریخ میں پیشوا حکمرانوں میں باجی راؤ اول بہت مشہور ہوا۔ جب ممبئی کو صوبے کی حیثیت حاصل ہوئی اور سر مولوی رفیع الدین یہاں کی حکومت میں وزیر بنے تو 1934 میں اردو کو دوسری زبان کا مقام ملا۔ ڈیڑھ دو ہزار سال پہلے یہاں ایک چھوٹی سی بستی تھی جو پن ڈی کہلاتی تھی، اسی طرح بدھ مت کی گپھا اور جنگلی مہاراج کے قریب پانیشور کے غار کی دریافت سے بھی پتہ چلتا ہے کہ یہاں کسی زمانے میں بدھ بھکشوں کا بسیرا ہوا کرتا تھا۔ اس علاقے کا تعلق بھیمانَدی (کورے گاؤں) سے ہے۔ آٹھویں صدی میں یہاں راشٹرکوٹ خاندان کی حکومت تھی جس میں اس شہر کا نام پنیہ بتایا گیا ہے۔ اسی طرح سنت نامدیو مہاراج کی شہرۂ آفاق تصنیف 'نامدیو گاتھا' میں پونے کے پنیشور نام کا ذکر کیا گیا ہے۔

پونے میں اردو تعلیم کا آغاز مولوی رفیع الدین نے 1912 میں شروع کیا اور اینگلو اردو ہائی اسکول کا قیام عمل میں آیا۔ پونے میں 1937 میں حاجی غلام محمد اعظم کی مالی اعانت سے اینگلو اردو ہائی اسکول میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے الگ الگ اسکول قائم ہوئے۔ اسی طرح کیمپ علاقے میں مولیدینہ ہائی اسکول کی بنیاد ڈالی گئی۔ آجکل اعظم کیمپس کا بڑا اہم رول ہے جسے حاجی غلام محمد اعظم کے عطیے سے حاصل کیا گیا۔ ساڑھے بائیس ایکڑ زمین تحویل میں لے کر جناب پی اے انعامدار نے یہاں کا جس کا جال پھیلا دیا۔ آجکل وہ منی یونیورسٹی کے نام سے جانا جا رہا ہے۔ انھوں نے پونے کو دکن کا علی گڑھ بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اسی طرح پونے میں اردو زبان کے فروغ کے لیے دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد ڈالی گئی جس کے تحت ایک شاندار لائبریری اور ریڈنگ روم بھی چلایا جا رہا ہے۔ مضافاتی علاقے کھڑکی میں قائم ہمدرد لائبریری بھی تعلیمی، ثقافتی اور ادبی سرگرمیوں کی وجہ سے اپنا مقام رکھتی ہے۔ کونڈوا پونے کے دوسرے مضافاتی علاقے میں اینا فاؤنڈیشن ENA Foundation اردو کے فروغ اور بقا کے لیے کام کر رہا ہے۔ ان تمام کی کاوشوں سے پونے میں اردو کی ترقی رواں دواں ہے۔ اسی طرح جنوری 1967 میں بال بھارتی کا قیام عمل میں آیا جو اردو زبان کی درسی کتابوں کی تدوین اور ترقی میں بڑا اہم رول ادا کر رہا ہے۔

اردو شاعری کو پونے کے مرہٹی ماحول میں چمکانے کا سہرا حیدرآباد دکن کی صاحب دیوان شاعرہ اور رقاصہ ماہ لقا چندا کے سر جاتا ہے جو باجی راؤ کی ہی دعوت پر پونے آئی تھیں۔ اسی طرح باجی راؤ پیشوا کی محبوبہ اور نور نظر مستانی کی زبان بھی اردو بندیل کھنڈی تھی اور اسی کے ذریعے پیشوا کے محل یعنی شنیوار واڑہ میں اردو زبان کا داخلہ ہوا۔ مراٹھی قارئین کو اردو زبان سے متعارف کرانے کا سہرا مشہور محقق و ادیب و نقاد ستیو مادھوراؤ پگڑی (1910-1994) کے سر جاتا ہے۔ دوسری شخصیت شری پاد جوشی 1920-2002 کی ہے۔ وہ اردو اور مراٹھی زبان کے مسلمہ ادیب و نقاد رہے ہیں۔ انھوں نے حیدرآباد میں رہ کر اردو ذریعہ تعلیم سے اپنی تعلیم مکمل کی۔ انھوں نے سو سے زائد کتابیں لکھیں جو اردو زبان وادب کا سرمایہ ہیں۔ اسی طرح اردو کے ایک محب ڈاکٹر تکارام دیورے نے بھی اردو ادب کی خدمت کر کے پونے میں اپنی حیثیت منوائی۔ وہ اردو اور فارسی دونوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی اردو زبان کی ترقی میں بڑا رول ادا کیا۔ ڈاکٹر عصمت جاوید شیخ کا تعلق بھی پونا سے رہا۔ اورنگ آباد کے گورنمنٹ کالج میں شعبہ اردو کے سربراہ رہے۔ ان کی تحقیقی کتابیں قابل تعریف ہیں۔ یقیناً انیس چشتی صاحب کے بغیر اردو اور پونا کا ذکر ادھورا رہ گیا۔ ان کی خدمات اردو ادب میں بطور نقاد، مترجم اور فاضل مصنف کے طور پر کی جاسکتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ تحقیق بڑا ہی دشوار گزار کام ہے۔ اس خارزار میں قدم رکھنا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں مگر قاضی مشتاق احمد نے یہ کتاب پونے کی جدید تاریخ اردو ادب رقم کر کے اپنے نام ایک سنہرا کارنامہ لکھ دیا۔ اس کتاب کو لکھ کر انھوں نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ نہ صرف معروف مصنف، ڈرامہ نگار، افسانہ نگار اور محقق ہیں بلکہ صحیح معنوں میں محب اردو کہلانے کے مستحق ہیں۔

زیر نظر کتاب پر اگر سرسری نظر ڈالیں تو پتہ چلے گا کہ اس میں مختلف موضوعات بیان ہوئے ہیں جو قارئین کی دلچسپی بنائے رکھتے ہیں۔ اس کتاب کا سرورق انتہائی جاذب نظر اور دیدہ زیب ہے۔ کتاب کا انتساب بھی بہت خوب ہے یعنی 'ہماری پیاری زبان اردو کے نام' ہے۔ اس کتاب کے شائع ہونے پر جناب قاضی مشتاق احمد دلی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

تحقیق و تنقید

امیجری کا زوال

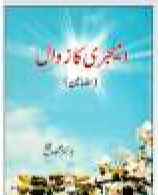

مصنف/ ناشر: ڈاکٹر محمود شیخ

صفحات: 164، قیمت: 150 روپے

مبصر: محمد اشفاق عارف

صدر شعبۂ اردو، گورنمنٹ ایم بی کالج، جبل پور

دورِ حاضر میں اردو تنقید نگاری میں ڈاکٹر محمود شیخ ایک اہم اور منفرد مقام رکھتے ہیں۔ ڈاکٹر محمود شیخ کے مضامین بے حد انوکھے اور نادر ہیں۔ اردو ادب میں 'علامت' کے بارے میں علمائے ادب کی رائے مختلف پائی جاتی ہے۔ علامہ اقبال کے 'مردِ مومن اور شاہین' کے ضمن میں ڈاکٹر ابن فرید اور پروفیسر سید جعفر صاحبہ فرماتے ہیں کہ مردِ مومن اور شاہین علامت ہیں

جب کہ ڈاکٹر آل احمد سرور کے مطابق یہ استعارہ ہے۔ ڈاکٹر محمود شیخ کی رائے اس بارے میں حتمی ہے کہ اردو ادب میں علامتوں کا استعمال نہیں کیا جاتا بلکہ استعاروں سے کام لیا جاتا ہے کیونکہ استعارہ کے بغیر امیجری اور لطف بیان کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔

'امیجری کا زوال' ڈاکٹر محمود شیخ کے تنقیدی مضامین کی چوتھی کتاب ہے۔ اس سے قبل ان کی تین کتابیں 'جذباتی اور جدلیاتی شعور ادب'، 'علامیاتی تفہیم کا بیان' اور 'بیان کی تلاش' منظر عام پر آچکی ہیں اور ارباب ادب سے داد و تحسین وصول کر چکی ہیں۔

اس کتاب 'امیجری کا زوال' میں ان کے 17 مضامین شامل ہیں۔ ہر مضمون اپنے عنوان اور موضوع کے اعتبار سے انوکھا اور نادر ہے جیسے 'جمہوریت، ادب اور اخلاقیات'، 'استعارہ اور سیاسی ذہن کی کشمکش'؛ 'مصنوعی ذہانت کا ادبی شعور' وغیرہ، پچھلی دو دہائیوں میں ڈاکٹر محمود شیخ نے جن موضوعات کو قلم بند کیا ہے ان موضوعات پر کوئی دوسرا مضمون دور دور تک نظر نہیں آتا۔

ڈاکٹر محمود شیخ کے مطابق کائنات کا وجود فطرت، جذبہ اور اخلاق کے دم سے قائم ہے لیکن فطری معاشرہ اب سیاسی ہو گیا ہے۔ تمام انسانی علوم و فنون سیاسی نقد و نظر کے ترجمان ہو گئے ہیں۔ قصہ کہانی کی ایمائیت حقیقت پسند ذہنیت کی نذر ہو گئی ہے۔ سائنٹفک اور تکنیکی علوم کی مادہ پرست ذہنیت نے معاشرے میں لاتعداد خرابیاں پیدا کر دی ہیں۔ معاش اور معیشت کے فلسفوں نے اقوام عالم کی نظروں کو خیرہ کر دیا ہے۔ فلسفہ کی اخلاقیات نہیں ہوتی۔ اس لیے تمام دنیا میں فطری جذبات اور احساسات کا فقدان پیدا ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر محمود شیخ کے مضامین مشرقی اقدار حیات کی مثبت قدروں کو فطری، جذباتی اور اخلاقی شعور کی روشنی میں تلاش کرنے کی جد و جہد کرتے ہیں۔

اس کتاب میں شامل پہلے مضمون 'جمہوریت، ادب اور اخلاقیات' میں آپ نے جمہوریت کے سبب پیدا ہونے والی خرابیوں کی نشاندہی کی ہے۔

اسی مضمون میں آپ نے 'علامت' اور 'استعارہ' کے فرق کو واضح کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

''علامت کا اطلاق تجریدی ادب پر کیا جا سکتا ہے۔ جذباتی محاکات کے لیے 'استعارہ' ہی زیب دیتا ہے، سبب یہ کہ مغربی ادب کی بنیاد 'فلسفۂ نفس' کے مادّیاتی تصورات پر منحصر ہے اور مشرقی ذہن 'جذبۂ صداقت' کے غیر مرئی تصورات پر یقین رکھتا ہے۔ دنیاوی حقائق کا تعلق چونکہ انسان کی عینیت پسند طبیعت سے ہے۔ اس لیے جو ظاہر و موجود ہے اسی پر 'علامت' کا اطلاق ہو سکتا ہے۔ وہ جذبات و احساسات جن کے ذریعے رشتوں کا وجود قائم ہے۔ مثلاً والدین، بھائی بہن اور مرد و زن کی محبت کو علامت نہیں کہا جا سکتا کیونکہ تمام جذباتی رشتے ایک لازوال حقیقت ہیں لیکن مشنویوں اور میکانکی طرز فکر سے انسان کا کوئی رشتہ پائیدار اور کامیاب نہیں ہو سکتا۔ کاروباری اور صارفیت زدہ رشتوں میں تاجرانہ رفاقت تو ہوتی ہے، جذباتی وابستگی نہیں ہوتی۔ لہٰذا مادیاتی فلسفہ، سائنس و ٹکنالوجی کے علاوہ سیاسی اور سماجی معیشت کے زیر اثر ترتیب دیے گئے تمام تصورات ادب و فن علامتی ہو سکتے ہیں۔

ڈاکٹر محمود شیخ صاحب نے اس کتاب کے سارے مضامین ایک نقاد کی حیثیت سے منتخب کیے ہیں جس طرح غالب نے اپنے دیوان کو مرتب کرتے وقت اپنا بہت سا کلام ناموزوں سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اسی طرح ڈاکٹر محمود شیخ نے بھی اپنے کئی مضامین اس انتخاب سے الگ کر دیے اور صرف وہی مضامین شامل کیے جو ان کی تنقیدی بصیرت کے شایان شان تھے۔ اس لیے اس کتاب کا ہر مضمون قابل ستائش ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

مضمون 'امیجری کا زوال' اکیسویں صدی کے تخلیقی ادب کے زوال کے اسباب بیان کرتا ہے۔ اردو ادب میں شاعروں کی طرح تنقید نگاروں کی بہتات ہو گئی ہے۔ عام طور پر ہر شاعر اور ہر نثر نگار انھیں موضوعات پر قلم اٹھاتا ہے جو کئی برسوں سے رائج ہیں۔ تخلیقی ادب کم لکھا جا رہا ہے۔ بچوں کی کہانیاں اور عمدہ افسانے بیان کرنے والے ادیبوں کا فقدان ہو گیا ہے۔

ڈاکٹر محمود شیخ لکھتے ہیں:

''21 ویں صدی کی سیاسی حقیقت پسندی کے جوش نے تخیلاتی فضا کی تعمیر میں فطرتِ انسانی کے مرتب کردہ ڈکشن کو فراموش کر دیا ہے۔ جدید افسانہ اور ناول نگار عام طور پر اپنا ایک غیر جذباتی وژن رکھتے ہیں۔ اس لیے واقعہ خواہ کتنا ہی دردناک اور حقیقت آمیز کیوں نہ ہو حسن بیان سے محروم ہوتا ہے۔ افسانہ کا اختتام میر اور مومن کے غزل کے مقطع کی طرح دلچسپ اور ڈرامائی تاثرات سے بھرپور بھلے ہی نہ ہو مگر نتیجہ خیز تو ہونا ہی چاہیے تاکہ قاری کو غور و فکر پر مجبور کیا جا سکے۔ حالانکہ جذباتی اور اخلاقی موضوعات زندگی کے معاشی، سیاسی اور سماجی مسائل کے حل میں ناکام ثابت ہوئے ہیں لیکن انسان کی باحس ذہنیت کو بے حسی کے کرب سے بچانا بھی ضروری ہے ورنہ انسانی ذہن و کردار کسی کمپیوٹرائز مشین کی طرح اپنے وجود کی توانائی سے محروم ہو کر محض عقلی دلائل کا محتاج ہو جائے گا۔ موجودہ سیاسی اور صارفیت زدہ معاشرہ اور انسانیت کے تمام جذباتی محاکات پر زوال آگیا ہے اس لیے ایک بار پھر قصہ کہانی کی صحت مند روایت کی طرف مراجعت ضروری ہے تاکہ تخیلات انسانی کو مثبت انسانی خیالات کی دنیا آباد کرنے کا حوصلہ مل سکے۔'' (امیجری کا زوال، ص 78)

ڈاکٹر محمود شیخ کی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے خیالات کے دریا کو کوزہ میں بند کرنے کا ہنر جانتے ہیں۔ ان کے ہر پیراگراف کو ایک مضمون کے طور پر وسعت دی جا سکتی ہے۔ کتاب 'امیجری کا زوال' دیدہ زیب طباعت سے آراستہ ہے۔

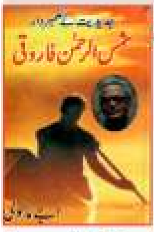

جدیدیت کے علمبردار: شمس الرحمٰن فاروقی

مصنف: ڈاکٹر اجے مالوی

صفحات: 404، قیمت: 600، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: جے بھارتی پرکاشن، الہ آباد

مبصر: توصیف بریلوی، شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

شمس الرحمٰن فاروقی نے اردو تنقید کو نہ صرف متاثر کیا بلکہ ادب میں اپنے رجحان 'جدیدیت' کا لوہا بھی منوایا۔ وہ بیک وقت نقاد، ماہر لسانیات، فکشن نگار اور شاعر بھی تھے۔ اردو تنقید و تحقیق کے حوالے سے انھوں نے متعدد کتابیں یادگار چھوڑی ہیں۔ اردو تنقید میں جدیدیت کے رجحان کا اضافہ انھیں کے دم سے ہوا یا الگ بحث ہے کہ یہ رجحان مقبول ہوا یا نہیں۔ اس تحریر کا مقصد ڈاکٹر اجے مالوی کی ترتیب کردہ کتاب 'جدیدیت کے علم بردار شمس الرحمٰن فاروقی' کا مختصر جائزہ پیش کرنا ہے۔

کتاب کی ابتدا ایک پر مغز اور مدلل مقدمے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ڈاکٹر اجے مالوی نے شمس الرحمٰن فاروقی کے کئی نظریات سے اختلاف بھی کیا ہے اور انھیں سراہا بھی اور اپنی باتوں کو حوالوں کے ساتھ کتاب میں پیش بھی کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کتاب میں شمس الرحمٰن فاروقی پر ایک تفصیلی توقیت نامہ بھی پیش کیا ہے جس میں فاروقی صاحب کی پیدائش، وفات، رہائش اور تعلیم کے علاوہ ان کی کتب کی الگ الگ فہرست سازی بھی کی ہے۔ ان کتابوں میں انگریزی، اردو، ہندی کے علاوہ ترجمہ شدہ کتابوں کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ تنقید، تدوین اور صحافت سے متعلق کتابوں کی فہرست بھی شامل ہے حتیٰ کہ فاروقی صاحب کی لکھی ہوئی یا مرتب کردہ

کسی بھی کتاب کو نظر انداز نہیں کیا گیا ہے۔ لہٰذا آئندہ زمانے میں شمس الرحمٰن فاروقی پر تحقیق کرنے والوں کو آسانی ہوگی۔

شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنی زندگی میں متعدد ممالک کا سفر کیا۔ ان میں بعض اسفار ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن بیشتر ادبی نوعیت کے ہیں۔ ڈاکٹر اجے مالوی نے فاروقی صاحب کے ان اسفار کے متعلق معلومات فراہم کی ہے۔

ڈاکٹر اجے مالوی نے کتاب ہذا میں فاروقی صاحب پر دو انٹرویو بھی شامل کیے ہیں۔ پہلا انٹرویو مناظر عاشق ہرگانوی اور دوسرا رحیل صدیقی/احمد محفوظ کا ہے۔ ان دونوں انٹرویو میں مختلف ادبی زاویوں سے سوالات اور ان کے جوابات ملتے ہیں۔

مذکورہ کتاب کا تیسرا باب مضامین سے متعلق ہے جس میں فاروقی صاحب پر اردو ادب کی مایہ ناز شخصیات سے لے کر کچھ طالب علموں کے بھی مضامین شامل ہیں جو کہ تعداد میں 33 ہیں۔ ان مضمون نگاروں میں انتظار حسین، غلام شبیر رانا، شیخ عقیل احمد، حقانی القاسمی اور پروفیسر علی احمد فاطمی کے نام بطور خاص ہیں۔ راقم کا مضمون بھی فاروقی صاحب کے ناول 'قبض زماں' پر شامل کتاب ہے۔ اس باب میں موصوف کی تمام ادبی سرگرمیوں پر خامہ فرسائی کی گئی ہے اور مختلف نوعیت کے مضامین بھی لکھے گئے ہیں جو نہ صرف فاروقی صاحب کے ادبی مقام کو متعین کرتے ہیں بلکہ مضمون نگاروں کے مختلف النوع موضوعات کو بھی ظاہر کرتے ہیں۔ فاروقی صاحب کی تنقیدی صلاحیت کا اعتراف کرتے ہوئے جناب شیخ عقیل احمد اپنے مضمون میں رقمطراز ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی ان شخصیات میں سے ہیں جن کی تنقیدی تحریروں سے میں نے بہت کچھ سیکھا اور سمجھا ہے۔ تنقید کے بہت سے اہم مباحث کی تفہیم کا ذریعہ ان کی تنقیدی تحریریں رہی ہیں۔ اگر میں یہ کتابیں نہ پڑھتا تو شاید تنقید کی مبادیات سے صحیح طور پر واقف نہ ہو پاتا۔ اس حقیقت کے اعتراف میں مجھے بخل سے کام نہیں لینا چاہیے کہ فاروقی اور ان کے معاصرین کی تحریریں میرے لیے ہمیشہ مشعل راہ رہی ہیں۔''

(کتاب ہذا، ص 137)

حقانی القاسمی صاحب کچھ یوں لکھتے ہیں:

''شمس الرحمٰن فاروقی نابغۂ عصر تھے اور علوم و ادبیات کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ تنقید کے باب میں ان کا نام بہت نمایاں ہے۔ معاصر نقادوں میں وہ سرفہرست سمجھے جاتے تھے۔ ماہنامہ 'شب خون' کے ذریعے انھوں نے بہت سے نئے ذہنوں کی تربیت کی اور جدیدیت کے رجحانات اور زاویے سے روشناس کیا۔ اس جدیدیت سے اختلاف کی بہت گنجائش ہے مگر جدیدیت نے بہت سے تخلیقی ذہنوں کو متحرک و مہمیز کیا اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا، بہت سے نئے نظریات و رجحانات سے واقفیت کا ذریعہ یہی تحریک بنی اسی لیے یہ تحریک کسی نہ کسی شکل میں زندہ رہی۔'' (کتاب ہذا، ص 142)

مندرجہ بالا دونوں اقتباسات سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی کی تنقیدی حیثیت کیا ہے اور عصر حاضر کے نقادوں نے بھی ان کی صلاحیتوں کا اعتراف کیا ہے۔

یوں تو پوری کتاب شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کو خراج عقیدت ہے لیکن بالخصوص آخری باب خراج عقیدت سے تعلق رکھتا ہے جس میں شعرائے کرام نے منظوم خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

اس کتاب کے مجموعی مطالعے سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ مذکورہ کتاب میں بہت ہی معلوماتی اور اہم مواد شامل ہے جو نہ صرف فاروقی صاحب کو سمجھنے میں معاون ہے بلکہ نئے تنقیدی گوشوں پر غور و فکر کی بھی دعوت دیتا ہے۔ ڈاکٹر اجے مالوی کا یہ کارنامہ ادبی لحاظ سے قابل مبارکباد ہے۔

اٹھارویں صدی میں اردو غزل کا فکری نظام

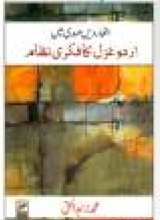

مصنف: محمد زاہد الحق

صفحات: 256، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

مبصر: جاوید رسول

سینٹرل یونی ورسٹی آف حیدرآباد، گچی باولی، حیدرآباد۔ 500046

'اٹھارویں صدی میں اردو غزل کا فکری نظام' ڈاکٹر محمد زاہد الحق کی تازہ تصنیف ہے جس میں انھوں نے اٹھارویں صدی کی کلاسیکی غزل کے تہذیبی و فکری نظام پر بحث کی ہے۔ یہ نظام کیسے، کن حالات میں کن عناصر سے تشکیل پایا، وقت کے ساتھ ساتھ کیا کچھ تبدیلیاں اس میں رونما ہوئیں، شعرا کی سائیکی پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے اور کلاسیکی غزل کی شعریات کی ترتیب میں اس نظام فکر کا کیا رول رہا ہے، اس کتاب میں ان تمام امور سے متعلق پانچ ابواب پر مشتمل مفصل بحث موجود ہے۔

باب اول اٹھارویں صدی کے تہذیبی و ادبی پس منظر پر محیط ہے جس میں شمالی ہندستان پر خلجی، تغلق، لودی، تیموریہ اور مغلیہ حکمرانوں کی فوجی معرکہ آرائیوں اور سلطنت کے حصول سے تہذیبی و تمدنی بالخصوص لسانی سطح پر پیدا شدہ ان تمام تبدیلیوں کا تذکرہ موجود ہے جن کے ہمہ گیر اثرات ادب پر مرتب ہوئے۔ اردو غزل کی کلاسیکی روایت سے متعلق یہ باب اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس میں مذکورہ حکمرانوں کے توسط سے فروغ پانے والی ہند ایرانی تہذیب کا دائرہ کار دکن تک پھیل جانے کے ان تاریخی اسباب کا بھی تذکرہ ملتا ہے جن سے دکن میں نئی لسانی اور ثقافتی تشکیل کی بنیاد پڑی اور جس سے اردو ادب کا ابتدائی دور منسوب ہے۔

کتاب کے پہلے باب کی دوسری شق ادبی پس منظر کی اسی تہذیبی و فکری تنظیم کا احاطہ کرتی ہے جس میں دکنی دور کی اردو روایت سے لے کر ولی کے دیوان کی دلی آمد اور مابعد ادبی صورت حال کا مفصل جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں شمالی ہندستان میں ایہام گوئی کی روایت کے تذکرے کے دوران مصنف نے معروضی انتقاد سے کام لیتے ہوئے اس کے مثبت اور منفی دونوں پہلوؤں کو ملحوظ رکھا ہے اور خود مصنف کے نقطۂ نظر سے یہ گمان گزرتا ہے کہ مصنف، پروفیسر محمد حسن کی رائے کی تائید کرتے ہیں:

''اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ایہام گوئی میں تصنع، لفظی بازی گری، صنعت گری اور شعبدہ بازی کی مکمل کارفرمائی ہے۔'' (ص 47)

لیکن دلی میں شاعری اس واقعے سے قبل بھی ہوتی رہی۔ جعفر زٹلی کا نام اس لحاظ سے دلی کی غزلیہ شاعری کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ کتاب کا دوسرا باب غزلیہ شاعری میں اسلوبیاتی اور موضوعاتی سطح پر ہوئے ان مخصوص تجربوں اور تبدیلیوں کا احاطہ کرتا ہے جن سے اس صنف کے ارتقائی عوامل و محرکات کا پتا چلتا ہے۔ مذکورہ باب کو تین شقوں میں بانٹا گیا ہے۔ پہلی شق میں ولی کے دیوان کی دلی آمد سے قبل کی صورت حال اور جعفر زٹلی کے شاعرانہ اختصاص کا تذکرہ ہے۔ جہاں اردو کے بعض نقادوں نے تعصب کی بنا پر جعفر زٹلی کی ہزلیہ شاعری کے پیچھے ان کے ذہنی پس منظر اور عصری شعور کو نظر انداز کر کے ان کے شاعرانہ بلکہ تخلیقی اختصاص کی نفی کی، وہیں زیر تبصرہ کتاب میں مصنف نے جعفر کے سیاسی و سماجی شعور کا تعمق نظر سے مطالعہ کیا ہے۔

باب دوم کی دوسری شق میں دلی کی شعری روایت میں ولی دکنی اور ان کے دیوان کی آمد کے اثرات کا خلاصہ موجود ہے۔ اس شق میں ان تمام روایتوں پر جامع بحث کی گئی ہے جو ولی اور سعد اللہ گلشن سے متعلق مشہور ہیں۔ جب کہ آخری شق میں فارسی زبان و اسلوب کے غالب رجحان کی طرف مختصر اشارہ ملتا ہے جو غزل کے ارتقائی سفر کے عوامل میں سے ایک ہے۔

تیسرے باب کی اس پہلی شق میں جہاں دکن کی بسیط شعری روایت کا احاطہ کیا گیا ہے تاہم یہ محسوس ہوتا ہے کہ تیسرے باب میں سراج کا تذکرہ اس لحاظ سے بھی اہم تھا کہ دکنی شعری روایت میں اس کے مقام کا تعین ہو پاتا۔ وہیں چوتھے باب میں سراج کی شاعری کے معاشرتی اور تہذیبی پہلو پر مفصل بیان ملتا ہے۔

بہرکیف! تیسرے باب کی دوسری شق میں اٹھارویں صدی کے شمالی ہند کی غزلیہ شاعری کی فکری جہات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ اس شق میں بیدل اور آرزو کے فارسی اسالیب کے اثرات اور تقلیدی عمل کا بھی تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے علاوہ جعفر زٹلی، میر اور قائم چاندپوری کے شعری اختصاص پر مفصل بحث موجود ہے نیز اس دور کی شاعری کے مختلف فکری رجحانات جیسے ریختی اور ایہام کا بھی مطالعہ شامل ہے۔ مجموعی طور پر یہ باب اس مکمل تصنیف کا ماحصل ہے۔

کتاب کے چوتھے باب میں اٹھارویں صدی کی غزل میں شعورِ زندگی کے انھی عناصر کی نشان دہی کی گئی ہے۔ بقول مصنف ''اٹھارویں صدی کے آغاز سے ہی ایک پرسوز رنگ، جذباتی سطح پر شکست خوردگی اور کھونے کا احساس اس قدر بڑھ جاتا ہے کہ اس کی مثال تاریخ میں بھی کم کم ملے گی... '' (ص 178)

اس چوتھے باب کی آخری شق میں اٹھارویں صدی کے شعرا بالخصوص دکن وشمال کے ممتاز شعرا کی فکری جہات کا تجزیہ ملتا ہے۔ اس باب میں شعری تخلیقات میں مضمران تہذیبی وثقافتی اقدار کی تشخیص کی گئی ہے جو اس صدی کی غزلیہ شاعری کے فکری نظام کی تشکیل میں کارفرما ہے۔ مزید اس شق میں مذکورہ شعرا کے ذہنی وفکری پس منظر کا بھی احاطہ کیا گیا ہے جو ان کے عصری اور اجتماعی شعور پر دلالت کرتا ہے۔

کتاب کا آخری باب غزل کے فکری نظام کی تشکیل میں معاون چند اہم دبستانوں کی تخلیقی سرگرمیوں اور فکری کاوشوں کا احاطہ کرتا ہے۔ ابھی تک اردو ادب کے طالب علموں کو فقط دلی اور لکھنؤ کے دبستان یاد تھے لیکن اس تصنیف میں پہلی بار یکجا طور پر دبستان عظیم آباد اور دبستان رامپور کو دلی اور لکھنؤ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ عظیم آباد اور رامپور کی مقامی تہذیب کے اثرات کس طرح ان خطوں کی کلاسیکی غزل پر مرتب ہوئے اس پوری صورت حال کو مصنف نے اٹھارویں صدی کے ان نمائندہ شعرا کے کلام میں تلاش کرنے کی سعی کی ہے جن کا تعلق عظیم آباد اور رامپور سے تھا۔ مصنف نے جس تلاش وجستجو سے مذکورہ شعرا کے کلام کا انتخاب کیا ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ اس تحقیقی مقالے کے پیچھے مصنف کا ادبی ذوق بنیادی محرک کے طور پر کارفرما رہا ہے۔ زیر تبصرہ کتاب سے متعلق مشہور ترقی پسند نقاد پروفیسر محمد حسن نے بھی اپنا تاثر پیش کیا ہے جسے مصنف نے کتاب کے ابتدائی صفحات میں جگہ دی ہے۔

بحیثیت مجموعی مذکورہ کتاب میں اٹھارویں صدی کے فکری نظام کی ان تمام کڑیوں کو ملاکر جو سینکڑوں سال کے سیاسی وسماجی شعور پر محیط ہیں، غزل کا ایک مکمل تاریخی تصور پیش کیا گیا ہے۔

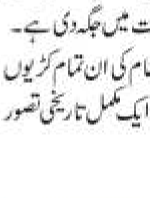

دام ہر موج میں ہے

مصنف: محمد ابوالقاسم فاروقی

صفحات: 400، قیمت: 400 روپے، سنہ اشاعت: 2021

اشاعت: مرشد پبلی کیشن، دہلی

مبصر: نایاب حسن، بٹلہ ہاؤس، جامعہ نگر، نئی دہلی

زیر نظر کتاب بزرگ عالم دین وصاحب قلم مولانا محمد ابوالقاسم فاروقی کے علمی، ادبی وتاریخی مضامین کا مجموعہ ہے۔ صاحب کتاب معروف علمی و دینی درس گاہ جامعہ سلفیہ بنارس میں درجاتِ علیا کے استاذ رہے اور یہ مضامین انھوں نے چار دہائیوں کے دوران مختلف موقعوں پر لکھے ہیں۔ مولانا کا اسلوب تحریر خوب صورت، سنجیدہ ومتین ہے اور علم ومطالعے کی فراوانی سطر سطر سے ہویدا ہے۔ کتاب کی ایک خوبی مضامین کا تنوع بھی ہے اور انھوں نے ایسے موضوعات پر لکھا ہے، جن پر لکھنے کی واقعی ضرورت تھی یا جن کی طرف عام طور پر اہلِ قلم کا ذہن نہیں جاتا، اس وجہ سے ان مضامین کے مطالعے سے نہ صرف زبان وبیان کا لطف اٹھایا جاسکتا ہے؛ بلکہ معلومات میں بھی اضافہ ہوتا ہے۔

'برصغیر میں تذکرہ نویسی کی روایت' ایک شاندار علمی وتحقیقی مضمون ہے، جس میں برصغیر میں مختلف زبانوں، خصوصاً اردو میں سوانح اور تذکرہ نویسی کے مختلف تاریخی مراحل کا جائزہ لیا گیا ہے۔ 'بنارس کا تاریخی، ثقافتی اور مذہبی تعارف' نہایت ہی خوب صورت مضمون ہے، جس میں اتر پردیش کا تاریخی شہر بنارس اپنی جملہ ثقافتی خوبیوں سمیت جلوہ گر نظر آتا ہے۔ مولانا چونکہ وہیں کے باسی اور اس کے چپے چپے سے بھرپور آگاہی رکھتے ہیں؛ اس لیے اس شہر کے علمی امتیاز، ثقافتی انفراد اور تہذیبی اوصاف وخصوصیات کو اُجالتے ہوئے بہت ہی جامع مضمون تحریر کیا ہے۔ حسب محل دلکش لفظیات وتعبیرات کے استعمال پر انھیں عبور حاصل ہے، سوانھوں نے نہایت سبک وشیریں الفاظ میں بنارس کی سیکڑوں سالہ قدیم تاریخ پر جی بھر کے گل افشانی کی ہے۔ اس کے علاوہ 'جبہ ودستار کی نیلامی'، 'بنارسی کاری گروں کا تیار کردہ غلافِ کعبہ'، 'دام ہر موج میں ہے'، 'تزکِ بابری اور اس کے چند اہم تراجم'، 'ایک تھا روہیلہ'، 'نمک حرام کی حویلی اور رنگ محل کا باسی'، 'شاہ دولہ کے چوہے'، 'ماہی اودھ کے اسرار'، 'عشق چیست؟'، 'عاشق معشوق بنارس' اور 'ولی دکنی کی شاعری' وغیرہ اپنے موضوع پر بہت عمدہ، علم ریز اور لطف انگیز مضامین ہیں۔ 'ترجمہ نگاری کے چند اصول' کے زیر عنوان لکھے گئے مضمون میں مصنف نے موجودہ علمی دنیا میں ترجمہ نگاری کی اہمیت وافادیت پر گفتگو کرتے ہوئے ترجمہ نگاری کے جو اصول وضوابط بیان کیے ہیں، وہ اس فن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے نہایت کارگر ہیں۔ مصنف کامیاب ترجمہ کے لیے مترجم کی کامل زبان (مترجم الیہ ومنہ) شناسی؛ بلکہ زبان کے مزاج ونہاد سے واقفیت کو ضروری قرار دیتے ہیں، لکھتے ہیں: ''اعلیٰ اور معیاری ترجمہ کے لیے زبان کا مسئلہ سب سے اہم ہے، ترجمہ کے معیاری اور غیر معیاری ہونے کا انحصار زبان پر ہے، زبان کسی حد تک قوم کے مشابہ ہے، جس طرح قوم کا ایک مشترکہ مزاج ہوتا ہے، پھر اس قوم کے ہر خاندان اور افراد کا اپنا الگ مزاج ہوتا ہے، اسی طرح ہر زبان کا ایک مخصوص مزاج ہوتا ہے... مترجم کے لیے ضروری ہے کہ دونوں زبانوں (جس سے وہ ترجمہ کر رہا ہے اور جس میں وہ ترجمہ کر رہا ہے) کا مزاج شناس ہو، ورنہ جو مفہوم اور اشارے الفاظ کے چلمن سے جھانک رہے ہیں، وہ ترجمہ میں غائب ہو جائیں گے، ترجمہ اس طرح ہونا چاہیے کہ اس پر اصل کا گمان گزرے، جس طرح اداکار اپنے اصل کردار کو جذب کرلیتا ہے، تو اس کی اداکاری بے مثال ہوجاتی ہے، اسی طرح مترجم کو ترجمے میں جذبۂ دروں اور اخلاص کو شامل کرنا ہوگا۔'' (ص 663)

'اردو رسم الخط: ایک تجزیاتی مطالعہ' بھی دلچسپ مضمون ہے، جس میں اردو رسم الخط کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے ہندی اور انگریزی رسم الخط کے مقابلے میں اس کی انفرادیتوں کو مع ثبوت وشواہد واضح کیا گیا ہے۔

کتاب میں کل 30 مضامین شامل ہیں اور ان میں کچھ یا تو کسی رسالے میں شائع ہوئے، کسی کتاب کا حصہ بنے یا یہ کسی علمی سمینار میں پڑھے گئے ہیں۔ ہر مضمون دل لگا کر، گہرے مطالعہ وتحقیق کے بعد لکھا گیا ہے۔ مصنف کا مطالعہ بھی یک رخا یا یک موضوعی نہیں ہے، وہ اپنے اختصاصی موضوع مذہبیات کے علاوہ تاریخ وادب کے حقائق ودقائق پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں، سوانھوں نے جن تاریخی موضوعات پر لکھا ہے ان کا

حق ادا کردیا ہے اور جن ادبی عنوانات کو موضوع تحریر بنایا ہے، انھیں بھی اپنی ذہنی زرخیزی، تخلیقی مزاج اور حسن نگارش کی بہ دولت خاصا شوخ و رنگین بنادیا ہے۔ مرشد پبلی کیشن دہلی نے کتاب کی نظر افروز و دل آگیں طباعت کا اہتمام کیا ہے۔ امید ہے کہ مطالعہ و کتب بینی کے شائقین اس شاندار کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے۔

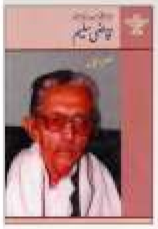

قاضی سلیم

مصنف: غضنفر اقبال

صفحات: 76، قیمت: 50، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: ساہتیہ اکادمی، دہلی

مبصر: محمد اکرام، 89/6A، گلی نمبر 1، غفار منزل، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

حکومت ہند کے باوقار ادبی ادارہ ساہتیہ اکادمی کے 'ہندوستانی ادب کا معمار' سیریز کے تحت مشاہیر ادبی شخصیات کے بہت سے مونوگراف شائع ہوئے ہیں۔ اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے قاضی سلیم پر لکھا گیا یہ مونوگراف ہے جس کے مصنف ڈاکٹر غضنفر اقبال ہیں۔

قاضی سلیم کا شمار جدید نظم کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ مشکل پسندی اور نت نئے تجربات ان کی نظم کا خاصہ ہیں جن کی بنا پر قارئین کو ان کی نظموں کی تفہیم میں دشواریاں پیش آتی ہیں۔ قاضی سلیم کی مشکل پسندی اور معنی کی پیچیدگی کی وجہ سے ان کے معاصرین خلیل الرحمن اعظمی، وحید اختر، بلراج کومل عمیق حنفی وغیرہ کے مقابلے ان پر ذرا کم توجہ دی گئی۔

قاضی سلیم کی نظموں کے موضوعات سماج اور افراد کی زندگی سے وابستہ مسائل ہیں لیکن انھوں نے ان مسائل کو مختلف زاویوں اور جہات سے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے، اسی لیے ان کی نظموں میں بہت سے موضوعات ملتے ہیں، جیسے: تجسس و اضطراب، حزنیہ کیفیت، بے ضمیری اور بے حسی، یاس و ناامید، علامت، امید و آرزو، خود کلامی و صنعت تلمیح، تہذیب آثار کی گمشدگی، اقدار کے ابتذال کا نوحہ، تصوف، زندگی کا احتجاج، شعور و آگاہی، فکر و فلسفہ، سیاست و سماجی احوال، موت و غم، احساس تنہائی وغیرہ وغیرہ۔

قاضی سلیم کی نظموں کے حوالے سے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ان کے یہاں موضوعات کے علاوہ اور بھی بہت سی سطحوں پر تنوع اور تکثیریت ہے۔ اس تعلق سے پروفیسر انتخاب حمید نے اپنے مضمون 'قاضی سلیم: جدید نظم کا منفرد کردار' میں اہم اشارے کیے ہیں۔ ان کے مطابق ان کی نظموں میں:

"کہیں طبعیات و مابعد الطبعیات پر مکالمہ ہے تو کہیں متصوفانہ تکلم۔ نظم بیک وقت کئی سمتوں میں رواں دواں نظر آتی ہے۔ تکثیریت اس کا وصف خاص ہے۔ اس کا شعری لحن، منفرد دکشن حسن و معنی آفرینی کی لائق تحسین مثال ہے۔"

زیر نظر مونوگراف دو ابواب میں منقسم ہے۔ پہلا باب 'قاضی سلیم: حیات نامہ' ہے، جس میں قاضی سلیم کے خاندانی پس منظر، پیدائش اور گھریلو ماحول، والدین بھائی اور بہن، تعلیم و تربیت، ذوق و شوق، ادبی زندگی، اساتذہ، عقائد، پسند اور ناپسند، پیشہ، ازدواجی زندگی، احباب، ادبی صحافت، سماجی اور سیاسی خدمات، مطبوعات، اعزازات، قدرشناسی، شخصیت، زندگی کی کھٹی میٹھی یادیں، بیماری اور وفات جیسے ذیلی عنوانات کے ذریعے قاضی سلیم کی زندگی کے احوال و کوائف سے قارئین کو روشناس کرانے کی کوشش کی گئی ہے۔

'خاندانی پس منظر' سے یہ پتہ چلتا ہے کہ قاضی سلیم کے دادا قاضی شمس الدین اپنے نام کے ساتھ قاضی کا لاحقہ لگاتے تھے کیونکہ انھیں قضاء کا عہدہ ملا ہوا تھا۔ آپ کے والد شمس الدین چار بھائیوں میں سب سے بڑے تھے اور محکمۂ پولس میں سرکل انسپکٹر تھے۔ قاضی سلیم وکالت کے امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد فوجداری کے وکیل بھی بنے۔ قاضی سلیم اپنے والد سے بہت ڈرتے تھے جس کی بنا پر انھیں 'سرکار' کہتے تھے اسی لیے انھوں نے اپنے والد کو طویل نظم 'برأت' لکھ کر بہترین خراج پیش کیا ہے۔

قاضی سلیم کے 'پیشہ' کے تعلق سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تقریباً 7 برس تک اپنے والد کے ساتھ وکالت کی، بعد میں ان کے خسر محترم کریم احمد تارا نے اپنی کمپنی میں جنرل منیجر بنادیا لیکن یہ عہدہ بھی انھیں راس نہیں آیا اور آپ نے تاج آفسیٹ کے نام سے ایک پریس قائم کیا، یہاں سے بھی بددل ہوئے تو سیاست سے وابستہ ہوگئے جہاں ممبر آف پارلیمنٹ کی حیثیت سے انھوں نے بہت اہم خدمات انجام دیں۔

دوسرا باب 'قاضی سلیم: ادبی شناخت' ہے جس میں بہ حیثیت نظم نگار، مثنوی نگار، ہائیکو نگار، رباعی نگار، نثر نگار، مکتوب نگار اور ترجمہ نگار قاضی سلیم پر گفتگو کی گئی ہے۔ نظم نگار کی حیثیت سے قاضی سلیم کے انفراد اور اختصاص کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے اور ان کے شعری مجموعے: 'نجات سے پہلے'، 'رستگاری' اور 'کچھو کے ضمیر کے' کی کچھ چنندہ نظموں مثلاً انتظار، ایک کتبہ، وقت، وائرس، ہم وقت کے صحرا میں، اس جہنم میں، انتساب، ٹورسٹ، پرواز، وعید، مکتی، نوحہ، عمر باقی ہے، ایک گیت بانو کے لیے، ایک نظم، بے ضمیری، کچھوے کے ضمیر کے وغیرہ کا مختصراً تجزیہ کیا گیا ہے۔

'نجات سے پہلے' کی نظموں کے امتیازات کے حوالے سے غضنفر اقبال لکھتے ہیں:

"...اس مجموعے میں شاعر نے اس قدر کڑا انتخاب کیا تھا کہ پوری کتاب شاہکار نظموں کا درجہ رکھتی ہے... کتاب کا سرورق عالمی شہرت یافتہ مقبول مصور فدا حسین نے بنایا تھا۔ 'نجات سے پہلے' کی نظمیں گہرے تخلیقی شعور کا پتا دیتی ہیں...(ہندوستانی ادب کے معمار: قاضی سلیم، ص 26)

قاضی سلیم کی شناخت بہ حیثیت 'مثنوی نگار' بھی ہے۔ اس عنوان کے تحت ڈاکٹر غضنفر اقبال قاضی سلیم کی دو مثنویوں 'مثنوی باغبان و گل فروش' اور 'مثنوی زہر خند' کی خصوصیات اور ان کے مختصر تجزیے پیش کیے ہیں۔

'ہائیکو' ایک جاپانی صنف ہے لیکن قاضی سلیم نے اس میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ صاحب کتاب نے 'ہائیکو نگار' کی حیثیت سے آپ کا تعارف اور کچھ ہائیکو کے تجزیے پیش کیے ہیں۔

قاضی سلیم نے رباعیاں بھی لکھیں جو بہت مشہور ہوئیں۔ یہاں کے کچھ رسائل میں 'بیماریوں کے کھنور سے' سریز کے تحت آپ کی رباعیاں شائع ہوتی رہی ہیں۔ ڈاکٹر غضنفر اقبال نے قاضی سلیم بہ حیثیت 'رباعی نگار' میں ان کی کچھ رباعیوں کا عمدہ تجزیہ کیا ہے۔

قاضی سلیم بہ حیثیت 'نثر نگار' میں آپ کے مضامین 'نئی شاعری'، 'شعری ترجمے کے آداب' کا ذکر ہے جس میں قاضی سلیم کے مضامین کی اہمیت، افادیت اور ان کے اختصاص کے ساتھ ساتھ کچھ مشاہیر کی آرا بھی ہیں۔

قاضی سلیم بہ حیثیت 'مکتوب نگار' میں آپ کے ان تین خطوط کا ذکر کیا گیا ہے جو ماہنامہ 'شب خون' الہ آباد میں 'نقطے اور روشنیاں' کے عنوان سے شائع ہوئے تھے۔ یہ خطوط قاضی سلیم نے 'شب خون' کے مدیر شمس الرحمٰن فاروقی کو لکھے تھے۔ شاذ تمکنت کی رحلت پر ایک 'تعزیت نامہ' بھی تحریر کیا تھا جس کے مخاطب پروفیسر انور معظم، پروفیسر مغنی تبسم اور ڈاکٹر مجتبیٰ حسین ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ مصنفین کو ان کی کتابوں کی موصولگی پر لکھے ہوئے خطوط کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔

'ترجمہ نگاری' کے ذیل میں قاضی سلیم کے مشہور مضمون 'شعری ترجمے کے آداب' اور آپ کی ایک کتاب 'ریگزاروں کے گیت' کا بھی ذکر ہے۔ قاضی سلیم نے عربی شاعر غازی القصیبی کی نظموں کے مجموعہ 'From the orient and The Desert' کا اردو ترجمہ کیا تھا۔

ڈاکٹر غضنفر اقبال لائق ستائش ہیں کہ انھوں نے قاضی سلیم جیسی جید اور متنوع شخصیت کی ادبی خدمات کے حوالے سے مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ قاضی سلیم کی شخصیت اور فن کی تفہیم میں اس کتاب سے قارئین کو بہت مدد ملے گی۔

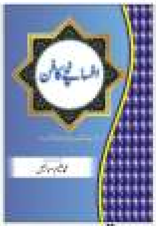

افسانچے کا فن

مرتب: محمد علیم اسماعیل
صفحات: 168، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی
مبصر: سید اسماعیل گوہر، ریسرچ اسکالر، سنت گاڈگے بابا یونیورسٹی، امراوتی، مہاراشٹر

اُردو کے افسانوی ادب کا سفر بہت طویل ہے، جو داستان سے شروع ہو کر ناول، ناولٹ، افسانہ، مختصر افسانہ، منی کہانی سے ہوتا ہوا آج افسانچہ تک پہنچ گیا ہے۔ ہزاروں صفحات پر پھیلی ہوئی داستان اب چند سطور تک سمٹ گئی ہے۔ افسانچہ کہانی گوئی یا قصہ نگاری کی ایک جدید ترین شکل ہے۔ جس طرح ناول کے بطن سے ناولٹ نکلا اسی طرح افسانہ کے بطن سے افسانچہ کا جنم ہوا۔ منٹو کو افسانچہ کا باوا آدم کہا جاتا ہے۔ شروع شروع میں افسانچہ کو خاطر خواہ پذیرائی نہیں ملی مگر آزادی کے بعد افسانچہ کی صنف دھیرے دھیرے ترقی کرتی گئی۔ منٹو کے بعد جوگندر پال، ڈاکٹر ایم اے حق، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، رتن سنگھ اور رونق جمال نے افسانچہ کی صنف کو بلندی عطا کی۔

زیر تبصرہ کتاب 'افسانچے کا فن' محمد علیم اسماعیل کی مرتب کردہ ہے۔ محمد علیم اسماعیل نسل نو کے ایک ابھرتے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'رنجش' اور 'الجھن' اُردو حلقے میں پذیرائی حاصل کر چکے ہیں۔

کتاب کا انتساب مشہور و معروف افسانچہ نگار ڈاکٹر ایم اے حق کے نام ہے۔ کتاب میں مرتب کا مقدمہ اور ڈاکٹر ایم اے حق، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، ڈاکٹر عظیم راہی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، سرور غزالی (جرمنی)، رونق جمال، محمد فاروق کے مضامین شامل ہیں۔ سبھی مضامین پر مغز اور جامع ہیں جو کتاب کی افادیت پر دال ہیں۔

'افسانچے کا فن اور اقتباسات' عنوان کے تحت جوگندر پال، ڈاکٹر رضوان احمد، عبداللہ جاوید (کینیڈا)، دیپک بدکی، ڈاکٹر کیول دھیر، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، امجد مرزا امجد (لندن)، رؤف خیر، عارف نقوی (جرمنی)، بانو ارشد (یو کے)، ڈاکٹر امام اعظم، احمد صغیر، خورشید اقبال، مراق مرزا اور احسان سہگل (ہالینڈ)، کے مضامین سے ایسے اقتباسات منتخب کیے گئے ہیں جو افسانچے کے فن پر گفتگو کرتے ہیں۔ یہ اقتباسات پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی کی مرتب کردہ کتاب 'ڈاکٹر ایم اے حق اور افسانچہ نگاری کا فن' سے ماخوذ ہیں۔

'افسانچے کا فن اور تاثرات' والے حصے میں افتخار امام صدیقی، نذیر فتح پوری، عارف خورشید، پروفیسر حمید سہروردی، ارشد عبد الحمید، محمد علی صدیقی، جاوید نہال حشمی، ریحان کوثر اور سید اسماعیل گوہر کے تاثرات شامل ہیں۔ ہند و پاک کے تقریباً 58 افسانچہ نگاروں کے افسانچے بطور نمونہ دیے گئے ہیں۔

یہ کتاب افسانچے کے فن پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ یہ کتاب نئے افسانچہ نگاروں کے لیے کسی انمول تحفے سے کم نہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ کتاب ان افسانچہ نگاروں کے لیے بھی اہمیت کی حامل ہے جو فن کی باریکیوں کو جانے بغیر افسانچے قلمبند کر رہے ہیں۔

محمد علیم اسماعیل کا یہ ایک اہم کام ہے جو ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ افسانچہ کیا ہوتا ہے؟ افسانچہ کس طرح لکھا جاتا ہے؟ اس میں کیا ہونا چاہیے اور کیا نہیں؟ اگر ان سوالات کے اطمینان بخش جوابات کسی کو جاننا ہے تو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کریں۔

محمد بشیر مالیر کوٹلوی فرماتے ہیں: ''اگر آپ کو افسانچوں سے شغف ہے اور آپ خود افسانچہ تخلیق کرتے ہیں تو علیم اسماعیل کی تازہ شائع شدہ کتاب 'افسانچے کا فن' کا گہرائی سے مطالعہ کریں۔ یہ ایک خوبصورت کتاب ہی نہیں بلکہ افسانچے کی صنف کے حوالے سے ایک اہم دستاویز بھی ہے۔ نئے لکھنے والوں کے لیے ایک سبق کی حیثیت رکھتی ہے۔''

ڈاکٹر عظیم راہی اس کتاب کے تعلق سے فرماتے ہیں: ''محمد علیم اسماعیل کی مرتب کردہ تازہ کتاب 'افسانچے کا فن' افسانچے کے فن پر اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے جو متوجہ کرتی ہے۔ اس اعتبار سے یہ کتاب کافی اہمیت کی حامل ہے۔''

فکشن

جگ ہنسائی

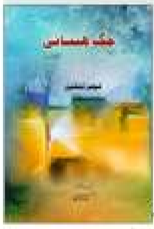

مصنف: قیصر تمکین، مرتب: احسن ایوبی
صفحات: 164، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2021
ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی
مبصر: ڈاکٹر فیضان حسن ضیائی، محلہ بارہ دری، سہسرام (بہار)

نئی نسل کے لکھنے والوں میں احسن ایوبی اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ موصوف ہندی فکشن سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں وقتاً فوقتاً معاصر ہندی افسانہ نگاروں کی تخلیقات کا اردو ترجمہ بھی کرتے رہے ہیں۔ قیصر تمکین ان کے مطالعے کا اہم نتیجہ ثابت ہوئے ہیں۔ جس کا ثبوت 'جگ ہنسائی' اور 'گومتی سے ٹیمز تک' کی شکل میں ہمارے سامنے ہے۔ 'جگ ہنسائی' قیصر تمکین کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو 1957 میں بار اول منظر عام پر آیا تھا۔ لیکن افسوس کہ وقت اور زمانے کی گرد نے اسے قارئین کی نظروں سے اوجھل کر دیا۔ نتیجتاً یہ کتاب ہندوستان کی نمائندہ لائبریریوں میں بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ احسن ایوبی نے بڑی محنت و مشقت اور عرق ریزی سے اس کتاب کے اصل نسخے تک رسائی حاصل کی ہے اور اسے نئے رنگ و آہنگ اور وقیع تقدیم کے ساتھ قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔

'جگ ہنسائی' پندرہ افسانوں پر مشتمل ہے۔ اس مجموعے کی کہانیوں میں زندگی کی کڑوی سچائی، معاشرے اور سماج میں پھیلی ہوئی بدعنوانیوں اور دکھتی رگوں پر انگلی رکھنے کا عمل نظر آتا ہے۔ خزاں کا پھول، بڑی آن والے، رشتے کی تلاش، جگ ہنسائی، ایک لڑکی ایک سماج اور 'لٹ چکے کارواں' میں آپ ان کیفیات کو محسوس کر سکتے ہیں۔ اس مجموعے کا پہلا افسانہ 'خزاں کا پھول' ہے جس میں رومانی فضا کے ساتھ ساتھ سیلاب زدہ علاقے کی ایک حقیقی تصویر بھی ہے جس سے ایک مخصوص طبقہ متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس خوف زدہ ماحول میں سرکاری بابوؤں کی لاپرواہی اور بے توجہی کی بھی پردہ کشائی کی گئی ہے۔ لیکن بظاہر رومانیت کی فضا حاوی نظر آتی ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار 'ندیم' زمانہ طالب علمی میں جس لڑکی کے لیے جذبہ محبت رکھتا ہے وہ بس دل کے نہاں خانے میں ایک وقتی پھول بن کر رہ جاتی ہے۔ لیکن وقت جب انھیں دوبارہ روبرو کرتا ہے تو ندیم کے ذہن و دل میں ابھرنے والی وہ لا علاج دیوانگی کا احساس اس کے ویران دل میں بہار لے آتا ہے۔ بقول افسانہ نگار:

''خزاں کا پھول... آہستگی سے ندیم نے کہا اور سوچنے لگا کہ آج پورے تین سال بعد اس نے بزمو کو دیکھا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی دلآویز مسکراہٹ اب بھی کھیل رہی تھی۔ اس وقت اس کی گہری اور سیاہ آنکھیں بند تھیں۔ وہ بے ترتیبی اور پریشانی کے عالم میں ایک ہلکی سرخ شال اوڑھے آرام سے کرسی پر سو رہی تھی... آج بزمو اس کے سامنے محو خواب تھی۔'' (جگ ہنسائی، قیصر تمکین: مرتب احسن ایوبی۔ ایڈیشن 2021، ص 28)

ان دونوں کی ملاقات اس وقت ہوتی ہے جب ندیم سیلابی خطرات سے متاثر بستی میں بحیثیت رپورٹر بھیجا جاتا ہے۔ جہاں بزموا اور اس کا شوہر بھی محکمۂ آب کاری کی جانب سے تعینات رہتے ہیں۔ افسانے کا اختتام یوں ہے کہ ندیم سیلاب کی خوفزدہ لہروں سے بستی اور خاص کر اپنی محبت کو زندہ رکھنا چاہتا ہے۔ اس لیے وہ بہادری کا مظاہرہ کرتا ہے لیکن طوفانی تھپیڑے اسے بہالے جاتے ہیں۔ افسانہ نگار نے ندیم کی موت سے ایک خاص قسم کا تاثر پیدا کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

'ایک لڑکی ایک سماج' میں عورتوں کے ساتھ مردوں کی بے مروتی اور اس کی نفسیاتی کشمکش کا کامیاب اظہار ہے۔ افسانے میں ظہیرہ کا کردار حالات کی ستم ظریفی کا شکار ہے۔ وہ پڑھ لکھ کر ایک کامیاب زندگی کا خواب دیکھتی ہے لیکن اس راہ میں بے شمار نشیب و فراز اسے کمزور بنادیتے ہیں اور جب وہ کمیونسٹ لڑکی پدما کے ساتھ کالج میں سسٹم کے خلاف آواز اٹھاتی ہے تو اسے فائنل امتحان میں پرموٹ کر دیا جاتا ہے اور اس کے وظیفے پر بھی پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ اپنے گھر کی خستہ حالی اور بوڑھی ماں کی بلکتی آنکھیں اسے حالات سے سمجھوتہ کرنے پر مجبور کر دیتی ہیں اور اس پیچ دار گتھی کو سلجھانے کی خاطر وہ منیجر کے یہاں جانے کا ارادہ کرتی ہے۔ جہاں منیجر جبراً اسے اپنی ہوس کی آنچ میں جھونک دیتا ہے۔ لیکن اس کے اندر انتقامی شعلے بھڑک اٹھتے ہیں اور وہ موقع دیکھ کر منیجر کا خون کر بیٹھتی ہے۔ بے ہوشی اور بے کیفی کے عالم میں نکلتے ہوئے اس کی ملاقات مہیش سے ہوتی ہے۔ مہیش اس کے نڈھال جسم کی کیفیت دیکھ کر اس حادثے سے آشنا ہو جاتا ہے اور کسی طرح اسے گھر پہنچاتا ہے لیکن اپنے اندر کی حیوانیت پر وہ قابو نہیں رکھ پاتا اور احساس کمتری کا شکار ہو جاتا ہے۔

قیصر تمکین نے اس کردار کے ذریعے سماج کی بے رحم سچائی کو اجاگر کیا ہے اور مرد معاشرے کی محدود فکر پر طنز بھی۔ سماج کی ہوسناکی اور ایک لڑکی کی بے بسی کی یہ کہانی سماج کو آئینہ دکھاتی ہے۔ ظہیرہ کا کردار آبرو لٹنے کے باوجود قاری کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہے۔

قیصر تمکین کے افسانوی موضوعات آج کے مسائل و معاملات کی عکاسی کرتے ہیں۔ مجموعے کی دیگر کہانیوں میں مڈل کلاس کے احساس کمتری و محرومی، سماجی ناانصافی، محبت کی ناکامی، انسانی رشتوں میں اعتبار و بے اعتباری کی کشمکش، تقسیم ہند کے بعد پیدا شدہ مسائل کی عکاسی کے ساتھ ازدواجی زندگی کے مسائل پر یہ ابتدائی دور کی کہانیاں قارئین کو متوجہ کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں۔ موضوعات کی پیش کش میں قیصر تمکین نے سیدھے سادے پلاٹ پر توجہ مرکوز رکھی ہے۔ واقعات میں تسلسل کو قائم رکھتے ہوئے حیات انسانی کے مختلف مناظر کو سادے بیانیہ انداز میں پیش کیا ہے۔

کرداروں کی پیش کش میں ترقی پسندی کا جو Pattern تھا مثلاً، افسانوں میں کردار کا باقاعدہ تعارف، اس کا نام، خاندانی پس منظر، اس کا ماحول، اس کی شکل و صورت اور اس کی عادت و فطرت کی تفصیل بیان کی جاتی تھی۔ گویا کردار قاری کے سامنے کھل کر سامنے آتے تھے۔ قیصر تمکین کے افسانوں میں بھی کردار سازی کا یہ عمل اپنے عہد کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے۔

قیصر تمکین نے یہ افسانے اپنی ٹین ایج میں تخلیق کیے تھے۔ لیکن زبان و بیان، فنی ٹریٹمنٹ، جملوں کی ساخت اور مافی الضمیر کی پیش کش میں کہیں ان کی عمر کا کچا پن ظاہر نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنے خیالات اور جذبے کے اظہار کے لیے جو راہ اختیار کی تھی اس راہ میں قاری کو کسی قسم کی الجھن بھی محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یہ بات بھی اہم معلوم ہوتی ہے کہ یہ ابتدائی دور کے افسانے ان کے بعد کے افسانوں کے اسلوبیاتی پس منظر میں ذرا پھیکے پن کا احساس دلاتے ہیں۔

واضح ہو کہ قیصر تمکین نے اپنا اولین افسانہ 1949 میں لکھا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب افسانوی دنیا میں منٹو، کرشن چندر، بیدی، عصمت، اوپیندر ناتھ اشک، احمد ندیم قاسمی، علی عباس حسینی وغیرہ جیسے باشعور افسانہ نگاروں نے اپنی تخلیقات کے ذریعے آسمان ادب پر آفتاب و ماہتاب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔ اس دور میں ریفیوجی لائف، تقسیم ہند، جنسی بے راہ روی، سیاسی استحصال پسندی، آمرانہ ماحول و معاشرت کی فرسودگی وغیرہ کو عام طور پر افسانوں کا موضوع بنایا جاتا تھا اور ایک خاص فلسفیانہ نظریہ ادب و زندگی کے تحت مسائل کو اجتماعی تناظر میں پیش کرنے کا رجحان عام تھا۔ ساتھ ہی منصوبہ بند طریقے سے کمزور پسماندہ اور استحصال کا شکار ہونے والے طبقے کی حمایت کو بھی ایک لازمۂ فن کی حیثیت دی جاتی تھی جس کا نتیجہ کبھی کبھی سنسنی خیزی کی صورت اختیار کر لیتا تھا۔ قیصر تمکین نے ایسے ہی ماحول میں اپنی فنکاری کا آغاز کیا۔ ظاہر ہے فکر و بیان کی اس یکسانیت سے قیصر تمکین کا ذہن بھی بیزار ہوا ہوگا۔ لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اردو افسانے کو فکر و فن کے اکتا دینے والے ماحول سے باہر نکالنے کے لیے قیصر تمکین نے اپنے تخلیقی ذہن کو بے حد فعال و متحرک رکھا جس کے طفیل اردو کے افسانوی ادب میں ایسے افسانوں کا اضافہ ہوا، جن میں فکر و اظہار کی انوکھی دنیا آباد ہے۔ قیصر تمکین کے افسانوں کا یہ سرسری مطالعہ باور کراتا ہے کہ انھوں نے اپنا جو سرمایۂ فن ہمیں سونپا ہے وہ ناقابل فراموش ادبی اہمیت کا حامل ہے۔

احتیاط

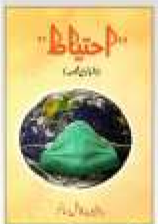

مصنف: راجیو پرکاش ساحر

صفحات: 120، قیمت: 150، سنہ اشاعت: 2020

مطبع: روشان پرنٹرس، دہلی۔6

مبصر: ڈاکٹر حمیرا حیات، 1033، حویلی بختاور خاں، بازار ضیا محل، دہلی6

آج کی مصروف ترین اور بھاگم بھاگ والی زندگی میں اگر کسی صنف کو بہت زیادہ اعتبار حاصل ہے تو وہ ہے افسانہ، کیونکہ افسانہ ہی وہ صنف ہے جو کم سے کم وقت میں انسان کو اس کی حقیقی زندگی سے روشناس کراتا ہے اور اس کے آئینہ میں اصل چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ اردو افسانے کی ایک مکمل تاریخ ہے۔ اور ہر دور کے افسانہ نگاروں نے اپنے افسانوں میں اپنے اعتبار سے سماج کو اسی آئینہ میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اور تا حال یہ سلسلہ جاری ہے۔

'احتیاط' بھی اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ مصنف راجیو پرکاش ساحر کا بیس افسانوں کا یہ مختصر سا مجموعہ مختلف موضوعات پر مشتمل ہے۔ مصنف کے دیگر تین افسانوی مجموعے 'ایک بھیگے لمحے کی لمبی سڑک'، 'ایک جھروکہ افسانوں سے'، 'پیاسی سیپلیں'، اور ایک شعری مجموعہ 'تعارف' منظر عام پر آچکا ہے۔ کتاب میں موجود آخری سات افسانے کتاب کے موضوع سے مناسبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ ان افسانوں میں حالات حاضرہ کے ایک اہم موضوع پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جس سے پوری دنیا متاثر ہوئی۔ کورونا نامی ایک وبا، وائرس، جس نے انسانی زندگی کو ہلا کر رکھ دیا۔ ان افسانوں میں اسی وبا سے متاثر زندگی کی منظر کشی کی گئی ہے کہ کس طرح انسان اس وبا سے لڑتا ہے، ہمت، حوصلہ کے ساتھ اس وبا سے جیت جاتا ہے، تو کبھی ہزار کوششوں کے بعد بھی اس جنگ میں ہار جاتا ہے۔ ان افسانوں میں تحلیل ہوتا سفر، اب تو کچھ کرونا، بے نیاز، ہیلپ لائن، تم اپنی کرنی کر گزرو، عطر فروش اور احتیاط قابل ذکر ہیں۔

علاوہ ازیں افسانے ضیا، مردانی، ادا، حوادث غائبانہ، مہابھارت، مجروح سماعت، میں نسوانی استحصال کی منظر کشی کی گئی ہے۔ مصنف نے نہ صرف عورت کو مجبور، لاچار، دیوی کی صورت پیش کیا ہے بلکہ تصویر کا دوسرا رخ بھی یعنی عورت کی ہمت، حوصلہ، کامیابی، خود اعتمادی کا پہلو بھی بخوبی بیان کیا ہے۔ جہاں ایک طرف عورت مرد کے جبر و ستم کو خاموشی کی چادر میں سمٹی سہی ہوئی اپنی بے معنی زندگی کے آگے ہار جاتی ہے وہیں

دوسری طرف زندگی کے نشیب وفراز کو طے کرتے ہوئے ظلم وستم کے خلاف آواز اٹھاتے ہوئے، سماج کی بے ہودہ رسم ورواج کو نکارتے ہوئے اپنی زندگی کے اصول خود طے کر کے سماج میں اپنی الگ پہچان بنانے میں اور حالات کو بہتر بنانے میں کامیاب دکھائی دیتی ہے۔ مثلاً 'مردانی' اور 'ادا' ایسے ہی افسانے ہیں جن میں عورت زندگی کی سبھی پریشانیوں کا ڈٹ کر مقابلہ کرتی ہے۔

اس کے علاوہ مصنف نے 'عکس' افسانے میں ایسے نوجوانوں کی زندگی کا حال بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو نوکری کی تلاش میں اپنے گاؤں سے نکل کر شہر کی طرف کوچ کرتے ہیں مگر شہر کی چکا چوند میں اپنا وجود کہیں کھودیتے ہیں اور رہ جاتا ہے تو ان کا عکس جو ادھر ادھر اپنے وجود کی تلاش میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر افسانے جیسے کھوپڑی چور چکنا چور، فلسفہ، بیگانی شادی میں عبداللہ دیوانہ وغیرہ بھی انسانی زندگی کا المیہ بیان کرتے ہیں۔ 'سرسوتی' بھی ایک اہم افسانہ ہے۔ جس کا موضوع انسانیت کی خدمت ہے۔ اس افسانے میں مذہب، ذات، نسل ورنگ سے اوپر اٹھ کر صرف اور صرف انسان دوستی، بھائی چارہ، صلہ رحمی کی تلقین کی گئی ہے۔

دراصل کوئی بھی فنکار اپنے آس پاس ہونے والے واقعات وحادثات کو دیکھتا ہے اور اسے اپنی تخیل آمیزی سے دلچسپ بنا کر قاری کے سامنے پیش کرتا ہے یہ افسانے قاری کو اپیل کرتے ہیں۔ بعض وقتی دلچسپی کی غرض سے اس کا مطالعہ کرتے ہیں۔ بعض وقت گزاری کے طور پر، اور بعض مطالعے کی غرض سے مطالعہ کرتے ہیں۔ جن میں سے کچھ ہی اس کی داخلی سطح کے نئے دروں تک رسائی حاصل کر پاتے ہیں اور اس کی داخلی پرتیں کھولنے میں کامیاب ہو پاتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کچھ ایسی ہی کہانیوں کا مجموعہ ہے جو حقیقتاً قاری کے ذہن ودل کو متاثر کرتا ہے۔ کتاب کے سبھی افسانے کامیاب ہیں۔ ان افسانوں کا اسلوب عمدہ ہے۔ مصنف کو اردو زبان سے گہری واقفیت ہے۔ زبان وبیان سہل اور سادہ ہے۔ کہیں کہیں دو سے زائد پیراگراف میں ضرورت سے زیادہ قدرت کی منظر کشی بوریت کا سبب بھی بنتی ہے۔ باوجود اس کے قاری ان افسانوں کے انداز بیان سے متاثر ہوئے بنا نہیں رہ پاتا۔

مختصر یہ کہ زیر تبصرہ کتاب اردو ادب سے محبت کرنے والوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔ امید ہے کہ افسانہ نگار آئندہ اپنی تخلیقات میں مزید فکری تعمق سے کام لیں گے تاکہ افسانے حقیقت سے اور زیادہ قریب نظر آئیں۔ کتاب مختصر ہے مگر مختلف موضوعات کے لحاظ سے اہم اور مفید ہے۔ بلاشبہ مصنف اس بہترین کوشش پر ڈھیروں مبارکباد کے مستحق ہیں۔

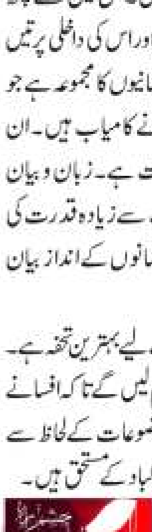

چشم راہ (افسانے اور طنز ومزاح کے مضامین)

مصنف: وجاہت قریشی

صفحات: 190، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت:

ناشر: کاروان ادب گروپ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)

مبصر: ڈاکٹر مرزا محمد خضر، 11، ماڈل کالونی اپوزٹ، حمایت باغ، اورنگ آباد، مہاراشٹر

وجاہت قریشی کے دل کو چھو لینے والے معاشرتی نفسیاتی افسانوں اور شگفتہ مضامین کا پیکر بعنوان 'چشم راہ' اردو ادب میں دلچسپ وفکر انگیز اضافہ ہے۔ ہر افسانہ اور انشائیہ قاری کو اختتام تک باندھے رکھتے ہیں۔

'چشم راہ' کے افسانے اور شگفتہ مضامین ازدواجی زندگی اور شب و روز کے معاشرتی مسائل اور ان کے خوبصورت حل کا آئینہ ہیں۔ ادب کے ابتدائی دور، رومانی ادب اور ترقی پسند دور کی ہیئت، انداز بیان، تکنیک، پلاٹ، کردار نگاری، تخیل اور مکالمہ نگاری کے اسلوب دل ودماغ کو مسخر کر لیتے ہیں اور قاری ان کا حصہ بن جاتا ہے۔ افسانے کی تعمیر وتشکیل اور تسلسل کے تمام محاسن بدرجۂ اتم موجود ہیں۔

ان کے افسانوں میں جرمنی کے وجودیت Existentialism کے علمبردار کیکی گارڈ، نطشے اور فرانس کے مفکر ژاں پال سارتر کی انسانی وجود کی شخصی آرزو و آزادی نظر آتی ہے لیکن شوپن ہاور نے نطشے کی On freedom of will پر سخت تنقید ہے کہ اس سے کئی مسائل پیدا ہوتے ہیں۔

اسی طرح اٹلی کے مفکر فرائڈ کا بھی اثر دکھائی دیتا ہے۔ جرمنی کے جارج ایچ ایف ہیگل کی ڈائلکٹکل تھیوری (جدلیات) تقریباً ہر افسانے کے اختتام میں نظر آتی ہے۔ یعنی خوشگوار اختتام جیسے چشم راہ، گھر واپسی، کائنات میں رنگ، الٹی ہو گئیں سب تدبیریں، وجود کی شائستگی، مسکراتے گلاب، رقصِ بہار وغیرہ۔

وجاہت اپنے ابتدائی دور سے ہی ترقی پسند دور کی تخلیقات سے بہت متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ خود اپنی تخلیقات کے تعلق سے اظہار خیال کرتے ہیں: ''میرا مزاج ابتدائی دور سے روایتی افسانوں کی جانب گامزن رہا۔ اسی انداز کے افسانے اپنے ذوق کی تسکین کے لیے لکھتا رہا۔ میرے بیشتر افسانے اور مضامین روزمرہ کی حالت، میرے تجربات، مشاہدات اور ماحول کے دلچسپ واقعات پر مبنی ہیں۔ اسی لیے ہر افسانہ اور انشائیہ ہمارے قریب، گردوپیش میں محسوس ہوتا ہے۔''

ڈاکٹر نورالامین اس کتاب کے پیش لفظ میں اپنے تاثرات اس طرح بیان کرتے ہیں:

''وجاہت قریشی کا پہلا افسانوی مجموعہ 'چشم راہ' ادبی اعتبار سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ وہ اس لیے کہ موضوعات اپنے قاری سے بہت جلد Relate کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کہانی جب محسوسات کے نقطۂ عروج پر پہنچ جاتی ہے تو وہ قاری کو اپنے اندر جذب کر لیتی ہے۔ 'چشم راہ' میں شامل تمام افسانے اسلوب اور تکنیک کے اعتبار سے جہاں عام قاری کی گرفت میں ہیں وہیں موضوع کے اعتبار سے بھی مصنوعی سماج کے بہت قریب ہیں۔''

وجاہت صاحب کے تقریباً تمام افسانے الجھتے مسائل کو پیار ومحبت سے جوڑ دیتے ہیں۔ یہ نئی نسل کے لیے ایک مفید ومثبت پیغام ہے۔ الٹی ہو گئی سب تدبیریں، گھر واپسی، یہ کشتیاں آخر سمندر کی ہیں، خوشبو کی واپسی، بجھی ہوئی آگ سے اٹھتا دھواں وغیرہ میں انا اور ضد کے مضر اثرات بہت خوبی سے ذہن پر بوجھ نہ بنتے ہوئے خوشنما فرحاں انداز میں اختتام پذیر ہوتے ہیں۔

طنز ومزاح کے سہارے ہماری سوچ وفکر، انداز رہن سہن اور عادت واطوار پر نیش زنی اس طرح کی گئی ہے کہ لطف بھی آجائے اور بات بھی بن جائے۔ تمام انشائیے حقیقت بیان کرتے ہوئے ہماری کمزوریوں اور اچھائیوں کو مزاح کے انداز میں پیش کرنے میں بہت کامیاب رہے ہیں۔ ''ہم نے توتا (طوطا) پالا'' اس کے سہارے وجاہت صاحب نے بہت خوبی سے شوہر وبیوی کے انداز فکر پر چوٹ کی ہے۔ اسی طرح 'کوئی ہمیں رلائے تو'، 'جلا دل کا آشیانہ'، 'چھٹی میں نے خوب منائی'، اس کے برخلاف 'بڑا لطف تھا جب......'، 'ایک پر ایک فری' اور 'لو آج ہم بھی صاحب کار ہو گئے' تمام مضامین معاشرے اور فرد کی ذہنیت اور اس کے ہر انداز کو لطیف پیرایے میں پیش کرتے ہیں۔

وجاہت صاحب نے قاری کو جدیدیت اور مابعد جدیدیت میں نہیں الجھایا ہے بلکہ افسانے اور انشائیہ کے عنوان، پلاٹ، کردار اور مضمون کو اپنے ہمیشہ کے شگفتہ انداز میں صفحۂ قرطاس پر بکھیرا ہے۔

رسائل و جرائد

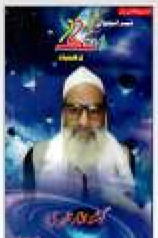

سہ ماہی 'رنگ' دھنباد

مدیر: ڈاکٹر اقبال حسین

صفحات: 222، قیمت: 70 روپے، سنہ اشاعت: جولائی تا ستمبر 2021

ناشر: سہ ماہی 'رنگ'، مرزا غالب روڈ

نوری ہاؤس، جھریا، دھنباد (جھارکھنڈ)

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی

15 نومبر 2000 سے قبل رانچی، دھنباد، جمشید پور، گریڈیہہ، ہزاری باغ، ڈالٹن گنج، پلاموٗ جیسے شہر صوبہ بہار کا حصہ تھے۔ تقسیم بہار کے بعد یہ اضلاع جھارکھنڈ میں شامل ہوگئے۔ یہاں کے بیشتر علاقوں میں ادب وصحافت کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے۔ ان میں سے بعض علاقوں سے اردو روزنامے اور ادبی رسائل بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ان میں دھنباد کو کئی حوالوں سے الگ شناخت اور شہرت حاصل ہے۔ اسی سرزمین نے اردو فکشن کو غیاث احمد گدی اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ ناول 'فائر ایریا' کے خالق الیاس احمد گدی جیسے دو اہم نام عطا کیے ہیں۔ شاعری اور دیگر اصناف میں بھی کئی معتبر نام ہیں۔ اس کے علاوہ دھنباد ضلع کا ایک شہر جھریا کوئلے کی کان اور واسع پور، مشہور فلم Gangs of Wasseypu r کی وجہ سے بھی مشہور ہے۔

دھنباد سے کئی اہم ادبی رسالے شائع ہوتے رہے ہیں جن میں جام نو (ایڈیٹر: قمر مخدومی)، رحمت (ایڈیٹر: ریاض رشیدی)، کنول (ایڈیٹر: شان بھارتی)، کارواں (ایڈیٹر: کمال الدین صدیقی، مناظر عاشق ہرگانوی)، وقت (ایڈیٹر: سید منظر امام)، سہ ماہی شہپر (ایڈیٹر: احمد فرمان) وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ اب احمد نثار کی ادارت میں سہ ماہی 'عالمی فلک' کی صورت میں ایک نئے مجلّے کا اضافہ ہوا ہے۔

دھنباد کے ادبی رسائل میں سہ ماہی 'رنگ' دھنباد ایک ایسا مجلّہ ہے جسے اشاعتی استمرار اور تسلسل کے اعتبار سے امتیاز حاصل ہے کہ اس کی اشاعت کا آغاز 1995 میں ہوا تھا اور اب تک 93 شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ معروف شاعر و ادیب شان بھارتی کی ادارت میں نکلنے والے اس رسالے نے ادبی حلقے میں اپنی ایک الگ شناخت قائم کی ہے۔ خاص طور پر زندہ شخصیات پر اس کے گوشوں کو بہت پذیرائی ملی ہے۔

شان بھارتی کی وفات کے بعد ڈاکٹر اقبال حسین جیسی علمی اور ادبی شخصیت نے رنگ کے تسلسل کو قائم رکھنے کا بیڑہ اٹھایا۔ یہ رسالہ بنیادی طور پر نئی فکریات، سماجی سروکار، آزادی اور تہذیبی تشخص کا ترجمان ہے۔ اس کے 93واں شمارے میں 'بساط رنگ' کے تحت ہندوستان کے طول وعرض کے قلم کاروں کی اہم تخلیقات شامل ہیں۔ حسب روایت مضامین، افسانے، افسانچے، خصوصی مطالعہ، نظمیں، غزلیں، انٹرویو، تبصرے، ادبی ثقافتی تہذیبی خبریں اور قارئین اور قلم کاروں کے خطوط شمارے کا حصہ ہیں۔ ان میں بعض مضامین اس اعتبار سے اہم اور وقیع ہیں کہ ان کے توسط سے کچھ ایسی شخصیات سے ملاقاتیں ہو جاتی ہیں جو گوشۂ گمنامی میں ہیں یا جن کے حوالے سے ادبی رسالوں میں بہت کم تحریریں شائع ہوتی ہیں۔

'رنگ' کی ایک روایت زندہ شخصیات پر گوشوں کی بھی رہی ہے اور یہ سلسلہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس سے زندہ تخلیق کاروں کی داخلی سائیکی اور خارجی تحرک پر مثبت اثرات پڑتے ہیں۔ قدر شناسی کی یہ وہ روش ہے جو تخلیق کاروں کی قوت اور توانائی میں اضافہ کرتی ہے۔ آج جب کہ ہماری اجتماعی یادداشت کمزور پڑتی جارہی ہے اور فراموش کاری عام روش بن چکی ہے تو ایسے میں زندہ تخلیق کاروں کی شناخت اور تحسین کا یہ ایسا سلسلہ ہے جس کی وجہ سے بہت سے جینوئن تخلیق کاروں کو دشت گمنامی میں کھونے سے بچایا جاسکتا ہے۔ اس شمارے میں بھی مختار تلہری کا ایک گوشہ ترتیب دیا گیا ہے جس میں آٹھ مضامین شامل ہیں جو مختار تلہری کی شعری شخصیت کے مختلف زاویوں پر روشنی ڈالتے ہیں۔ مختار تلہری کا بنیادی تعلق تلہر شاہجہاں پور یوپی سے ہے مگر بہ سلسلہ تجارت وہ بریلی میں مقیم ہیں اور تجارت کی مصروفیت کے باوجود وہ اپنا قیمتی وقت شعروادب میں صرف کرتے رہے ہیں۔ ان کے کئی شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن میں شہباز قلم، مجھے کچھ پتہ نہیں، تو آنکھ بھر آئی، تو یاد کر لینا مجھے قابل ذکر ہیں۔ ان کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ عیب تنافر سے پاک ہے۔ گوشہ مختار تلہری میں ڈاکٹر اقبال حسین، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، درد دہلوی، مقبول منظر، ممتاز عرشی رامپوری، ظہیر علی صدیقی رامپوری، محسن عظیم انصاری، عامر سلطانپوری نے مختار تلہری کی شعری اور فکری اساس کے حوالے سے اہم گفتگو کی ہے۔ یقیناً یہ ایسی تحریریں ہیں جن سے ایک ایسی شخصیت کے بارے میں لوگوں کی معلومات میں اضافہ ہوگا جن سے شاید ایک بڑا ادبی حلقہ مکمل طور پر واقف نہیں ہے۔

گوشے کے علاوہ مضامین کے ضمن میں شان بھارتی کے حوالے سے نارنگ ساقی کا ایک اہم مضمون ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ شان بھارتی نہ صرف ایک اچھے شاعر تھے بلکہ صحافت میں بھی انھوں نے قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ انھوں نے ہی پندرہ روزہ اخبار 'ہمعصر' شائع کیا تھا جو 1971 سے 1974 تک شائع ہوتا رہا۔ اس کے علاوہ 'کنول' کے نام سے ایک ادبی رسالہ نکالنا شروع کیا جس کے 24 شمارے شائع ہوئے۔ 'رنگ' کو انھوں نے ہی ایک نیا آہنگ عطا کیا اور بہت سی اہم شخصیات پر گوشے شائع کیے۔ شہاب دائروی کے افسانوں کے حوالے سے وکیل احمد رضوی نے اچھا مضمون تحریر کیا ہے۔ شہاب دائروی کو بھی لوگ بھولتے جارہے ہیں اس لحاظ سے ان کی افسانہ نگاری کے حوالے سے اس نوعیت کے مضمون کی شدید ضرورت تھی۔ شموئل احمد کے فکشن میں جنس کی معنویت پر ڈاکٹر محمد شارب کا اچھا مضمون ہے۔ انتساب کے ایڈیٹر سیفی سرونجی کی ایک عمدہ تحریر بھی اس رسالے میں شامل ہے۔

ڈاکٹر داؤد محسن اور محمود شاہد کے افسانوں کے علاوہ تنویر اختر رومانی، شگوفہ تمنا اور مسرور تمنا کے افسانچے بھی ہیں۔ خصوصی مطالعے کے تحت عثمان انجم کی حیات اور کارنامے پر امتیاز احمد راشد نے معلوماتی مضمون تحریر کیا ہے۔ عثمان انجم کا تعلق تو ضلع جموئی سے تھا مگر وشاکھا پٹنم (تلنگانہ) میں مقیم تھے۔ انھوں نے 'اصنام شکن' جیسے رسالے کے ذریعے وشاکھا پٹنم میں اردو کی شمع کو روشن رکھا۔ ایک اچھے تخلیق کار تھے جو کورونا عہد میں 2 مئی 2021 کو اس دنیائے فانی کو الوداع کہہ گئے۔ حافظ کرناٹکی کی غزل گوئی کے حوالے سے امام الدین امام کا بھی مضمون بھی وقیع ہے۔ اس شمارے میں امان ذخیروی، علیم صبا نویدی، مست حفیظ رحمانی، مصداق اعظمی، سلیم انصاری، مشتاق احزن، نسیم فائق، معراج احمد معراج، عظمت علی عظمت کی نظموں کے علاوہ بہت سے معتبر شاعروں کی غزلیں بھی ہیں۔ ادب اطفال کے حوالے سے ڈاکٹر محمد ارمغان ساحل نے معروف ادیب، نقاد اور شاعر شاہد جمیل سے خصوصی بات چیت کی ہے۔ شاہد جمیل نے بچوں کے ادب کے حوالے سے جن نکات کی طرف اشارے کیے ہیں ان پر سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تبصرے بھی تازہ اور اہم مطبوعات پر ہیں جن سے ہمیں نئی کتابوں کے بارے میں اہم معلومات مل جاتی ہیں۔ ڈاکٹر اقبال حسین نے اپنے اداریے میں مرحومین کو خراج عقیدت پیش کیا ہے جن میں کئی اہم شخصیات ہیں جن کی رحلت سے یقینی طور پر ہماری اردو دنیا ویران اور سنسان ہوگئی ہے۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو شان بھارتی کی یاد میں شائع ہونے والا سہ ماہی 'رنگ' اپنے مشمولات اور محتویات کے اعتبار سے اہمیت اور معنویت کا حامل ہوتا جارہا ہے۔ مکتوبات سے اس مجلّے کی مقبولیت اور قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

’آج کے ہندوستان کے لیے مولانا آزاد کی وراثت‘ کے موضوع پر خصوصی لیکچر

نئی دہلی: 11 نومبر مولانا ابوالکلام آزاد کی سالگرہ اور قومی یومِ تعلیم کی مناسبت سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی کے زیر اہتمام ’آج کے ہندوستان کے لیے مولانا آزاد کی وراثت‘ کے عنوان سے آن لائن لیکچر کا اہتمام کیا گیا۔ اس موقعے پر استقبالیہ و تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ آزاد ہندوستان کی تعمیر و تشکیل میں مولانا ابوالکلام آزاد کا نمایاں کردار ہے۔

انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کی قیادت کا میدان بہت وسیع تھا، انھوں نے جس میدان میں بھی قدم رکھا، اپنی عظیم شخصیت کے انمٹ نقوش ثبت کردیے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد قومی یکجہتی اور بین المذاہب ہم آہنگی کے سب سے بڑے داعی تھے اور انھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں جابہ جا متحدہ قومیت اور اس مشترک سرمایے کو موضوع و محور بنایا، جو ہندوستانی قوم کا ہزاروں سال کا قابل فخر سرمایہ ہے اور اسی پر اپنے سیاسی نظریے کی بنیاد رکھی۔ شیخ عقیل نے کہا کہ آزاد ہندوستان میں تعلیمی منصوبہ بندی کا آغاز بھی مولانا نے ہی کیا اور ملک کے تمام طبقات کے لیے تعلیم کو لازمی قرار دیتے ہوئے اسے قومی ترقی کی بنیادی شرط قرار دیا۔ اسی وجہ سے ان کے یومِ پیدائش کو یوم تعلیم کے طور پر منایا جاتا ہے اور کونسل کی طرف سے مولانا کے فکر و نظر پر ہر سال خصوصی لیکچر کا اہتمام کیا جاتا ہے، آج کا یہ پروگرام بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔

قومی اقلیتی کمیشن کے سابق چیئر مین جناب وجاہت حبیب اللہ نے خطبہ دیتے ہوئے کہا کہ مولانا آزاد کی مذہبی و ثقافتی وراثت موجودہ ہندوستان کے لیے نہایت اہم اور قابل تقلید ہے۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد اور ان کے رفقا نے متحدہ ہندوستان اور مشترکہ تہذیب کی جس روایت کی نمائندگی کی اور جس پر وہ تا عمر زور دیتے رہے اس کی بنیادیں ہمارے قدیم مذہبی متون میں پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا نے یہ بانگ دہل کہا تھا کہ ہمیں جس طرح اسلام کی تیرہ سو سالہ وراثت کا وارث ہونے پر فخر ہے، اسی طرح ہندوستان کی ناقابل تقسیم وحدت کا بھی میں حصہ ہوں، جو ہماری ہزاروں سالہ معاشرت سے تشکیل پائی ہے۔ انھوں نے ہندوستانی مذہبی روایات اور قدیم مذہبی متون کی روشنی میں ہندوستان کے ثقافتی تنوع اور تہذیبی ثروت مندی پر بھرپور روشنی ڈالی۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد نہ صرف عالم قرآن تھے، بلکہ ہندوستانی مذاہب پر بھی گہری نگاہ تھی اور اسی وجہ سے وہ یہ سمجھتے تھے کہ بطور ملک ہندوستان کے تحفظ و ترقی کے لیے ہندو اور مسلمانوں دونوں قوموں کا اتحاد ضروری ہے، مولانا کے اس نظریے پر عمل آج بھی اتنا ہی مفید ہے جتنا ان کے زمانے میں فائدہ مند تھا۔

محترمہ سیدہ سیدین حمید نے اپنے صدارتی خطاب میں وجاہت حبیب اللہ کے خطبے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ آپ نے مولانا کی فکری وراثت ہندو مسلم اتحاد کو تکنیکی، تاریخی، فلسفیانہ اور روحانی حوالوں سے پیش کرکے مولانا آزاد کی فکر کا بھرپور تعارف کروایا ہے اور یہ تمام تشریحات مولانا آزاد نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں پیش کی ہیں۔ انھوں نے کہا کہ مولانا آزاد کی حیثیت آج کے دور میں آندھی میں چراغ جیسی ہے۔ ہندوستان کی مکمل آزادی کا تصور سب سے پہلے مولانا آزاد نے الہلال کے ذریعے دیا اور بعد میں یہی قومی تحریک بن گئی اور پورے ہندوستان میں پھیل گئی۔ انھوں نے اس موقعے پر ’غبار خاطر‘ سے مولانا کی خوب صورت نثر کے اقتباسات بھی پیش کیے۔ اخیر میں شیخ عقیل نے محترم وجاہت حبیب اللہ، محترمہ سیدہ سیدین حمید اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ پروگرام کی نظامت ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) نے کی، اس موقعے پر کونسل سے جناب انتخاب عالم (ریسرچ آفیسر)، محمد فیاض، افضل حسین خان، نوشاد منظر وغیرہ موجود رہے۔ پروگرام کو کونسل کے فیس بک پیج پر بھی لائیو نشر کیا گیا۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 11 نومبر 2021

داستانوں کے عروج وزوال کی کہانی، ادبا کی زبانی'

نئی دھلی: قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'داستانوں کے عروج وزوال کی کہانی، ادبا کی زبانی' کے عنوان سے آن لائن مذاکرے کا انعقاد کیا گیا، جس میں فنِ داستان سے علمی، عملی وتنقیدی تعلق رکھنے والے متعدد اہل علم و دانش نے شرکت کی۔ پروگرام کے آغاز میں قومی اردو کونسل کے ڈائریکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے مہمانوں کا استقبال کیا

اور موضوع کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ اردو نثر اور داستان کی ابتدا کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ اردو نثر کے ساتھ ہی اردو داستان نگاری و داستان گوئی شروع ہوتی ہے، جو بتدریج ترقی حاصل کرتی ہے اور پھر بیسویں صدی کے انقلابات کی زد میں آکر دھندلانے لگتی ہے۔ انھوں نے اہم داستانوں کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ان داستانوں نے مجموعی طور پر اردو زبان کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے اور آج بھی ان کی ادبی و ثقافتی اہمیت مسلّم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قومی اردو کونسل قدیم داستانوں کی ازسرنو اشاعت کے منصوبے پر کام کررہی ہے اور جلد ہی الف لیلہ ولیلہ کا نیا کمپوز ایڈیشن کونسل کے زیر اہتمام شائع ہونے والا ہے۔ انھوں نے موجودہ عہد میں داستان گوئی کے فن کو درپیش چیلنجز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ آج کا یہ مذاکرہ اسی لیے منعقد کیا گیا ہے کہ ان چیلنجز پر گفتگو کی جائے۔

فنِ داستان گوئی سے طویل وابستگی رکھنے والے نواب جعفر میر عبداللہ نے اس مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ داستان گوئی ایک دلچسپ موضوع ہے، جس میں ضروری ہے کہ داستان گو کی زبان وبیان سامعین کے لیے دلچسپ ہو۔ انھوں نے کہا کہ میں نے بچپن میں داستان گو اور قصہ گو حضرات کو دیکھا اور سنا ہے، ہمارے بزرگوں میں اس کی پختہ روایت تھی۔ انھوں نے کہا کہ لکھنؤ میں آج بھی داستان گوئی ہوتی ہے، البتہ ماضی میں داستان گوئی کا مقصد صرف قصہ گوئی اور لطف اندوزی ہوتا تھا، جبکہ اب داستان گو زمانے اور حالات کے مطابق سامعین کو خاص پیغام بھی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔

پروفیسر قمر جہاں نے کہا کہ داستان ہماری اہم ادبی وراثت ہے۔ اس میں معیاری زبان کا استعمال بنیادی شرط ہے، مگر نئے زمانے میں ملی جلی تہذیب اور زبانوں کی وجہ سے ہماری زبان پر جو منفی اثر پڑا ہے اس کا اثر داستان گوئی پر بھی پڑا ہے۔ داستانوں کے درس وتدریس کے تعلق سے انھوں نے کہا کہ داستان محض ایک تدریسی سبجیکٹ نہیں ہے، اس میں ایک پوری قوم کی تہذیب وثقافت ہوتی ہے جس کو محسوس کرنا اور کماحقہ بیان کرنا چاہیے۔

معروف داستان گو دانش حسین نے کہا کہ نئے زمانے کی داستان گوئی پرانے زمانے سے بہت مختلف ہے، اس میں فی البدیہہ والا پہلو پانچ فیصد ہوتا ہے، زیادہ تر حصہ داستان کی کتابوں سے یاد کرکے پیش کیا جاتا ہے۔ علی گڑھ شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی کے پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے داستان کے فنی پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ داستان کا ایک تو تعلق قصہ کہانی سے ہے، دوسرے ہماری جذباتی، سماجی وادبی ضرورت سے بھی ہے۔ دہلی یونیورسٹی کے پروفیسر ابن کنول نے اس پروگرام کی نظامت کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیے۔ انھوں نے داستان کی تاریخ، اس کی خصوصیات اور امتیازات پر گفتگو بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ داستان گوئی کا سلسلہ صدیوں پرانا ہے اور دنیا کے ہر ملک میں داستان سننے سنانے کی روایت رہی ہے، داستان وہی شخص بیان کرسکتا ہے جس کی قوت متخیلہ مضبوط ہو، اس کی بنیاد زبان دانی اور طول بیانی پر ہے۔ شیخ عقیل احمد کے اظہار تشکر کے ساتھ مذاکرے کا اختتام ہوا۔ اس موقعے پر کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر) اور محمد انصر وغیرہ شریک رہے۔ افضل حسین خان (ریسرچ اسسٹنٹ) اور نوشاد منظر نے تکنیکی تعاون فراہم کیا۔ کونسل کے فیس بک پیج پر اس پروگرام کو لائیو نشر کیا گیا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 10 نومبر 2021

'ادبِ اطفال میں تخلیقی سطحیت: حقیقت یا فسانہ'

نئی دہلی: قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام 'ادبِ اطفال میں تخلیقی سطحیت: حقیقت یا فسانہ' کے عنوان سے منعقدہ آن لائن مذاکرے میں تعارفی کلمات پیش کرتے ہوئے کونسل کے ڈائرکٹر پروفیسر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ادبِ اطفال ایک مشکل صنف ہے جس میں بچوں کی ذہنی سطح اور عصری تقاضوں کو سامنے رکھنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو میں دیگر اصناف کے ساتھ بچوں کے ادب کی بھی ایک توانا روایت رہی ہے اور ماضی قریب وبعید سے لے کر آج تک ہمارے بہت سے ادیبوں نے بچوں کے لیے ادب تخلیق کیا اور بہت سے رسالوں نے بھی ادبِ اطفال کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے مگر عصرِ حاضر میں ادبِ اطفال کو کئی طرح کے مسائل درپیش ہیں۔ ایک تو یہ کہ موجودہ دور میں ادبِ اطفال پر کام بہت کم ہورہا ہے اور دوسرا اہم مسئلہ بچوں کے ادب

کے معیار اور سطح کا بھی ہے۔ انھوں نے مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ آج کے مذاکرے میں ادبِ اطفال کے اسی پہلو پر تبادلۂ خیال کیا جائے گا، جو لوگ اس مجلس میں موجود ہیں ان کی بچوں کے ادب پر گہری نگاہ ہے اور وہ خود بھی بچوں کے لیے لکھتے رہے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ آج کی گفتگو کے ذریعے ادبِ اطفال کی موجودہ صورت حال اور اس کے معیار پر صحت مند رائیں سامنے آئیں گی۔

معروف افسانہ نگار ذکیہ مشہدی نے مذاکرے میں حصہ لیتے ہوئے کہا کہ تخلیقیت سے پہلے بچوں میں اردو زبان کے تئیں دلچسپی پیدا کرنا ضروری ہے، جس کے بعد ہی ہم انھیں ادبِ عالیہ کی طرف متوجہ کرسکتے ہیں۔ انھوں نے معاصر زبانوں خصوصاً انگریزی میں لکھے جانے والے بچوں کے ادب سے مثالیں پیش کرتے ہوئے کہا کہ بچوں کے لیے مفید ادب تبھی تخلیق ہوسکتا ہے، جب بچے کی عمر، ذہنی سطح، جذباتی اور عقلی سطح کو پیش

نظر رکھتے ہوئے لکھا جائے۔ بچوں کے ادیب سردار سلیم نے کہا کہ ہمیں اس حقیقت کا اعتراف کرنا چاہیے کہ موجودہ دور میں بہت سے ادبا اور رسالے ادب اطفال کو فروغ دے رہے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ہمیں بچوں کے لیے نئے لکھنے والوں کی ہر حال میں حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔ سراج عظیم نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ آج سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقیات کی وجہ سے بچوں کی ذہنی وفکری سطح میں غیر معمولی تبدیلی آچکی ہے، جس کا احساس وادراک ضروری ہے اور بچوں کے لیے تبھی کامیاب ادب تخلیق کیا جاسکتا ہے۔ بچوں کے رسالہ 'نیا کھلونا' کے مدیر اعلیٰ نوشاد مومن نے کہا کہ بچوں کے ادب میں تخلیقی سطحیت آدھی حقیقت اور آدھا فسانہ ہے، البتہ قلمکاروں کی یہ ذمے داری ہے کہ وقت کی ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے بچوں کا ادب تخلیق کریں۔ اس موقعے پر این بی ٹی کے ایڈیٹر (اردو) شمس اقبال نے بھی اظہار خیال کیا اور کہا کہ بچوں کے ادب میں مواد کی بہتری کے ساتھ ظاہری سراپا کو بھی خوب صورت بنانے کی ضرورت ہے۔

اخیر میں کونسل کے ڈائرکٹر شیخ عقیل احمد نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ کونسل بچوں کے ادب کو موجودہ ضروریات اور تقاضوں کے مطابق پیش کرنے اور اسے فروغ دینے کے لیے ضروری قدم اٹھائے گی۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ بچوں کے ادب پر لکھنے والے ادیبوں اور اداروں کے لیے کونسل جلد ہی ایک تربیتی ورکشاپ بھی منعقد کرے گی۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض جناب فیروز بخت احمد نے بحسن وخوبی انجام دیے۔ اس موقعے پر کونسل سے ڈاکٹر کلیم اللہ (ریسرچ آفیسر)، آبگینہ عارف (ٹیکنکل اسسٹنٹ) موجود رہے، افضل حسین خان اور محمد افروز نے تکنیکی تعاون فراہم کیا، جبکہ کونسل کے فیس بک پیج کے ذریعے سیکڑوں لوگوں نے اس پروگرام میں شرکت کی۔

پریس ریلیز، رابطہ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 26 اکتوبر 2021

اے پی جے عبدالکلام کے خوابوں کا بھارت

نئی دهلی: سابق صدر جمہوریہ ہند ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کو ہندوستان اور ملک کے طلبہ کے لیے رول ماڈل قرار دیتے ہوئے اندریش کمار نے کہا کہ ڈاکٹر کلام کے فلسفہ کو اپنی زندگی میں اتارے بغیر ملک کی ترقی نہیں ہوسکتی۔ یہ بات انھوں نے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (این سی پی یو ایل) کے 'اے پی جے عبدالکلام کے

خوابوں کا بھارت' کے عنوان سے مقابلہ مضمون نویسی کو لانچ کرتے ہوئے کہی۔ انھوں نے ملک کے نوجوانوں سے اپیل کرتے ہوئے کہا کہ ہندوستان اس وقت مضبوط اور وشوگرو بنے گا جب یہاں کے طلبہ ان کے فلسفے، تعلیم اور ان کے طرز زندگی کو اپنی زندگی میں اتاریں گے اور ان کی طرح محنت کریں گے۔ انھوں نے کہا کہ یہ بہت خوش آئند ہے کہ قومی اردو کونسل ہندوستان کو مضبوط بنانے کے لیے نوجوانوں کو ترغیب دے رہی ہے اور مضمون نویسی کا یہ مقابلہ اس ضمن میں بہت ہی مثبت قدم ہے۔ انھوں نے ڈاکٹر کلام کو ان کے یوم پیدائش کے موقعے پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ وہ شدت پسندانہ سوچ سے دور حب الوطنی، بھائی چارگی اور ملک کے لیے کچھ کرگزرنے کی بہترین مثال تھے۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے مہمان خصوصی اندریش کمار کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کو ہندوستانی نوجوانوں کے لیے رول ماڈل ہونا چاہیے اور یہ مضمون نویسی کا مقابلہ نوجوانوں کے لیے ڈاکٹر کلام کو سمجھنے، ان سے سیکھنے، ان سے تحریک حاصل کرنے اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر چلنے کے لیے ترغیب کا کام کرے گا۔ انھوں نے کہا کہ اس مقابلہ میں اول آنے والوں کو دس ہزار، دوسرے مقام پر آنے والے کو ساڑھے سات ہزار اور تیسرا مقام حاصل کرنے والے کو پانچ ہزار روپے کا انعام دیا جائے گا اور پانچ طلبہ کو ایک ایک ہزار روپے، ترغیبی انعام کے طور پر دیے جائیں گے۔ قومی اردو کونسل کے وائس چیئرمین ڈاکٹر شاہد اختر نے کہا کہ مضمون نویسی کا یہ مقابلہ ڈاکٹر اے پی جے عبدالکلام کو جاننے کا بہترین ذریعہ ثابت ہوگا۔ ساتھ ہی انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر کلام پر مضمون نویسی مقابلہ میں شامل ہونے والے تمام طلبہ کو قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی طرف سے سرٹیفکیٹ دیا جائے گا۔ انھوں نے کہا کہ ڈاکٹر کلام نے کہا کہ ایسی تعلیم کی ضرورت ہے جو انسان کو انسانیت کا علمبردار بنا سکے۔ اس موقعے پر قومی اردو کونسل کے سابق ڈائرکٹر اور دہلی یونیورسٹی کے فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین پروفیسر ارتضیٰ کریم، مولانا مظہر الحق عربی فارسی یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر پروفیسر اعجاز علی ارشد بھی موجود تھے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 اکتوبر 2021

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

قومی اردو کونسل کے تعاون سے

خطاطی مقابلہ

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، وزارت تعلیم حکومت ہند اور صوفیہ ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر سوسائٹی نے شمال مشرقی دہلی کے مصطفیٰ آباد میں خطاطی مقابلہ منعقد کیا جس میں ڈاکٹر عقیل احمد ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان اور سید اکرام رضوی جوائنٹ سکریٹری وزارت تعلیم حکومت ہند بطور مہمان خصوصی موجود رہے۔ ڈاکٹر عقیل احمد

نے اپنے خطاب میں کہا کہ صوفیہ ایجوکیشنل سوسائٹی اردو خطاطی کو فروغ دینے میں اہم کردار ادا کر رہی ہے۔ ہمیں فخر ہے کہ صوفیہ این جی او خطاطی جیسی میراث کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔ اگر اس طرح کے دیگر ادارے بھی ساتھ مل کر کام کریں تو اردو فن خطاطی کو نئی بلندیاں دی جاسکتی ہیں۔ اکرام رضوی نے کہا کہ بچوں کو یہ ہنر زیادہ سے زیادہ سیکھنا چاہیے اور گرمیوں کی چھٹیوں میں خطاطی کے کیمپ لگائے جائیں تاکہ زیادہ سے زیادہ بچے اس سے فائدہ اٹھائیں، انھوں نے کہا کہ صوفیہ سوسائٹی جیسی تنظیم معاشرے کے لیے کسی نعمت سے کم نہیں ہے۔ اردو اکیڈمی کے سینئر خطاط حافظ وسیم احمد اور مصطفیٰ احمد نے مقابلہ میں شامل تقریباً 150 بچوں میں سے نمایاں کارکردگی کی بنیاد پر دس کو منتخب کیا جن میں عائشہ پہلی، فائزہ دوسری، ارم تیسری پوزیشن کی مستحق قرار پائیں۔ ان کے علاوہ باقی سات بچوں کو حوصلہ افزا نمبرات سے نوازا گیا اور حصہ لینے والے سبھی طلبہ و طالبات کو سرٹیفکیٹ دیے گئے۔ اس موقعے پر تنظیم کے صدر سہیل سیفی نے کہا کہ این سی پی یو ایل ملک کے کونے کونے میں خطاطی کے مراکز قائم کرکے اس فن کو فروغ دے رہی ہے۔ یہ مقابلہ اپنے آپ میں ایک مثال ہے۔ پروگرام کی نظامت معروف شاعر دانش ایوبی نے کی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 22 اکتوبر 2021

دینی مدارس کے اساتذہ کے لیے تربیتی پروگرام

حیدرآباد: دینی مدارس اخلاقیات کا منبع ہیں اور علم و ہنر کے فروغ میں ان کے کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر سید عین الحسن، شیخ الجامعہ، مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی نے یہاں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی اور مرکز پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذہ اردو ذریعہ تعلیم کے مشترکہ آن لائن تربیتی پروگرام برائے اساتذہ دینی مدارس کے اجلاس میں کیا۔ انھوں نے کہا کہ مشینوں کے ذریعے اخلاقیات، تہذیب و ثقافت اور اقدار کی تعلیم نہیں دی جاسکتی۔ اس لیے آن لائن تدریس کے

دوران بھی معلم کی مرکزی حیثیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ انھوں نے کہا کہ اردو، فارسی اور عربی کی عالمی سطح پر شناخت قائم ہوچکی ہے۔ انھیں کسی بھی صورت نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ اس موقعے پر مہمان خصوصی پروفیسر عقیل احمد ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی نے کہا کہ ایک کامیاب معلم اپنے ہر طالب علم پر اپنی چھاپ چھوڑتا ہے۔ انھوں نے قومی کونسل اور اردو یونیورسٹی کے مشترکہ چھ روزہ تربیتی پرگرام برائے اساتذہ دینی مدارس کو وقت کی ضرورت قرار دیتے ہوئے کہا کہ دونوں ادارے باہمی تعاون سے اردو کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرسکتے ہیں ۔ پروفیسر محمد عبدالسمیع صدیقی، مرکز، پیشہ ورانہ فروغ برائے اساتذۂ اردو ذریعہ تعلیم نے آن لائن تربیتی پرگرام کے اغراض و مقاصد پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ مصباح انظر، اسسٹنٹ پروفیسر، سی پی ڈی یو ایم ٹی نے افتتاحی اجلاس کی کارروائی چلائی اور ہدیہ تشکر پیش کیا۔ پہلے تکنیکی اجلاس میں ڈاکٹر سید امان عبید نے 'آن لائن تدریس اور دینی مدارس' کے عنوان پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس آن لائن تربیتی پروگرام میں قومی اردو کونسل کی جانب سے ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائرکٹر، اکیڈمک)، انتخاب احمد (ریسرچ آفیسر) بھی شریک تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 6 اکتوبر 2021

اردو اور دراوڑی زبانوں اور ادب کے مابین اشتراک و ہم آہنگی

ترچناپلی: جمال محمد کالج (خودمختار)، ترچناپلی، تمل ناڈو میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی کے مالی تعاون سے یک روزہ قومی سمینار بعنوان 'اردو اور دراوڑی زبانوں اور ادب کے مابین اشتراک اور ہم آہنگی کا تجزیہ' پر قومی سمینار 4/ اکتوبر 2021 کو منعقد

ہوا۔ سمینار میں اردو اور دراوڑی زبانوں اور ادب کے مختلف پہلوؤں پر چودہ مقالات پیش کیے گئے۔

افتتاحی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر خواجہ نظیم الدین صاحب، سکریٹری و کرسپانڈنٹ، جمال محمد کالج، ترچناپلی نے کی۔ سمینار کنوینر ڈاکٹر شیخ کریم اللہ، شعبۂ ہندی نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا اور سمینار کے کوآرڈینیٹر ڈاکٹر ایس محمد مدثر، شعبۂ اردو نے مہمانان گرامی کا تعارف پیش کیا اور ڈاکٹر شیخ کریم اللہ اور ڈاکٹر ایس محمد مدثر نے تمام مہمانان گرامی کی شال پوشی کی۔ ڈاکٹر محمد نعیم الرحمٰن، نائب چیرمین، تمل ناڈو اسٹیٹ اردو اکادمی نے افتتاحی خطاب کیا۔ پروفیسر قاضی حبیب احمد، صدر شعبۂ عربی فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی، چنئی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔

پہلی نشست کی صدارت پروفیسر ایس۔ محمد نثار احمد، شعبہ اردو، سری وینکٹیشور یونی ورسٹی، تروپتی نے کی۔ اس میں ڈاکٹر بشیرہ سلطانہ (جے بی اے ایس کالج، چنئی) نے 'تمل ادب میں اردو زبان کے اثرات ایک مختصر جائزہ'، ڈاکٹر ابو بکر ابراہیم (جامعہ دارالسلام) نے 'تمل کے اردو تراجم میں فارغین جامعہ کی خدمات: ایک جائزہ'، ڈاکٹر محمد یاسر (سی عبدالحکیم کالج) نے 'اردو اور تمل کے مابین تراجم میں مدراس یونیورسٹی کی خدمات'، پروفیسر سیفی عمری (جامعہ دارالسلام) نے 'تمل شاہکار تروکرل کا اردو ترجمہ مقدس آواز'، ڈاکٹر سید وصی اللہ بختیاری (گورنمنٹ کالج، رائے چوٹی) نے 'اردو اور تلگو کے رسائل' اور ڈاکٹر کلیم اللہ (مظہر العلوم کالج) نے 'شہر آمبور میں اردو تمل کے نمونے' کے عناوین پر مقالات پیش کیے۔

دوسری نشست کی صدارت ڈاکٹر قاضی حبیب احمد، صدر شعبۂ عربی، فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی، چنئی نے کی۔ اس میں ڈاکٹر محمد امین اللہ نے 'دکنی اردو پر تلگو کے اثرات'، ڈاکٹر محمد نثار احمد نے 'اردو اور تمل بچوں کے رسائل: ایک اجمالی جائزہ'، ڈاکٹر امان اللہ نے 'اردو اور تمل شاعری کا اشتراک و ہم آہنگی: تروکرل کے خصوصی حوالے سے'، نور اللہ نے 'دکنی پر تلگو کے اثرات'، ڈاکٹر سعید الدین نے 'وانمباڑی کی اردو میں تمل کے رجحانات' اور ڈاکٹر عبد الغفار نے 'اردو پر ملیالی اثرات' کے حوالے سے مقالات پیش کیے۔

اختتامی اجلاس کی صدارت ڈاکٹر کے این عبد القادر نہال، ممبر، جمال محمد کالج، ترچناپلی نے کی۔ ڈاکٹر شیخ کریم اللہ نے استقبالیہ خطاب پیش کیا۔ پروفیسر قاضی حبیب احمد، مدراس یونیورسٹی، چنئی نے اپنے اختتامی خطاب میں مجموعی طور پر تمام مقالات کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ اس موضوع پر مزید کام کی گنجائش ہے۔ اب اس موضوع پر جب پہل ہو چکی ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ اس سمینار میں پیش کردہ مقالات پر مزید غور و خوض کیا جائے۔ اس اجلاس میں تمام شرکائے سمینار کو سند اور یادگاری تحفہ پیش کیا گیا۔ سمینار کوآرڈینیٹر ڈاکٹر محمد مدثر کے ہدیۂ تشکر اور قومی ترانہ کے ساتھ یہ یک روزہ قومی سمینار نہایت کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔

رپورٹ: ڈاکٹر ایس محمد مدثر، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، جمال محمد کالج، ترچناپلی، 23 اکتوبر 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا/کی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر.................. بتاریخ.................. بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زر تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

....

پتہ : ....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

دستخط

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing 7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.: magazines@ncpul.in

اردو سے متعلق دیگر قومی اور علاقائی خبریں

قومی

قرآن خطاطی

نئی دہلی: خانہ فرہنگ جمہوری ایران نئی دہلی میں منعقدہ 22ویں کل ہند مسابقہ حفظ قرأت قرآن کریم کے

دوسرے روز قرآن خطاطی کی نمائش کا افتتاح ہندوستان میں ایرانی سفیر ڈاکٹر علی چگینی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد، اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین حاجی تاج محمد، خانہ فرہنگ اسلامی جمہوریہ ایران کے رائزن ڈاکٹر محمد علی ربانی نے کیا۔ اس موقعے پر افتتاحی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران کے رائزن ڈاکٹر محمد علی ربانی نے قرآنی فن خطاطی کے حوالے سے کہا کہ تاریخ اسلامی میں کتابت اور فن خطاطی کا ہنر ہمیشہ سے بہت اہم رہا ہے اور پوری تاریخ میں اس کی اپنی اہمیت ہے، فن خطاطی وہ مقدس ہنر ہے جس کے ذریعے آیات الٰہی کو محفوظ کیا گیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ فن خطاطی ایک ایسا ہنر ہے جو ایرانیوں کی ایجاد ہے اور ایرانیوں نے ہی اس فن کو پروان چڑھایا ہے، مگر فن خطاطی کے فروغ میں ہندوستان کا بھی بہت اہم رول رہا ہے۔ یہاں کی سرزمین پر بہت بڑے اور نامور خطاط گزرے ہیں، جنھوں نے اسلامی فن خطاطی کی پاسداری کرتے ہوئے اپنی نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ ہندوستان میں ایرانی سفیر ڈاکٹر علی چگینی نے اس پروقار تقریب کے انعقاد پر خانہ فرہنگ اسلامی جمہوری ایران کا شکریہ ادا کیا اور کل ہند مسابقہ حفظ قرأت قرآن کریم میں شرکت کرنے والے تمام حفاظ و قراء کرام اور خطاط کو مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر علی چگینی نے کہا کہ تاریخ شاہد ہے کہ ہندوستان کا فن خطاطی سے بہت پرانا رشتہ ہے اور فن خطاطی کے لیے ہندوستان نے بہت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ کونسل ہندوستان میں فن خطاطی کے فروغ کے لیے کوشاں ہے جس کے لیے ملک بھر میں 66 فن خطاطی مراکز قائم کیے گئے ہیں، جہاں ہزاروں طلبہ تعلیم حاصل کر کے فن خطاطی کا سیکھ رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ ہم فارسی زبان کے فروغ کے لیے بھی کام کر رہے ہیں جس کے لیے ملک بھر میں 99 مراکز قائم کیے گئے ہیں، جہاں تقریباً 6 ہزار طلبہ فارسی سیکھ رہے ہیں۔ اردو اکادمی دہلی کے وائس چیئرمین حاجی تاج محمد نے بھی فن خطاطی کو فروغ دینے والی اکادمی کی سرگرمیوں کا تذکرہ کیا اور نمائش میں شرکت کرنے والے نوجوان خطاطوں کو اپنی نیک خواہشات سے نوازا۔ نمائش میں مختلف شہروں سے آئے خطاط نے اپنے فن پاروں میں صلاحیتوں کے ایسے جوہر دکھائے کہ دیکھنے والے خراج تحسین پیش کیے بغیر نہ رہ سکے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اکتوبر 2021

دہلی

ریسرچ اسکالر سمینار

نئی دہلی: پروفیسر عتیق اللہ نے کہا کہ تحقیق میں موضوع اور تحقیق کرنے والے کی ہم مزاجی ضروری ہے ورنہ تحقیق کرنے والا ریسرچ کا حق ادا نہیں کر سکے گا۔ وہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے زیراہتمام سہ روزہ بین الاقوامی ویبینار میں کلیدی خطبہ پیش کر رہے تھے۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے پروفیسر شارب ردولوی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ قابل مبارکباد ہے کہ اس نے وبا کے دنوں میں بھی اپنی سرگرمیوں کو جاری رکھا۔ کلیدی خطبے سے اس ویبینار کا شاندار آغاز ہوا ہے اور اس نے ویبینار کی سمت کو بڑی حد تک متعین کر دیا ہے۔ میں اپنے دور کی تحقیق سے مایوس نہیں ہوں بس مجھے چند عوامل نظر آتے ہیں جن کی وجہ سے تحقیقی رجحان کو ضرب لگی ہے، لیکن مجھے یقین ہے کہ وقت اس کا علاج کر دے گا۔ موجودہ دور میں بھی چند ایسے جوان لکھنے والے ہیں جن کی تحقیقی بصیرت سے مستقبل کے امکانات روشن ہیں۔ افتتاحی کلمات میں غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کے پروگراموں میں ریسرچ اسکالر سمینار مجھے اس لیے بہت پسند ہے کہ اس کے ذریعے طلبہ کی تربیت بھی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دوسرے کے قریب بھی آتے ہیں۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ریسرچ اسکالر سمینار کا سلسلہ 1999 سے شروع ہوا تھا اور اس کے بعد سے آج تک یہ سلسلہ جاری ہے۔ مجھے یہ کہتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ ابتدا میں جن لوگوں نے اس سمینار میں ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شرکت کی تھی آج وہ ملک کی بہترین دانش گاہوں میں تدریسی فرائض انجام دے رہے ہیں یا ادب میں اپنی نمایاں شناخت قائم کر چکے ہیں۔ افتتاحی اجلاس کے بعد اکیڈمک اجلاس کا سلسلہ شروع ہوا۔ پہلے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ تحقیق میں تازگی اور اخذ نتائج ہونا بھی ضروری ہے۔ اگر آپ پرانی چیزوں کو دہرا رہے ہیں تو وہ تحقیق نہیں ہو سکتی، اس طرح اگر محض اطلاعات جمع کر دی ہیں تو وہ بھی تحقیق نہیں ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے ہمیشہ کی طرح اس بار بھی مختلف یونیورسٹیز کے طالب علموں کو ایک ساتھ جوڑا اور ایک کامیاب ویبینار منعقد کیا۔ اس اجلاس میں محمد افضل زیدی، غزالہ حفیظ، محمد عارف، محمد شریف اور دیپانشو شرما نے مقالات پیش کیے۔ دوسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے ڈاکٹر فاضل

احسن ہاشمی نے کہا کہ مجھے بے حد خوشی ہے کہ طلبہ نے اپنے اپنے موضوع پر بڑی محنت سے مقالے لکھے اور ان کی پیشکش بھی قابل تعریف تھی۔ تحقیق کے لیے یہ ضروری ہے کہ آپ اپنے اسلاف کی تحریروں کو بغور پڑھیں۔ اس کا ایک فائدہ یہ ہوگا موضوع سے متعلق تمام ضروری اطلاعات آپ کے پاس جمع ہوجائیں گی اور تحقیق کے طریقوں سے بھی آشنائی ہوجائے گی۔ اس اجلاس میں سمیرا گیلانی (ایران) تجمل حسین، عبدالرحمٰن انصاری، محمد عالم، اور فاطمہ حق نے مقالات پیش کیے۔

تیسرے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر انور پاشا نے کہا کہ آج کے اجلاس میں شریک ہوکر مجھے خوشی ہوئی کہ ہمارے نوجوان مقالہ نگاروں نے روایتی انداز سے ہٹ کر اہم نکات دریافت کیے ہیں۔ اس اجلاس میں مہر فاطمہ، ذیشان حیدر، شاداب شمیم، سید نور عالم اور اطہر حسین نے مقالات پیش کیے۔ چوتھے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے دہلی یونیورسٹی کی صدر شعبۂ اردو اور ڈین فیکلٹی آف آرٹس پروفیسر نجمہ رحمانی نے کہا کہ میں استاد یا صدر جلسہ ہونے کا یہ مطلب قطعی نہیں سمجھتی کہ میں زیادہ جانتی ہوں اور مجھ سے کم عمر لوگوں کا علم کم ہے۔ اکثر کلاس یا سمینار میں کسی طالب علم کا ایک جملہ سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ سوچنے کا یہ زاویہ بھی ہوسکتا ہے۔ اس اجلاس میں الیاس کبیر، فرح ناز، فیاض حمید اور محمد الطاف مہدی نے مقالات پیش کیے۔ پانچویں اجلاس کی صدارت انجمن ترقی اردو ہند کے چیئرمین ڈاکٹر اطہر فاروقی نے کی۔ انھوں نے کہا کہ اکثر سمیناروں میں یہ دیکھا گیا ہے کہ پس منظر پر اتنا زور صرف ہوجاتا ہے کہ جو بات کہنے کی ہے اس کے لیے وقت نہیں رہ جاتا۔ طلبہ ابھی سے غور کریں کہ جو بات انھیں کہنی ہے وہ پہلے پہنچ جائے اور پس منظر پر غیر ضروری وقت صرف نہ ہو۔ اس موقعے پر رانی حفیظ، محمد خبیب، شمشیر علی اور محمد امان نے مقالات پیش کیے۔ تیسرے دن چھٹے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے کہا کہ تحقیق تلاش و جستجو کا نام ہے۔ میں اپنے اسکالروں سے یہ گزارش کرتا ہوں کہ وہ خود کو محنت کا عادی بنائیں۔ انٹرنیٹ پر لکھی ہوئی باتوں کو اپنے الفاظ میں پیش کرنے سے سند تو حاصل کی جاسکتی ہے لیکن اسے تحقیق نہیں کہہ سکتے۔ اس اجلاس میں مریم معطری (ایران)، سید نور عالم، شبیر احمد لون، جاوید احمد شاہ اور شہلا پروین نے مقالات پیش کیے۔ آٹھویں اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے پروفیسر شہزاد انجم (صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ) نے کہا کہ مجھے آج کے مقالات سن کر اس بات کی خوشی ہوئی کہ طلبہ خالص ادبی کتابوں کے علاوہ بھی دیگر موضوعات سے استفادہ کررہے ہیں۔ اس اجلاس میں محمد راشد سعیدی، بہارہ اکبری (ایران)، علی ظفر، محمد انور محمد افسر، ابرار علی شاہ، اور محمد عمران نے مقالہ پیش کیا۔ اختتامی اجلاس میں اظہار خیال کرتے ہوئے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سکریٹری پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی نے کہا کہ اس سال کے انٹرنیشنل ریسرچ اسکالرس وہینار کے مقالے جب کتابی شکل میں غالب انسٹی ٹیوٹ پیش کرے گا تو مجھے یقین ہے کہ یہ وہینار کی پروسیڈنگ آنے والے تمام نئے ریسرچ اسکالروں کے لیے ایک دستاویز کی حیثیت رکھے گی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ مجھے بے حد خوشی ہے کہ یہ سمینار اتنا کامیاب رہا مجھے یقین ہے کہ آئندہ یہ سمینار آف لائن منعقد ہوگا۔ میں اپنی ٹیم خصوصاً مشتاق احمد، توفیق احمد، افضل زیدی، الطاف مہدی، سلمان مہدی اور تمام اسٹاف کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بڑا تعاون کیا۔ پروفیسر راجندر کمار (صدر شعبۂ فارسی دہلی یونیورسٹی) نے کہا کہ میرے سامنے تمام طلبا کے مقالات کی فہرست ہے جسے ایک نظر میں دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اب تحقیق کے لیے فرسودہ موضوعات سے گریز کا رجحان پیدا ہوا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 اکتوبر، 1 نومبر 2021

کورونا اور تانیثی ادب

نئی دہلی: نسائی ادبی تنظیم 'بنات' کے پانچویں یوم تاسیس کے موقعے پر غالب اکیڈمی، بستی حضرت نظام الدین میں

ایک پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ یہ پروگرام دو اجلاس پر مبنی تھا۔ پہلے اجلاس میں کورونا کے عہد میں رخصت ہوجانے والے قلمکاروں کو خراج عقیدت پیش کیا گیا۔ جبکہ دوسرے اجلاس میں 'کورونا اور تانیثی ادب' کے عنوان سے سمپوزیم کا اہتمام کیا گیا۔

مرحوم ادبی شخصیات کے لیے منعقد تعزیتی اجلاس کی صدارت بنات کی صدر ڈاکٹر نگار عظیم اور ڈاکٹر افشاں ملک نے کی۔ حقانی القاسمی اور معین شاداب مہمان خصوصی تھے۔ حقانی القاسمی نے مرحوم ادیبوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ بہت سے ایسے شعرا و ادبا ہمارے درمیان سے اٹھ گئے، جن کے جانے سے شہر سونے اور گلیاں ویران ہوگئیں۔ انہوں نے کہا کہ چہروں کی گمشدگی بہت بڑا سانحہ ہے۔ جن چہروں سے آنکھوں کا رشتہ ہوتا ہے وہ گم ہوجائیں تو آنکھوں کی پیاس شدید ہوجاتی ہے۔ حقانی القاسمی نے کہا کہ کورونا کی وجہ سے صرف شخصیات کی موت نہیں ہوئی بلکہ بہت سے نظریات اور تصورات کی بھی موت ہوئی ہے۔

ڈاکٹر نگار عظیم نے رخصت ہوجانے والی شخصیات کو جذباتی خراج عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے مولانا وحیدالدین خاں، شمس الرحمٰن فاروقی، شمیم حنفی، ابوالکلام قاسمی، نصیر احمد خاں، مجتبیٰ حسین، رتن سنگھ، بیگ احساس، حنیف کیفی، افتخار امام صدیقی، علی جاوید، نصرت ظہیر، گلزار دہلوی، راحت اندوری، سلطان اختر، غلام مرتضیٰ راہی، مناظر عاشق ہرگانوی، شوکت حیات، مشرف عالم ذوقی، انجم عثمانی، نسیم عباسی، ترنم ریاض، تبسم فاطمہ، سعدیہ دہلوی، حنیف ترین، مسعود ہاشمی، مولا بخش، رضا حیدر، ظفرالدین، منصور احمد عثمانی، سلطانہ خاتون، فرقان سنبھلی سمیت بہت سے لوگوں کا فرداً فرداً تذکرہ کرتے ہوئے انھیں نم آنکھوں سے گلہائے عقیدت پیش کیے۔ ڈاکٹر افشاں ملک نے کورونا کے دردناک دور کو یاد کرتے ہوئے کہا کہ اس عہد میں بنات نے بھی اپنے کئی اراکین کو کھو دیا۔ اس ذیل میں انھوں نے شمشاد جلیل، تبسم فاطمہ اور ترنم ریاض کا خصوصیت سے تذکرہ کیا۔ معین شاداب نے کہا کہ کووڈ کے زمانے میں بڑی تعداد میں علمی و ادبی شخصیات کے چلے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے اس کا پر ہونا آسان نہیں ہے۔ انھوں نے کہا کہ یہ پورا عہد اور حالات دراصل انسانیت کا امتحان تھا۔ انھوں نے کہا کہ دو برس کے حالات کے زیر اثر 'کورونائی ادب' بھی وجود میں آیا ہے۔ معین شاداب نے پہلے اجلاس کی نظامت کے فرائض بھی

انجام دیے۔ اس موقعے پر بنات کی صدر نگار عظیم نے تنظیم کی سالانہ رپورٹ بھی پیش کی۔ انھوں نے بنات کے آئندہ کے منصوبوں اور عزائم سے آگاہ کیا۔ انھوں نے بتایا کہ لاک ڈاؤن کے دوران بنات کی بہنوں نے دہلی سمیت کئی ریاستوں میں بنات فاؤنڈیشن کے ایما پر ضرورت مندوں کی امداد کی۔ بنات نے حاجت مندوں کو راشن اور ضرورت کا دیگر سامان مہیا کرایا۔ تعزیتی اجلاس کے بعد 'کورونا اور تانیثی ادب' کے موضوع پر سمپوزیم ہوا۔ جس کی مجلس صدارت میں پروفیسر ابوبکر عباد اور ظہیر برنی شامل تھے۔ غالب اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد مہمان خصوصی تھے۔ اس اجلاس کی نظامت بنات کی نائب صدر عذرا نقوی نے کی۔ اس موقع پر بنات سے وابستہ قلم کاروں نے نثری و شعری تخلیقات پیش کیں۔ سمپوزیم کے حوالے سے ڈاکٹر نگار عظیم نے کہا کہ کورونا کی وبا نے قلم کاروں کو سب سے زیادہ متاثر کیا ہے۔ اس کے اثرات ان کی تخلیقات پر بھی نمایاں ہیں۔ بنات کی نائب صدر عذرا نقوی نے کہا کہ ادیب اب بھی کورونا سے پہنچنے والے صدمے سے باہر نہیں آئے، حالانکہ لوگوں نے اب لکھنا شروع کر دیا ہے اور بہت سے قلم کار اس ہولناک وقت میں بھی لکھ رہے تھے لیکن لکھنے والوں کی جو ذہنی کیفیت ہے وہ ناگفتہ بہ ہے۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے اپنے صدارتی کلمات میں وبائی بیماری کووڈ سے پیدا شدہ حالات کا نسائی ادب پر پڑنے والے اثرات کا جائزہ لیا۔ ابوبکر عباد نے اس جلاس کے دوران پڑھی گئیں تخلیقات کا اجمالی تجزیہ بھی کیا۔ ظہیر برنی نے بنات کی سرگرمیوں کی ستائش کی اور گذشتہ دو برس میں رخصت ہوجانے والے احباب کو یاد کیا۔ ڈاکٹر عقیل احمد نے پیش کی گئی کہانیوں اور شاعری کے حوالے سے تانیثی ادب کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔

اس دوران نعیمہ جعفری پاشا، نگار عظیم، افشاں ملک، شاداب علیم، رضیہ حیدر خاں، ترنم جہاں شبنم، صبیحہ ناہید نے افسانے یا دیگر نثری تخلیقات پیش کیں جب کہ عذرا نقوی، نسیم بیگم، طلعت سروہا، چشمہ فاروقی، سفینہ، امیر نہٹوری اور معین شاداب نے شعری کلام پیش کیا۔ چشمہ فاروقی نے شکریہ کی تحریک پیش کی۔ ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا، ڈاکٹر شاداب علیم، بنات کے یوم تاسیس کے جلسے کی کنوینر تھیں جبکہ منتظمین میں ترنم جہاں شبنم اور ڈاکٹر سفینہ کی خدمات قابل ذکر ہیں۔ شرکا میں غیاث الدین ملک، شاذیہ عمیر، محمد عرفان، شفا فاروقی، سیدہ فرح، شہزاد علوی، طارق وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر ڈاکٹر افشاں ملک کی کتاب 'احمد ندیم قاسمی: شاعر ارض وسما' اور طلعت جہاں سروہا کے افسانوی مجموعے 'دردِ صحرا' اور شعری مجموعے 'کاوشِ طلعت' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔

پریس ریلیز: معین شاداب، دہلی، 2 نومبر 2021

پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر کی یاد میں ویبینار

نئی دھلی: آر جے ایس کے زیر اہتمام آزادی کی امرت کہانی ویبینار کے مہمان خصوصی پروفیسر کے جی سریش (وائس چانسلر ماکھن لال چترویدی نیشنل یونیورسٹی آف جرنلزم) نے کہا کہ تحریک آزادی میں صحافیوں نے اردو صحافت کو قوم پرستی کی خاطر ہتھیار بنایا۔ حب الوطنی یا اردو کو مذہب سے جوڑنا سراسر غلط ہے۔ پدم شری پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ زبانوں کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہر مذہب کو زبانوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ اردو زبان ہندوستان میں پیدا ہوئی اور پرورش پائی اور تحریک آزادی میں حصہ لیا۔ اس میں مولوی محمد باقر کی قربانی کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ آر جے ایس نیشنل ویبینار کے کلیدی اسپیکر صحافی اور ادیب اروند کمار سنگھ نے کہا کہ اردو صحافت نے آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ پہلے شہید صحافی مولوی محمد باقر کی قربانی کو یاد کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔ آر جے ایس قومی ویبینار کے مہمان اسپیکر معصوم مراد آبادی نے افتتاحی ریمارکس میں کہا کہ آزادی کی پہلی جنگ اردو زبان میں لڑی گئی تھی اور اس زبان کے صحافیوں نے ملک کی حفاظت کے لیے اپنی جانیں دیں۔ اس میں تمام مذاہب کے لوگ تھے۔ یہ کہنا کہ اردو ایک خاص مذہب کے لوگوں کی زبان ہے سب سے بڑا ظلم ہے۔ پہلا اردو اخبار جام جہاں نما 1822 میں کولکاتا سے پنڈت ہری ہر دت نے نکالا اور اس کے ایڈیٹر پنڈت سدا سکھ تھے۔ پہلا صحافی جسے 1857 کی بغاوت میں انگریزوں نے سزائے موت سنائی تھی وہ دہلی اردو اخبار کے ایڈیٹر مولوی محمد باقر تھے۔ اس ویبینار کے کنوینر وجے کمار منا تھے جب کہ نظامت انکل شرما نے کی۔ اس موقعے پر سرسید احمد خان کو ان کے یوم پیدائش کے حوالے سے خراج عقیدت پیش کیا گیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 اکتوبر 2021

تحریک آزادی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو

نئی دھلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ نے نہ صرف تحریک آزادی میں اہم کردار ادا کیا ہے، بلکہ قومیت کے اس جدید تصور کو تقویت بخشی جس کی بنا پر ہندوستان کا شمار آج دنیا کی بڑی اور مستحکم جمہوریتوں میں ہوتا ہے۔ یہ بات جے این یو کے استاذ پروفیسر انور پاشا نے شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام آزادی کے مہوتسو کے موقعے پر، تحریک آزادی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو کے زیر عنوان آن لائن مذاکرے میں کہی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے وابستہ معروف محقق اور نقاد پروفیسر قمرالہدیٰ فریدی نے کہا کہ آزادی کے تصور کا جو خمیر ہے، اس کو ہم جامعہ میں چلتی پھرتی صورت میں دیکھ سکتے ہیں۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے صدارتی خطاب میں کہا کہ آزادی، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور اردو ایک ایسا مثلث ہے جو ایک دوسرے کے بغیر مکمل نہیں ہوسکتا۔ صدر شعبۂ اردو، اودے پور یونیورسٹی پروفیسر حدیث انصاری نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ جامعہ بہت سی پریشانیوں سے گزرا، لیکن آج ہر میدان میں اپنی شناخت قائم کر چکا ہے۔ پروفیسر ابوبکر عباد نے مذاکرے میں گفتگو کے دوران کہا کہ ہندوستان کے دو ادارے جن کا براہِ راست تعلق تحریک آزادی اور اردو سے رہا ہے دارالعلوم دیوبند اور جامعہ ملیہ اسلامیہ ہیں۔ جامعہ کے تمام بانیان صاحب تصنیف تھے اور ان کے بغیر اردو کی تاریخ ناقص ہے۔ صدر شعبۂ اردو، مولانا آزاد کالج کولکاتا ڈاکٹر دبیر احمد نے کہا کہ اردو کے فروغ میں جامعہ نے جو کردار ادا کیا ہے اگر ہم چند ابتدائی ناموں پر غور کریں تو ان سب کا تعلق بنیادی طور پر کہیں نہ کہیں اردو سے ہی ہے۔ مذاکرے کی نظامت کے فرائض کنوینر پروگرام ڈاکٹر شاہ عالم نے انجام دیے۔ شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر مشیر احمد نے شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میراوطن' دہلی، 29 اکتوبر 2021

امیر خسرو یادگاری خطبہ

نئی دھلی: نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے زیر اہتمام بہ اشتراک غالب انسٹی ٹیوٹ امیر خسرو یادگاری خطبہ بعنوان 'آثار امیر خسرو کے چند مخطوطات بیرونی لائبریری میں'

اور ازبکستان کے خسرو شناس' کا اہتمام کیا گیا۔ کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف محقق و دانشور پروفیسر چندر شیکھر نے کہا کہ امیر خسرو کا نام ہندوستان ہی نہیں، پورے برصغیر اور وسط ایشیا میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں ہندوستانی تہذیب و ثقافت کو پیش کر کے ایک شاعر اور عالم کا کردار ادا کیا ہے۔ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں ان کے آثار محفوظ ہیں۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ پوری دنیا ان کی استادی کی قائل ہے۔ صدارتی کلمات ادا کرتے ہوئے نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے صدر پروفیسر شریف حسین قاسمی نے کہا کہ پروفیسر چندر شیکھر کے ساتھ کام کرنے کا میرا تجربہ بڑا خوشگوار رہا ہے وہ ہمیشہ ایسے موضوعات اٹھاتے ہیں جن کی طرف یا تو توجہ نہیں کی گئی یا نہایت اجمالی نظر ڈالی گئی ہے۔ وہ ازبکستان میں ہندوستان کے ثقافتی امور کے انچارج رہ چکے ہیں اور انھوں نے وہاں کے کتب خانوں اور خسرو شناسوں سے جو معلومات حاصل کیں آج انھیں یہاں پیش کر کے ہم سب کے لیے استفادے کا موقع فراہم کیا گیا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور نیشنل امیر خسرو سوسائٹی کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ پروفیسر چندر شیکھر ان چند محققین میں ہیں جو فارسی اور اردو کی کلاسیکی روایت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ پروفیسر شریف حسین قاسمی اور پروفیسر چندر شیکھر کی موجودگی نے آج کے اس یادگاری خطبے کو اور بھی یادگار بنا دیا ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 26 اکتوبر 2021

علامہ شبلی نعمانی: افکار و اصلاحات

نئی دہلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹو اسٹڈیز کے زیر اہتمام 'علامہ شبلی نعمانی حساس مفکر، افکار و اصلاحات' کے عنوان

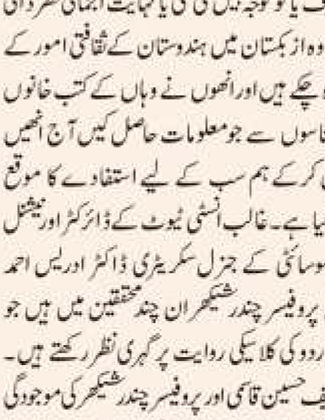

سے دو روزہ قومی سمینار کا انعقاد عمل میں آیا جس میں ملک کی نمایاں علمی شخصیات نے اپنے مقالات پیش کیے۔ مہمان خصوصی کی حیثیت سے زوم کے ذریعے مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی ناظم ندوۃ العلما نے شرکت کی، اپنے خطاب میں انھوں نے کہا کہ بلاشبہ علامہ شبلی نعمانی عہد جدید کے نامور مفکر اور انشاپرداز تھے۔ ضرورت ہے کہ آج کے دور میں ان کے نظریات، ان کے افکار و خیالات سے جدید نسل کو آگاہ کیا جائے۔ پروفیسر سعود عالم قاسمی نے خطبہ استقبالیہ پیش کیا۔ ڈاکٹر محمد منظور عالم نے آخری سیشن کی صدارت کرتے ہوئے کہا کہ علامہ شبلی نعمانی مغربی تہذیب اور اس کے ادب سے کبھی مرعوب نہیں ہوئے۔ پروفیسر سید جمال نے موضوع کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ علامہ شبلی نعمانی کی پیدائش اعظم گڑھ ضلع کے ایک گاؤں بندول جیراج پور میں ہوئی تھی۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی پر مولوی فاروق چریاکوٹی سے حاصل کی۔ 1876 میں حج کے لیے تشریف لے گئے۔ وکالت کا امتحان بھی پاس کیا اور وکالت بھی کی مگر اس پیشہ سے دلچسپی نہ ہونے کے سبب ترک کردی۔ علی گڑھ گئے تو سرسید احمد خان سے ملاقات ہوئی۔ یہیں سے شبلی نے علمی و تحقیقی زندگی کا آغاز کیا۔ 1898 میں ملازمت ترک کر کے اعظم گڑھ آ گئے۔ 1913 میں دارالمصنفین کی بنیاد ڈالی۔ 1914 میں انتقال ہوا۔ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی جنرل سکریٹری جنرل اسلامک فقہ اکیڈمی نے افتتاحی خطاب کرتے ہوئے علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت، علمی خدمات اور فکری رجحانات پر تفصیلی گفتگو کی۔ مولانا تقی الدین ندوی معتمد تعلیم دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ نے کلیدی خطاب میں علامہ شبلی نعمانی کی ہمہ جہت شخصیت کو اختصار سے پیش کیا۔ خاص طور پر انھوں نے کہا کہ شبلی کا شمار اردو تنقید کے بنیاد گزاروں میں ہوتا ہے۔ ان کی شخصیت اردو دنیا میں بطور شاعر، مورخ، سوانح نگار اور سیرت نگار بھی مسلم ہے۔ شبلی کے تنقیدی نظریات و افکار مختلف مقالات اور تصانیف میں بکھرے ہوئے ہیں۔ افتتاحی سیشن کی صدارت پروفیسر زیڈ ایم خان نے کی، اس کے علاوہ مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی سمیت متعدد اسکالروں نے اپنے مقالات پیش کیے۔ پروفیسر حسینہ حاشیہ نے شکریہ ادا کیا جب کہ مولانا شاہ اجمل فاروق ندوی نے نظامت کا فریضہ انجام دیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 26 اکتوبر 2021

جھارکھنڈ میں اردو زبان: مسائل و امکانات

نئی دہلی: کل ہند انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کی جانب سے جاری آن لائن قومی مذاکرے کے سلسلے کے تحت آج 'جھارکھنڈ میں اردو زبان: مسائل و امکانات' کے موضوع پر قومی مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس میں ملک اور بیرون ملک سے کثیر تعداد میں اردو کے اساتذہ اور ادیبوں نے شرکت کی۔ مذاکرے کے صدر پروفیسر ابوذر عثمانی سابق صدر شعبۂ اردو رانچی یونیورسٹی نے جھارکھنڈ میں اردو کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ اگرچہ ریاست میں اردو کو مختلف حوالوں سے مسائل درپیش ہیں لیکن ہم اگر جمہوری طریقے سے حکومت تک اپنے مسائل سے متعلق آواز پہنچا سکیں تو یقیناً ہمیں کامیابی حاصل ہوگی۔ مذاکرے کے مہمان خصوصی اور معروف ناقد و مفکر پروفیسر احمد سجاد سابق صدر شعبۂ رانچی یونیورسٹی نے تفصیل سے اردو کے مسائل کا ذکر کرتے ہوئے اردو والوں کو دستیاب موجودہ سہولتوں سے استفادے پر زور دیا اور کہا کہ ہمیں 'اگنو اور این آئی او ایس جیسے بڑے قومی تعلیمی اداروں میں موجودہ اردو تعلیم کے مواقع کی جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے کیونکہ اردو والوں کے لیے ان اداروں میں تعلیم کی بڑی گنجائشیں موجود ہیں۔ کل ہند انجمن اساتذۂ اردو جامعات ہند کے کارگزار صدر پروفیسر انور پاشا، سابق چیئرمین سینٹر آف انڈین لینگویجز، جواہرلال نہرو یونیورسٹی نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ جھارکھنڈ میں اردو کے فروغ کے لیے لازمی ہے کہ مختلف سطحوں پر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں اردو کی خالی اسامیوں کو پر کیا جائے اور ریاست میں حکومت کی جانب سے اردو ڈائرکٹوریٹ، اردو اکادمی وغیرہ جیسے اہم ادارے قائم کیے جائیں۔ مذاکرے کے مہمان شرکا میں پروفیسر منظر حسین، سابق شعبہ اردو رانچی یونیورسٹی نے کہا کہ اگرچہ ریاست میں اردو کے سلسلے میں حالات دشوار ہیں لیکن ہم ہرگز مایوس نہیں ہیں۔ اردو طبقے کی جدوجہد رنگ لائے گی اور مسائل حل ہوں گے۔ دوسرے مہمان پروفیسر سرور ساجد نے کہا کہ ہمیں اپنا محاکمہ کرنا چاہیے کہ ہماری جانب سے کیا کوتاہیاں ہیں اور اردو کی بقا اور فروغ کے لیے ہم کتنے سنجیدہ ہیں۔ 'عالمی فلک' دھنباد کے ایڈیٹر جناب احمد نثار صاحب نے کہا کہ اردو کی بقا کے لیے ہم اردو والوں کا سرگرم ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر مبین قریشی نے اسکولوں کی سطح پر اردو تدریس کے مسائل کو سنجیدگی سے لینے کی ضرورت پر زور دیا اور کہا کہ اسکولوں کے معیار سے ہی کالج اور یونیورسٹی کی سطح پر اردو تعلیم کا معیار وابستہ ہے۔ مذاکرے کی نظامت کے فرائض بے حد خوش اسلوبی سے انجام دیتے ہوئے پروفیسر زین رامش، سابق صدر شعبۂ اردو ونوبا بھاوے یونیورسٹی ہزاری باغ نے اپنی گفتگو میں کہا کہ کل ہند انجمن اساتذہ اردو ہندی کی نئی قیادت کی سرگرمیاں حوصلہ افزا

ہیں۔ اخیر میں انجمن کے قومی کوآرڈی نیٹر پروفیسر محمد کاظم نے جھارکھنڈ میں اردو کے مسائل پر روشنی ڈالتے ہوئے تمام مہمانوں اور شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 اکتوبر 2021

اردو شاعری تقسیم کے بعد

نئی دھلی: تقسیم ہند کے بعد کے اردو ادب کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ تقسیم نے سماج، سیاست اور تہذیب پر جو اثرات مرتب کیے اس کا گہرا مطالعہ کیا جائے۔ اس سانحے نے اردو کا سارا منظرنامہ ہی سرے سے بدل دیا۔ تقسیم سے قبل اردو زبان کا قاری ایک وسیع دنیا کا باشندہ تھا لیکن اس کے بعد اس کا دائرہ سکڑ گیا۔ لیکن اس کے بعد جدیدیت نے سیاسی، سماجی اور اخلاقی اقدار سے انکار کرتے ہوئے صرف ادبی اقدار پر ہی اصرار کیا۔ 1980 کے بعد ہندوستان اور پاکستان کے ادب میں نمایاں فرق نظر آتا ہے۔ معاصر شاعری دنیا کو ایک پیچیدہ نظام کی صورت میں دیکھتی ہے۔ اس کا نقطۂ نظر یوٹوپیئن Utopian نہیں بلکہ ڈس ٹوپیئن Distopian ہے۔ ان خیالات کا اظہار شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے زیر اہتمام آن لائن بین الاقوامی توسیعی خطبے میں پرنسٹن یونیورسٹی نیوجرسی، امریکہ، کی استاذ ڈاکٹر فوزیہ فاروقی نے 'اردو شاعری تقسیم کے بعد' کے موضوع پر خطاب کرتے ہوئے کیا۔ صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے صدارتی کلمات میں کہا کہ ادب کی دنیا میں تخلیق پر تنقید کا غلبہ اور نقاد کی اجارہ داری کوئی فال نیک نہیں۔ ایک سچا تخلیق کار کسی منظم و منصوبہ بند تحریک و رجحان کا اسیر نہیں ہوسکتا۔'' توسیعی خطبے کے کنوینر پروفیسر خالد جاوید نے ڈاکٹر فوزیہ فاروقی کا مفصل تعارف اور استقبال کرتے ہوئے کہا کہ جنوب ایشیائی زبانوں کے ادب پر فوزیہ فاروقی کی نظر بہت گہری ہے۔ وہ ادب کے سیاسی اور تہذیبی تناظرات کا بہت بسیط ادراک رکھتی ہیں۔ بطور خاص انھوں نے تقسیم کے حوالے سے ہند و پاک کی مختلف زبانوں کے ادب کا بصیرت افروز تقابلی مطالعہ کیا ہے۔ پروفیسر احمد محفوظ نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ترقی پسند تحریک نے کھلم کھلا ادبی قدروں کو ثانوی درجے کی چیز قرار دیتے ہوئے ادب کو طبقاتی کشمکش اور مخصوص نظریے کے پروپیگنڈے کا ہتھکنڈہ بنادیا۔ جدیدیت نے ادب کی ادبیت کو ازسرنو بحال کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ خطبے کے سامعین میں پروفیسر مہرافشاں فاروقی (امریکہ)، ڈاکٹر آفتاب احمد (امریکہ)، ڈاکٹر راجن کلیانی (امریکہ)، پروفیسر نجمہ رحمانی (دہلی یونیورسٹی)،

پروفیسر محمود کاظمی (حیدرآباد) وغیرہ نے ڈاکٹر فوزیہ فاروقی کے اس خطبے کو نہایت بحث انگیز قرار دیتے ہوئے اہم سوالات قائم کیے۔ نظامت کے فرائض ڈاکٹر ثاقب عمران نے انجام دیے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 اکتوبر 2021

داستان: فن و روایت

نئی دھلی: قصہ انسانی زندگی سے جڑی ہوئی چیز ہے۔ قصہ گوئی کی تاریخ اتنی ہی قدیم ہے جتنی انسانوں کی تاریخ۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ داستان بنتی کیسے ہے؟ ایک شخص کوئی واقعہ دیکھتا ہے اور وہ واقعہ ختم ہوجاتا ہے لیکن دوسروں تک واقعہ پہنچانے کے لیے وہ شخص اس واقعہ کو دہراتا ہے اور یہیں سے قصہ گوئی شروع ہوجاتی ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقد آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کے مشترکہ اجلاس میں 'داستان: فن اور روایت' کے موضوع پر خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر ابن کنول نے ان خیالات کا اظہار کیا۔ انھوں نے مزید کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ کی جانب سے منعقد آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کامیاب ہورہے ہیں۔ کووڈ کے زمانے میں جب لوگ اپنے اپنے گھروں سے کم نکل رہے ہیں تو برقی وسیلہ ہی اساتذہ اور ادیبوں کو سرگرم رکھنے کا ایک طریقہ ہوسکتا ہے۔ غالب انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر ڈاکٹر ادریس احمد نے کہا کہ ہمیں خوشی ہے کہ غالب انسٹی ٹیوٹ نے آن لائن اردو، فارسی اور موسیقی کلاسز کی ابتدا کی تھی، وہ نہایت کامیابی کے ساتھ جاری ہیں۔ ہم ہر ماہ تینوں کلاسز کا ایک مشترکہ اجلاس منعقد کرتے ہیں اور کسی اہم موضوع پر لکچر یا ثقافتی پروگرام منعقد کرتے ہیں تاکہ طلبا زبان کے ساتھ ساتھ کلچر کو بھی سمجھ سکیں۔ آج کے لکچر کے لیے ہم نے فن داستان کو منتخب کیا ہے اور اس موضوع پر پروفیسر ابن کنول کی گفتگو سند کا درجہ رکھتی ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 اکتوبر 2021

جی ڈی چندن یادگاری خطبہ

نئی دھلی: اردو بطور زبان کے مقبول ہورہی ہے، لیکن اس کا رسم الخط دن بہ دن محدود ہورہا ہے۔ اردو کے سامعین بڑھ رہے ہیں، لیکن قارئین کی تعداد میں کمی واقع ہورہی ہے، جو ایک تشویش ناک صورت حال ہے۔ ہم سب کو مل کر اردو رسم الخط کو بچانے کے جتن کرنے چاہئیں، کیونکہ رسم الخط کے بغیر کسی بھی زبان کا کوئی مستقبل نہیں ہوتا۔ ان خیالات کا اظہار سینئر صحافی اور ادیب معصوم مرادآبادی نے یہاں جی ڈی چندن میموریل لکچر دیتے ہوئے کیا۔ غالب اکیڈمی نئی دہلی کے زیر اہتمام منعقد اس تقریب کے شروع میں اکیڈمی کے سکریٹری ڈاکٹر عقیل احمد نے جی ڈی چندن کی صحافتی اور ادبی خدمات کا تذکرہ کیا۔ واضح رہے کہ جی ڈی چندن اردو کے جید صحافی اور محقق تھے اور انھوں نے اردو صحافت کے کئی پہلوؤں پر گراں قدر تحقیقی کام کیے۔ 'اردو صحافت کو درپیش چیلنجز' کے عنوان سے جی ڈی چندن یادگاری خطبہ پیش کرتے ہوئے معصوم مرادآبادی نے ملک گیر سطح پر اردو اخبارات و جرائد کی صورت حال کا جائزہ لیا۔ انھوں نے کہا کہ کسی بھی زبان کی صحافت کی ترقی دراصل اس زبان کی ترویج و اشاعت سے مربوط ہوتی ہے۔ اگر زبان ترقی کرتی ہے تو صحافت میں بھی چار چاند لگتے ہیں اور اگر زبان روبہ زوال ہوتی ہے تو صحافت بھی پیچھے چلی جاتی ہے۔ انھوں نے کہا جن صوبوں میں اردو تعلیم کا خاطر خواہ بندوبست ہے، وہاں اردو صحافت ترقی کررہی ہے، لیکن جہاں اردو تعلیم کا نظام تہس نہس ہوگیا ہے، وہاں اردو اخبارات بھی دم توڑ رہے ہیں۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان صوبوں میں اردو کے نئے قاری نہیں پیدا ہورہے ہیں۔ معصوم مرادآبادی نے کہا کہ اردو صحافت کے سامنے ایک اور مسئلہ بگڑتی ہوئی زبان کا ہے۔ نئے صحافی زبان و بیان کے معاملے میں حساس نہیں ہیں اور وہ دوسری زبانوں کے غیر مانوس الفاظ کو خبروں میں استعمال کررہے ہیں جس سے قارئین کا ذائقہ بگڑ رہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ نئے صحافیوں کی تربیت بھی ایک بڑا مسئلہ ہے کیونکہ بیشتر نوجوان اردو صحافت کو ایک پروفیشن کے طور پر اختیار نہیں کرتے بلکہ وہ وقت گزاری کے لیے اس سے وابستہ ہوتے ہیں۔ انھوں نے تجویز پیش کی کہ ملک کے مختلف حصوں میں نئے اردو صحافیوں کے لیے ورکشاپ منعقد ہونی چاہئیں تاکہ ان کی زبان، ذہن اور ضمیر تینوں کی تربیت ہوسکے، کیونکہ اردو صحافت آج بھی ایک پروفیشن سے زیادہ مشن کا درجہ رکھتی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 10 اکتوبر 2021

نیرنگ لال سرحدی: فن و شخصیت

نئی دھلی: ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی اور نیرنگ سرحدی بزم ادب میموریل فاؤنڈیشن، کناڈا کے زیر اہتمام 'نیرنگ لال سرحدی: فن و شخصیت' پر ادبی مذاکرے اور توسیعی خطبے کا انعقاد کیا گیا۔ نیرنگ لال سرحدی کی زندگی

کے بہت سارے پہلو ہیں، ان میں سب سے اہم اور یادگار پہلو ان کا ادبی فن پارہ ہے جو شعر اور نثر کی شکل میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ نیرنگ سرحدی نے غزل، نظم، افسانے، خطوط اور دیگر اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ نیرنگ سرحدی کی زندگی گویا ایک انجمن کی تھی جس میں مختلف اصناف جگنو کی طرح جگمگا رہی تھیں۔ نیرنگ سرحدی کی زندگی پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے صاحب زادے نریش نارنگ نے کہا کہ نیرنگ سرحدی کی پوری زندگی گنگا جمنی تہذیب کے لیے وقف تھی، ان کے خدوخال کا تعارف پیش کرتے ہوئے موصوف نے کہا کہ انھیں دیکھ کر برصغیر کی تہذیبی تاریخ یاد آجاتی تھی۔ اس ادبی مذاکرے کی ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے روح رواں پروفیسر خواجہ محمد اکرام الدین نے صدارت کی جب کہ ڈاکٹر شفیع ایوب نے نظامت کی۔ مقرر خصوصی کی حیثیت سے ڈاکٹر سید تقی عابدی نے توسیعی خطبہ پیش کیا۔ ڈاکٹر تقی عابدی نے بڑی تفصیل سے نیرنگ سرحدی پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ ان کی زندگی کے کئی پہلو ہیں جن میں غزل، نظم، قطعات، رباعیات، شخصی مرثیے، فارسی شاعری، خطوط وغیرہ شامل ہیں۔ نیرنگ سرحدی پر اظہار کرتے ہوئے نیہا ٹھاکر داس نے کہا کہ دادا کی ادبی وراثت کو ہم سب بہت آگے لے کر جائیں گے تاکہ ان کی تخلیقات سے پوری دنیا روشناس ہوسکے۔ ساتھ ہی نیہا نے کہا کہ نیرنگ سرحدی کی پوری زندگی گنگا جمنی تہذیب اور اردو تہذیب کے لیے وقف تھی، اس لیے ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم سب اسی مشن سے جڑ کر انھیں بہترین خراج عقیدت پیش کریں۔ ادبی مذاکرے میں شامل مقررین کی آرا سے قبل نیرنگ لال سرحدی کی خدمات کے اعتراف میں ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، نئی دہلی نے انھیں 'محب اردو ایوارڈ' سے سرفراز کیا۔ ساتھ ہی ایک اہم تحقیقی کتاب 'تعمیر بقا' کی رسم رونمائی بھی عمل میں آئی۔ پروفیسر خواجہ اکرام نے اس کتاب پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر سید تقی عابدی نے اردو دنیا کے سامنے ایک نایاب شے پیش کی ہے جو کہ نیرنگ سرحدی کی ادبی کاوش ہے۔ یقیناً اردو دنیا اس تحقیق سے استفادہ کرے گی۔ اس ادبی مذاکرے میں مقررین کی حیثیت سے پروفیسر شہاب عنایت ملک، ڈاکٹر اطہر فاروقی، جناب خلیل الرحمٰن ایڈوکیٹ، جناب ناصر عزیز وغیرہ نے شرکت کی۔ مقررین نے نیرنگ لال سرحدی: فن وشخصیت پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے کہا کہ نیرنگ لال سرحدی کی تخلیقات اور تصنیفات یقیناً اردو ادب میں اہم اضافہ ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ نیرنگ لال سرحدی کی ادبی جہات کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے تاکہ نئی نسل نیرنگ سرحدی کی ادبی خدمات سے استفادہ کرسکے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 اکتوبر 2021

جامعہ ہمدرد میں خطاطی ورکشاپ

نئی دهلی: ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ہمدرد اور ایران کلچر ہاؤس نئی دہلی کے اشتراک سے ڈپارٹمنٹ کے سمینار ہال میں خطاطی، ورکشاپ اور نمائش کا انعقاد کیا گیا، جس کا افتتاح محترمہ سیدہ مہر تاج بیگم، ڈین اسکول آف ہیومنیٹیز اینڈ سوشل سائنسز نے کیا اور صدارت کے فرائض ایران ایمبیسی کے کلچرل کونسلر ڈاکٹر محمد علی ربانی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر کلچرل کونسلر ڈاکٹر محمد علی ربانی، ایران کے مشہور خطاط ڈاکٹر مسعود ربانی، پروفیسر سید عارف زیدی، ڈین اسکول آف یونانی میڈیکل ایجوکیشن اور پروفیسر غلام یحیٰی انجم نے اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ پروفیسر غلام یحیٰی انجم کی تصنیف 'سفرنامہ ایران' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ پروگرام کی نظامت کے فرائض ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے انجام دیے اور انھوں نے کہا کہ مسلمانوں میں زمانہ قدیم سے جس فن کو سب سے زیادہ پسند کیا جاتا ہے وہ خطاطی ہے اور اس کی وجہ قرآن سے اس کا تعلق ہے۔ آخر میں پروگرام کے کوآرڈی نیٹر ڈاکٹر محمد احمد نعیم نے جملہ مہمانان گرامی، ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے جملہ اساتذہ کرام اور طلبہ وطالبات کا شکریہ ادا کیا۔ کیلی گرافی ورکشاپ اور نمائش کے اس شاندار پروگرام میں پروفیسر اجے کمار سنگھ، پروفیسر سنجے دوبے، ڈاکٹر محمد اسلم، ڈاکٹر انور حسین خان، ڈاکٹر آبرو امان اندرابی، ڈاکٹر وارث مظہری، ڈاکٹر نجم السحر، شہاب الدین، محمد کمال، محمد ناصر اور ڈپارٹمنٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے طلبہ وطالبات کثیر تعداد میں بطور خاص موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 نومبر 2021

عصرِ حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت ومعنویت

نئی دهلی: بزم اصحاب قلم، بدایوں کے زیر اہتمام عصر حاضر میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت ومعنویت موضوع پر آن لائن سیمنار کا انعقاد 14 اکتوبر کو عمل میں آیا۔ سیمنار کی صدارت مشہور ادیب، نقاد، محقق پروفیسر صغیر افراہیم سابق صدر شعبۂ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ نے کی۔ انھوں نے موجودہ دور میں علی گڑھ تحریک کی اہمیت و افادیت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ ہم جو وقت کی رفتار سے آہستہ چال چل رہے ہیں، ہمیں اپنی ترقی کی رفتار کو بڑھاتے ہوئے اس وقت جدید علوم حاصل کرنے کی ضرورت محسوس کرنی چاہیے۔ مثال میں انھوں نے سرسید کی اس کانفرنس کا حوالہ دیا جس میں انھیں 1863 میں کلکتہ مدعو کیا گیا تھا۔ اس کانفرنس میں سرسید نے وقت کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے انگریزی تعلیم کی اہمیت وافادیت اور اس کی وجوہات پر زور دیا تھا۔

افضال عثمانی نے کہا کہ اخلاقیات اور رواداری علی گڑھ تحریک کا حصہ ہیں۔ سرسید نے لوگوں کو انسانیت کا پیغام دیا۔ لہٰذا ہمیں بھی یہ بات دھیان میں رکھتے ہوئے ترقی کی راہوں پر گامزن ہونا چاہیے۔ مجیب اختر نے کہا کہ آج سرسید کی تحریک اور نظریات کے احیا کی شدید ضرورت ہے۔ عاطف حنیف نے سرسید کے ساتھ ان کے دوست زین العابدین کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ حنا آفریں نے سرسید کے پیغامات ونظریات کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ ہم کو وقت اور حالات کے مطابق تبدیلی کرنے سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔ ہمیں وقت کی اہم ضرورت جدید تعلیم کی جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ زیب النسا زیبی نے سرسید کے کارناموں اور تصانیف کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ سرسید کی فکر نے لوگوں کو سفید سامراجیت سے خوف زدہ ہونے کے بجائے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنی اہمیت کا احساس دلانے کی ترغیب دی۔ انھوں نے مزید کہا کہ علی گڑھ تحریک نے قوم کے لوگوں کو تعلیم کی اہمیت اور جدید سائنٹفک خیالات سے روشناس کرایا۔

منظوم خراج تحسین پیش کرنے والوں میں مشہور شاعر خمار دہلوی اور احمد علی برقی اعظمی نے اپنے اشعار سے محفل کو لطف اندوز کیا۔ آخر میں ڈاکٹر ذوالفقار، بانی ہم سفر ایجوکیشنل وسوشل ویلفیئر سوسائٹی، علی گڑھ نے صدر محترم، مقررین اور تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ نظامت کے فرائض مشہور ادیب وشاعر ڈاکٹر کمال اختر نے انجام دیے۔

پریس ریلیز: حنا آفریں، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی 20 اکتوبر 2021

اترپردیش

قرۃ العین حیدر کے فکشن کے نسائی کردار

میرٹھ: نسائی شعور کے حوالے سے سماج کا جو ڈھانچہ

ہے اس میں مرد، عورت، عزیز، اقارب، رشتہ دار سب شامل ہوتے ہیں مگر ان میں عورت ہی جبر کا شکار ہوتی

ہے۔ مختلف تعلیمی اور سماجی ادوار میں مردانہ حکومت اور خواتین کی مظلومیت کو بخوبی پیش کیا گیا ہے۔ ’آگ کا دریا‘ نے قرۃ العین حیدر کو بڑے مقام پر پہنچا دیا ہے۔ یہ الفاظ تھے صدر شعبۂ اردو، الہ آباد یونیورسٹی کی پروفیسر شبنم حمید کے جو آیوسا اور شعبۂ اردو کے زیر اہتمام منعقد ’قرۃ العین حیدر کے فکشن کے نسائی کردار‘ موضوع پر اپنی صدارتی تقریر میں آن لائن ادا کر رہی تھیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ان کی تخلیقات سے تحریک اور جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ سماجی شعور ان کی تحریروں میں جلوہ گر ہے اور شخصیت بھی دیگر فکشن نگاروں سے منفرد ہے۔ اس سے قبل پروگرام کا افتتاح چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی کی ویمن سیل کی صدر پروفیسر بندو شرما نے کیا۔ انھوں نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ قرۃ العین حیدر کی تخلیقات سے نسوانی مسائل کو سمجھنے میں آسانی ہو جاتی ہے۔ انھوں نے سماج کے ہر طبقے کے نسوانی کردار کو منفرد انداز میں پیش کر کے تمام خواتین کے درد کو اجاگر کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم نے، شکریہ فرح ناز اور نظامت کے فرائض سیدہ مریم الٰہی نے انجام دیے۔ پروگرام کا تعارف اور اغراض و مقاصد بیان کرتے ہوئے صدر شعبۂ اردو پروفیسر اسلم جمشید پوری نے کہا کہ یہ ہفتہ واری پروگرام خاص طور سے طلبہ و طالبات میں صلاحیت، ان کی فکر اور ان کے عمل میں پختگی لانے کی غرض سے ہر ہفتے منعقد کیا جائے گا۔ ہمارا مقصد طلبہ و طالبات کو ایک پلیٹ فارم پر لا کر ان کے درپیش مسائل کو حل کرنا ہے اور یہ بھی ہمارا مقصد ہے کہ طالب علموں میں تحریری اور تقریری سطح پر بھی بہترین علمی صلاحیت پیدا ہو اور مستقبل قریب میں اپنا شعبے کا اور ملک و قوم کا نام روشن کریں۔ اس موقعے پر اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے، کھن کھن جی گرلز پی جی کالج، لکھنؤ کی صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر ریشما پروین نے کہا کہ قرۃ العین حیدر کے نسوانی کرداروں میں عندلیب، دیپالی، سیتا، رخشندہ وغیرہ میں قرۃ العین حیدر کی جھلک ملتی ہے۔ تمام کرداروں کے ذہن میں تخلیقات کی دنیا آباد ہے۔ تنہائی زندگی کی مشکلات اور تقسیم وطن کا کرب جابجا نظر آتا ہے۔ گوتم بدھ یونیورسٹی، نوئیڈا کی ڈاکٹر ریحانہ سلطانہ نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ خواتین کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور استحصال پر قرۃ العین حیدر نے زوردار قلم اٹھایا ہے۔ ان کے ناولوں اور افسانوں کا اسلوب اتنا منفرد ہے کہ ان پر کوئی خاص لیبل نہیں لگایا جا سکتا۔ وہ الفاظ کا استعمال علامت کے طور پر بھی کرتی ہیں۔ ان کی زیادہ تر تخلیقات میں تقسیم ہند اور ملک کے بٹوارے کے بعد ایک دوسرے سے جدا ہونے والے عزیز و اقارب کی کربناک داستان ہمیں دیکھنے کو ملتی ہے۔ اس موقعے پر ڈاکٹر آصف علی، ڈاکٹر ارشاد سیانوی، محمد شمشاد اور سعید احمد وغیرہ موجود رہے۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 31 اکتوبر 2021

ادب اور سماج کے فروغ میں سرسید کا کردار

میرٹھ: چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی، میرٹھ کے شعبۂ اردو میں سرسید احمد خاں کے یوم پیدائش کے موقعے پر شعبۂ اردو چودھری چرن سنگھ یونیورسٹی میرٹھ، سرسید ایجوکیشنل سوسائٹی اور بین الاقوامی نوجوان اردو اسکالرز ایسوسی ایشن کے مشترکہ اہتمام میں طلبہ کی حوصلہ افزائی کے لیے تحریری اور تقریری مقابلے منعقد کیے گئے، جن میں یونیورسٹی اور ملحقہ کالجز کے طالب علموں نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر ایک سیمینار بعنوان ’ادب اور سماج کے فروغ میں سرسید کا کردار‘ کا افتتاحی اجلاس آن لائن منعقد ہوا جس کی صدارت پروفیسر اختر الواسع نے انجام دی۔ اس اجلاس میں مہمانان خصوصی کی حیثیت سے عارف نقوی جرمنی، پروفیسر یوسف عامر شیخ الجامعہ ازہر یونیورسٹی مصر اور مہمان ذی وقار کے بطور پروفیسر صغیر افراہیم اور خصوصی مقرر کی حیثیت سے پروفیسر محمد کاظم شریک ہوئے۔ جب کہ کلیدی خطبہ پروفیسر شافع قدوائی نے پیش کیا، تعارفی کلمات پروفیسر اسلم جمشید پوری نے اور استقبالیہ کلمات ڈاکٹر شاداب علیم نے اور شکریے کی رسم ڈاکٹر ارشاد سیانوی نے ادا کی اور نظامت کے فرائض ڈاکٹر آصف علی نے انجام دیے۔ اپنے صدارتی خطبہ میں پروفیسر اختر الواسع نے کہا کہ قوم سے تخت و تاج چھن جانے اور معاشرے کے مختلف مصائب میں گھر جانے کے بعد بھی سرسید اور ان کے رفقا نے ایسی عملی کاوشیں اور منصوبہ بندی کی تھی کہ اس سے آنے والی نسلوں کا مستقبل روشن و تابناک ہو سکے۔ پروفیسر شافع قدوائی چیئرمین شعبۂ جرنلزم اینڈ ماس کام علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے اپنے کلیدی خطبے میں کہا کہ سرسید تحریک ہمہ جہت تحریک تھی، اس نے سماج، ادب اور صحافت کے میدان میں نہ صرف اصلاحات کیں بلکہ ان کے باہمی رشتوں کی باریکیوں کو بھی اجاگر کیا۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے کہا کہ 1839 سے 1857 کا زمانہ سرسید کی ذہنی اور فکری نشو و نما کا عہد ہے۔ یہی وہ زمانہ ہے جب سرسید کا واسطہ انگریزوں، انگریزی تعلیم اور تہذیب و تمدن سے پڑا تھا۔ معروف ادیب عارف نقوی نے کہا کہ سرسید جشن کے اس موقعے پر ہمیں اپنا محاسبہ کرنا چاہیے۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 19 اکتوبر 2021

اردو صحافت کے مسائل اور امکانات

مراد آباد: اردو صحافت نے ملک میں جہاں ادبی خدمات انجام دیں وہیں ملک کو آزاد کرانے میں بھی نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو صحافت سیاسی بصیرت کو فروغ دینے کے ساتھ ساتھ ملک میں قومی یکجہتی اور آپسی بھائی چارے کو بڑھانے میں بھی پیش پیش رہی۔ مہاراجہ ہریش چندر ڈگری کالج میں شعبۂ اردو کے زیر اہتمام توسیعی خطبے کا اہتمام کیا گیا جس میں موجود مقررین نے اردو صحافت کے حوالے سے ان خیالات کا اظہار کیا۔ ساتھ ہی اردو صحافت کے مسائل اور امکانات کے موضوع پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ اس پروگرام کا آغاز مہمان خصوصی کی حیثیت سے شریک ڈاکٹر کاویہ سورو رستوگی مینیجر آف ایم ایچ پی جی کالج نے معصوم مراد آبادی اور کالج کے اساتذہ کے ساتھ شمع روشن کر کے کیا۔ سینئر صحافی معصوم مراد آبادی نے کالج کے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے اردو صحافت کی تاریخ پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور کہا کہ یوں تو اردو کا پہلا مطبوعہ اخبار 1822 میں ’جام جہاں نما‘ کے نام سے منظر عام پر آیا لیکن اس سے قبل ہی ہندوستان میں اردو صحافت کا آغاز ہو چکا تھا۔ ایسے کئی قلمی اخبارات کا سراغ ملتا ہے جو مذکورہ اخبار سے قبل دہلی اور ملک کے مختلف گوشوں سے شائع ہو رہے تھے۔ اس طرح ہندوستان میں اردو صحافت کی روایت بہت قدیم ہے۔ مہمان خصوصی ڈاکٹر کاویہ رستوگی نے نئی تعلیمی پالیسی کو سمجھنے اور اس کے مطابق اپنا لائحہ عمل تیار کرنے پر زور دیا۔ ڈاکٹر کاویہ نے اردو صحافت کی اہمیت پر بھی گفتگو کی اور شعبہ اردو کے اساتذہ کو اس موضوع پر پروگرام منعقد کرنے پر مبارکباد پیش کی۔ ڈاکٹر عبدالرب صدر شعبۂ اردو نے سبھی مہمانان کا خیر مقدم کرتے ہوئے شعبۂ اردو کی سرگرمیوں اور کارکردگی کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ گزشتہ سال کی طرح اس سال بھی شعبۂ اردو ایم ایچ کالج کے ہونہار طالب علم فہیم احمد نے روہیل کھنڈ یونیورسٹی سے گولڈ میڈل حاصل کیا اور کئی طالب علموں نے نیٹ امتحان کوالیفائی کیے اور آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ ڈاکٹر اسما عزیز اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو نے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے پروگرام آئندہ بھی منعقد کیے جائیں گے تاکہ طلبہ ماہرین کے علم و فن کے خطاب سے مستفیض ہو سکیں۔ شعبہ اردو کے چند طلبہ نے بھی پروگرام میں اپنے مضامین پیش کیے، آفرین ضمیر احمد نے معصوم مراد آبادی کی خدمات پر روشنی ڈالی، عنبر قریشی نے مراد آباد میں اردو صحافت اور فرحین سیفی نے

ہندوستان میں اردو صحافت اور ارتقا کے عنوان سے اپنے مضامین پیش کیے۔ پروگرام کی صدارت ڈاکٹر سدھیر اروڑا نے کی۔ اپنے صدارتی بیان میں کالج کے تمام اساتذہ بالخصوص شعبۂ اردو کے اساتذہ اور طالب علموں کو مبارکباد پیش کی۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ اس طرح کے پروگرام آگے بھی ہوتے رہنے چاہئیں۔ اس موقعے پر پروفیسر رویش کمار، پروفیسر پرینکا گپتا، منیش بھٹ، ڈاکٹر محمد ایوب، ڈاکٹر اجیت وکشت، ڈی پی پانڈے، ڈاکٹر جتیندر کمار، ڈاکٹر مکیش موہن، ڈاکٹر دھرمیندر، ڈاکٹر کامنی شرما وغیرہ موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 27 اکتوبر 2021

بہار

اردو سیکھنے والوں کو اسناد

پٹنہ: اردو ڈائرکٹوریٹ کے اردو لرننگ سینٹر میں اردو سیکھنے والے 75 افراد کو یہاں ایک جلسے میں اسناد دی گئیں۔ تقریب کا افتتاح کرتے ہوئے محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے اسپیشل سکریٹری ڈاکٹر اپیندر ناتھ پانڈے نے کہا کہ اردو لرننگ کورس اردو ڈائرکٹوریٹ کی ایک خوشگوار پہل ہے۔ اردو دل کی زبان ہے اور اس کا رشتہ دل سے بہت قریب ہے۔ انھوں نے کہا کہ اردو زبان کے ذریعہ ہندوستان کی پوری تہذیب کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے جب کہ عبدالرحمٰن سرور نے کہا کہ اردو ڈائرکٹوریٹ کا اردو لرننگ پروگرام بہت ہی اہم اور قابل قدر ہے۔ مہمان اعزازی ڈاکٹر قاسم خورشید نے کہا کہ ہم اردو کی پرورش نہیں کرتے بلکہ اردو ہماری پرورش کر رہی ہے محکمہ جوائنٹ سکریٹری اور ڈائرکٹر راج بھاشا سمن کمار نے کہا کہ اردو زبان سے میرا رشتہ پرانا ہے۔ یہ ہندوستانی زبان ہے اور یہ زبان ہمارے خون میں رچی بسی ہے۔ معروف ہارٹ سرجن ڈاکٹر اجیت پردھان نے کہا کہ ہندی اور اردو زبان دونوں سگی بہنیں ہیں۔ پروگرام کا آغاز ڈائرکٹر احمد محمود کے تعارفی کلمات سے ہوا۔ اپنے خطاب میں ڈائرکٹر نے اردو لرننگ سینٹر کی غرض و غایت اور اس کی مثبت پیش رفت پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر اردو لرننگ کورس کرنے والے معززین نے بھی اپنے تجربات و تاثرات کا اظہار کیا جن میں جیوتیندر مشر، دلیپ کمار اگروال (بی اے ایس)، امیتابھ پانڈے، سبھاش پاٹھک ضیا، ڈاکٹر رنجیتا تیواری، ایس کے سنہا، ڈاکٹر الکا برما، ممتاز پروین، عالمگیر اور ویر کنور راوت وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر آرتی کماری اور ارادھنا پرساد نے اپنی مترنم آواز میں خوبصورت غزلیں سنائیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اکتوبر 2021

ہندوستانی فن و ثقافت میں ٹیگور کی خدمات

پٹنہ: رابندر ناتھ ٹیگور امن و انسانیت کے مضبوط علمبردار تھے۔ انھوں نے اپنے فکر و نظریات سے ملک کو تعمیر و ترقی کی نئی راہ دکھائی۔ ان خیالات کا اظہار یہاں پروفیسر ممتا داس شرما نے کیا۔ وہ حکومت ہند کی وزارت فن و ثقافت اور مولانا آزاد ہیومینٹیرین ریسرچ فاؤنڈیشن کے اشتراک سے سماجی و ادبی تنظیم 'سالویشن' کے زیر اہتمام 'ہندوستانی فن و ثقافت میں رابندر ناتھ ٹیگور کی خدمات' کے موضوع پر منعقد سمینار کے افتتاحی اجلاس سے صدارتی خطاب کر رہی تھیں۔ انھوں نے کہا کہ ٹیگور نے اپنی شاعری سے ہندوستان کی تہذیب و ثقافت کو نئی جہت عطا کی جب کہ اس سے قبل سمینار کا کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے پروفیسر پرمود کمار نے کہا کہ ٹیگور نے پہلی مرتبہ ہندوستانی تہذیب پر اس قدر توجہ دی کہ اس کے نتیجے میں ایک مضبوط تحریک پیدا ہوئی۔ بہار پبلک سروس کمیشن کے رکن امتیاز احمد کریمی نے کہا کہ ٹیگور ہماری وراثت کا وہ اہم حصہ ہیں جن پر پورے ملک کو ناز ہے۔ ہندوستان ہی نہیں بلکہ بنگلہ دیش اور سری لنکا نے بھی ان کی تحریر کردہ نظموں کو اپنا قومی ترانہ بنایا۔ سمینار کے دوسرے اجلاس کے صدارتی خطاب کے دوران پروفیسر شکیل احمد قاسمی نے کہا کہ ٹیگور نے اپنے فکر و فن سے پوری دنیا کو متاثر کیا۔ نوبل انعام ملنے کے بعد ان کی شخصیت و خدمات کا اعتراف دنیا بھر میں کیا گیا۔ انھوں نے ہندوستان میں اصل ہندوستان کو دریافت کیا اور جدید ہندوستان کی تشکیل میں بنیادی کردار ادا کیا۔ سالویشن کے جنرل سکریٹری ڈاکٹر محمد انظار عالم نے سمینار کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے 'سالویشن' کا مختصر تعارف کرایا اور بتایا کہ تعلیم و تحقیق اور طلبہ کی رہنمائی اس کا اہم مقصد ہے۔ غربت و ناخواندگی وراثت نہیں بلکہ غفلت کا معاملہ ہے۔ اس جمود کو توڑنا سالویشن کا مشن ہے۔ سمینار سے خطاب کرنے والوں میں مولانا مظہر الحق عربی و فارسی یونیورسٹی کے سابق پرو وائس چانسلر پروفیسر توقیر عالم، امارت شرعیہ کے قائم مقام ناظم مولانا شبلی القاسمی، ڈاکٹر ریحان غنی، پروفیسر حامد علی خان، پروفیسر صفدر امام قادری، ڈاکٹر محمد مظہر حسین، ڈاکٹر محمد اجمل، ساگر سرکار، سبحان عثمانی اور ڈاکٹر محمد مرتضیٰ کے نام قابل ذکر ہیں۔ نظامت کے فرائض مشہور اسکالر یعقوب اشرفی نے انجام دیے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 1 نومبر 2021

مدھیہ پردیش

سہ ماہی 'انتساب' کی چالیس سالہ ادبی خدمات

سرونج: سیفی لائبریری میں انتساب پبلی کیشنز کے زیر اہتمام سہ ماہی 'انتساب' کی چالیس سالہ ادبی خدمات پر سمینار اور مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ سمینار کی صدارت دہلی اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین پروفیسر خالد محمود نے فرمائی۔ مہمان خصوصی کے طور پر اقبال مسعود، ضیا فاروقی اور پروفیسر عزیز اللہ شیرانی نے شرکت کی۔ پروفیسر خالد محمود نے کہا آج سرونج سیفی سرونجی کے نام سے جانا جاتا ہے۔ صرف سرونج والے ہی نہیں، اردو والے ان پر جتنا فخر کریں کم ہے۔ سرونج میں نثری رواج 'انتساب' کی وجہ سے ہی عام ہوا ہے۔'' اقبال مسعود نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ سیفی سرونجی اردو کا دامن تھامے تھامے ادبی افق پر سورج کی طرح چمک رہے ہیں۔ سیفی نے سرونج کو اس طرح مالا مال کر دیا ہے کہ تمام اصناف میں اس کا نام آسکے۔ ضیا فاروقی نے کہا کسی زمانے میں سرونج شاہی کپڑوں کے لیے مشہور تھا، اس سے پہلے ٹکسال کے لیے جانا جاتا تھا لیکن آج ادب کے لیے مشہور ہے اور یہ صرف 'انتساب' اور سیفی سرونجی کی وجہ سے ممکن ہوا۔ ظفر صہبائی نے کہا جس طرح فرہاد نے پتھر کاٹ کر اپنا راستہ بنایا، اسی طرح سیفی سرونجی سنگلاخ راستوں کو کاٹ کر اس بلندی تک پہنچے ہیں۔ پروفیسر عزیز اللہ شیرانی نے کہا کہ سیفی سرونجی اردو ادب میں ہی نہیں، بلکہ ہندی ادب میں بھی ایک نمایاں نام ہے۔ سیفی سرونجی نے اظہار خیال کرتے ہوئے کہا کہ میں جو خواب دیکھتا ہوں اس کی تعبیر کے لیے کمر کس لیتا ہوں۔ آخر میں انھوں نے تمام مقالہ نگاروں اور سامعین کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 12 اکتوبر 2021

اعزاز و اکرام

پروفیسر محمد کاظم

نئی دہلی: دی مسلم انسٹی ٹیوٹ، کلکتہ نے سال رواں

سے ڈراما اور تھیٹر کے میدان میں اہم خدمات انجام دینے والی شخصیات کو اعزاز سے نوازنے کا فیصلہ کیا ہے۔ ادارہ ڈراما اور تھیٹر کی دنیا میں عظیم خدمات انجام دینے والوں کو پروفیسر نیاز احمد خاں ایوارڈ سے نوازے گا۔ 2021 کے لیے یہ ایوارڈ اردو تھیٹر کی اہم شخصیت پروفیسر محمد کاظم کو دیا گیا ہے۔ پروفیسر محمد کاظم شعبہ اردو، دہلی یونیورسٹی میں درس وتدریس سے وابستہ ہیں۔ درس وتدریس کے علاوہ ڈراما اور تھیٹر سے بھی ان کی وابستگی ہے۔ انھوں نے اس میدان میں گرانقدر تحقیقی کتابیں لکھی ہیں جن میں بنگال میں نکڑ ناٹک، ہندوستانی نکڑ ناٹک اور اس کی سماجی معنویت، مشرقی ہند میں اردو نکڑ ناٹک اور آج کل اور ڈراما خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ 'ہنرک اہسن کے تین ڈرامے' اور 'ستم کی انتہا کیا ہے' جیسی کتابوں کے ترجمے کیے ہیں۔ ڈراما اور تھیٹر سے متعلق ان کے مضامین ملک و بیرون ملک کے جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ وہ ایک عرصہ تک دہلی یونیورسٹی میں ڈپٹی پروکٹر کے عہدے پر بھی فائز رہے ہیں۔ پروفیسر نیاز احمد خاں اردو ڈرامے کی اس شخصیت کا نام ہے جنھوں نے آزادی کے بعد مغربی بنگال میں اردو ڈراما اور تھیٹر کو سنبھالا دیا۔ ان کے لکھے ہوئے ڈرامے مغربی بنگال کے مختلف علاقوں میں کامیابی سے کھیلے گئے۔ آج بنگال میں اردو ڈرامے سے متعلق جو پہلی نسل نظر آتی ہے وہ سب انھیں کی تربیت یافتہ ہے۔ نیاز احمد خاں نے مولانا آزاد کالج اور مسلم انسٹی ٹیوٹ کو اپنی سرگرمیوں کا مرکز بنایا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 اکتوبر 2021

نصرت عتیق گورکھپوری

گورکھپور: معروف شاعرہ اور 'آرٹ اینڈ کلچر فاؤنڈیشن، گورکھپور' کی جنرل سکریٹری نصرت عتیق کو شہر کی معروف سماجی و ادبی سوسائٹی 'الحاج چودھری عبدالرحمٰن میموریل'

نے سال رواں کا ادبی ایوارڈ زیبائش غزل سے نوازتے ہوئے دلی مسرت کا اظہار کیا ہے۔ نصرت عتیق نے گزشتہ ماہ بیک وقت دو زبانوں میں اپنا شعری مجموعہ 'احساس کی امربیل' کی رسم رونمائی کرکے شہر کی ادبی فضا میں ایک منفرد اور تاریخی نام درج کرایا ہے جو شاید اب تک یہاں کسی نے نہیں کیا۔ نصرت عتیق گزشتہ 22 برسوں سے گیسوئے غزل کو سنوار رہی ہیں۔ ادھر گزشتہ برسوں سے وہ قومی اور بین الاقوامی ادبی محفلوں میں شریک بھی ہورہی ہیں۔ شہر کے ادبی و تاریخی دستاویز میں ان کی شمولیت کو بہت فعال گردانا جارہا ہے، جس کا اعتراف شہر و اطراف کی انجمنیں بھی کررہی ہیں۔ چودھری عبدالرحمٰن میموریل سوسائٹی اس طرح کے انفرادی نوعیت کے کاموں کے لیے اپنی روایت کے مطابق سب کی حوصلہ افزائی کرتی رہی ہے۔ اس بار اس نے نصرت عتیق کو 'زیبائش غزل ایوارڈ' کے لیے منتخب کیا۔ اس سے قبل بھی سوسائٹی ادبی سرگرمیوں اور سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے والوں کو نوازتی رہی ہے۔ اس موقعے پر کئی سماجی تنظیموں کے سربراہان شریک ہوئے۔ اس موقعے پر نصرت عتیق نے اپنے تازہ کلام سے سامعین کو محظوظ بھی کیا۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 14 اکتوبر 2021

مولانا حکیم عبداللہ مغیثی

نئی دهلی: انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز نے نواں آئی او ایس لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات کی بنیاد پر اتفاق رائے سے مولانا حکیم محمد عبداللہ مغیثی کو دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز میں گورننگ کونسل کی ایک میٹنگ منعقد ہوئی، جس میں اتفاق رائے سے مولانا حکیم محمد عبداللہ مغیثی کو دینی و تعلیمی میدان میں نمایاں خدمات کی بنیاد پر ایوارڈ دینے کا فیصلہ ہوا۔ متعدد شخصیات اور اداروں کو نواں ایوارڈ دیے جانے کی تجاویز موصول ہوئی تھیں، جن میں سے آئی او ایس کی گورننگ کونسل نے اس ایوارڈ کے لیے مولانا عبداللہ مغیثی کے نام کا انتخاب کیا۔ انسٹی ٹیوٹ آف آبجکٹو اسٹڈیز کے فائنانس سکریٹری محمد عالم نے بتایا کہ آئی او ایس نے 2006 میں مختلف شعبوں میں کارہائے نمایاں انجام دینے والی شخصیت اور اداروں کو آئی او ایس لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اب تک آٹھ ایوارڈ دیے جاچکے ہیں۔ یہ ایوارڈ ایک مومنٹو، توصیفی سند اور ایک لاکھ روپے کے چیک پر مشتمل ہوتا ہے۔ مولانا حکیم عبداللہ مغیثی کو یہ ایوارڈ تعلیم کے میدان میں نمایاں خدمات کی بنیاد پر دینے کا فیصلہ کیا گیا ہے۔ مولانا عبداللہ مغیثی برصغیر کے نامور عالم دین، معروف ملی رہنما اور متعدد خوبیوں کے حامل ہیں، تعلیمی سماجی اور ملی میدان میں آپ کی خدمات تقریباً ستر برسوں پر محیط ہیں۔ آپ درجنوں تعلیمی اداروں کے بانی اور سرپرست ہیں۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 31 اکتوبر 2021

شمیم امروہوی

امروهه: معروف شاعر اور مداح اہل بیت شمیم امروہوی کی رثائی ادب کے تئیں خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں ڈاکٹر شفاعت فہیم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس سلسلے میں بزم اتحاد اور انجمن فروغ عزا کی جانب سے ایک تقریب کا اہتمام امروہہ کے عزاخانہ چاند سورج محلہ قاضی زادہ میں کیا گیا۔ امام جمعہ مولانا سیادت حسین فہمی نے یہ ایوارڈ شمیم امروہوی کو پیش کیا۔ اس موقعے پر رثائی ادب کے حوالے سے شمیم امروہوی کی قلمی کاوشوں پر روشنی ڈالی گئی۔ صحافی اور شاعر جمال عباس فہمی نے عزائی منظر نامہ پیش کرتے ہوئے کہا کہ ایک ایسے دور میں کہ جب عزائی اقدار کو فراموش کیا جارہا ہے۔ نوحہ خوانی کا معیار زوال پذیر ہے۔ شمیم امروہوی نے حقیقی طرز کے نوحے تحریر کرنے کی روایت کو آگے بڑھایا ہے۔ شمیم امروہوی کو صادقین ایوارڈ سے بھی نوازا جاچکا ہے۔ پروگرام کی نظامت محمد فرقان نے کی۔ شمیم امروہوی کے اعزاز میں منعقدہ اس پروگرام میں ایک محفل منقبت کا بھی اہتمام کیا گیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 اکتوبر 2021

ممتاز ریسرچ ایوارڈ

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی (اے ایم یو) کے شعبۂ ریاضی کے لائق و فائق ریاضی داں پروفیسر قمرالحسن انصاری کو اے ایم یو نے 'ممتاز ریسرچ ایوارڈ 2021' سے نوازا ہے۔ انھیں سائنس کے زمرے سے مذکورہ ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر محمد امین خاں (اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ کیمسٹری) اور ڈاکٹر محمد طارق (اسسٹنٹ پروفیسر، الیکٹریکل انجینئرنگ شعبہ کو مشترکہ طور سے سائنس کے زمرے سے اور ڈاکٹر محمد ارشد باری (اسسٹنٹ پروفیسر)، (فزیکل ایجوکیشن شعبہ) کو آرٹس و سوشل سائنس کے زمرے سے 'ینگ ریسرچ ایوارڈ' کے لیے منتخب کیا گیا ہے۔ انوویشن کونسل اینڈ یونیورسٹی انکیوبیشن سینٹر، اے ایم یو کے اعلان کے مطابق پروفیسر قمرالحسن انصاری کے 3000 سے زائد حوالہ جات ہیں اور وہ ایچ انڈیکس 33 کے حامل ہیں۔ وہ میٹرک اسپیسز (نروسا) کے مصنف اور جنرلائزڈ کونولیسنٹی اینڈ نان اسموتھ ویریئشنل ان اکولیٹیز (ٹیلر اینڈ فرانس، سی آر سی پریس) کے شریک مصنف ہیں۔ معروف عالمی سائنسی اشاعتی اداروں جیسے کہ اسپرنگر، ٹیلر اینڈ فرانس، ایلزویئر وغیرہ نے ان کی کتابیں شائع کی ہیں۔ وہ جرنل آف آپٹیمائزیشن

تھیوری اینڈ اپی کیشنز، فکیڈ پوائنٹ تھیوری اینڈ ایپلی کیشنز، کارپیتھین جرنل آف میتھمیٹکس، فکسڈ پوائنٹ تھیوری (رومانیہ) کے ایسوسی ایٹ ایڈیٹر اور بین الاقوامی شہرت یافتہ جرائد جیسے کہ پوزیٹوٹی، جرنل آف گلوبل آپٹیمائزیشن، اپلیکیبل انالیسز اور جرنل آف فکسڈ پوائنٹ تھیوری کے گیسٹ ایڈیٹر ہیں۔ پروفیسر انصاری کے بین الاقوامی شہرت یافتہ جریدوں میں 200 سے زائد تحقیقی مقالے شائع ہوئے ہیں۔فیکلٹی آف سائنسز، لائف سائنسز، انٹروپلرزی بائیکنالوجی یونٹ، انجینئرنگ وٹکنالوجی اور میڈیسن کے زمرے میں 'ینگ ریسرچرز ایوارڈ' حاصل کرنے والے ڈاکٹر محمد زین خان اور ڈاکٹر محمد طارق نے تحقیق وتدریس میں اعلیٰ ترین کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے۔ ایرامس منڈی فیلو ڈاکٹر محمد زین نے ڈی اس ٹی فاسٹ ٹریک ینگ سائنسداں اسکیم کے تحت پروجیکٹ سائنسداں کی حیثیت سے کام کیا ہے اور میٹریل سائنس و بایوالیکٹروکیمسٹری کے میدانوں میں قابل قدر خدمات پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر محمد طارق نے وزارت ارتھ سائنسز، حکومت ہند کے تحت نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف اوشین ٹکنالوجی اور رولس رائس کارپوریٹ ریسرچ لیب، سنگاپور میں بطور سائنسداں کام کیا ہے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 17 اکتوبر 2021

رونق جمال

رائے پور: چھتیس گڑھ صوبے کی تشکیل کی اکیسویں سالگرہ کے موقعے پر اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے کام

کرنے، اپنی تخلیقات کے ذریعے صوبے کے نام کو بیرونی ممالک تک پہنچانے اور بچوں کے لیے نئی صنف 'بچکانچہ' ایجاد کرنے کے لیے صوبے کے مایہ ناز قلمکار رونق جمال کو حاجی حسن علی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس ایوارڈ میں چھتیس گڑھ صوبے کا نشان، سند، شال اور دو لاکھ روپے کا چیک رونق جمال کو صوبے کی گورنر محترمہ ان سوئیا اُکیے اور صوبے کے وزیر اعلیٰ جناب بھوپیش بگھیل کے ہاتھوں پیش کیا گیا۔

پریس ریلیز: سلطان اختر، 3 نومبر 2021

ڈاکٹر عالیہ

نئی دھلی: فوکس کلیوز پرائیویٹ لمیٹڈ کے زیر اہتمام انڈیا پرائم ایوارڈ 2021 کے بہترین 100 محققین میں سے اردو ریسرچر ڈاکٹر عالیہ، اڈیٹوریل اسسٹنٹ اردو، این سی ای آر ٹی، دہلی کا انتخاب کیا گیا ہے۔ قابل ذکر ہے کہ فوکس کلیوز انڈیا پرائم ایوارڈ ہر سال قومی سطح پر 100 ریسرچرز کا انتخاب کرتا ہے۔ رواں سال بہترین سو ریسرچرز میں ڈاکٹر عالیہ کا انتخاب ہوا ہے جو تمام اردو ریسرچرز کے لیے باعث مسرت ہے۔ ڈاکٹر عالیہ نے شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے، انھوں نے قومی اور بین الاقوامی سطح پر کئی تحقیقی وتنقیدی مقالے پیش کیے اور اردو ادب کے مختلف موضوعات پر ان کے تحقیقی وتنقیدی مضامین اردو کے موقر جرائد میں شائع ہوچکے ہیں۔ ڈاکٹر عالیہ کی دو کتابیں 'انشراح' اور 'گرد میں اَٹے آئینے' (مرتب شدہ) منظر عام پر آچکی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 4 نومبر 2021

فلمی شخصیات قومی اعزازات سے سرفراز

نئی دھلی: معروف اداکار رجنی کانت کو سنیما کے شعبے میں ان کے غیرمعمولی تعاون کے لیے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔ نائب صدر ایم وینکیا نائیڈو اور وزیر اطلاعات ونشریات انوراگ ٹھاکر نے یہاں اداکار رجنی کانت کو 67 ویں نیشنل فلم ایوارڈز 2019 کی تقریب میں سنیما کی دنیا کے اعلیٰ ترین اعزاز سے نوازا۔ بہترین اداکارہ کا نیشنل فلم ایوارڈ کنگنا رناوت کو ان کی فلم 'منی کرنیکا' اور 'پنگا' کے لیے دیا گیا، وہیں منوج واجپئی کو ان کی فلم 'بھوسلے' کے لیے اور دھنش کو ان کی فلم 'آسورن' کے لیے بہترین اداکار کا نیشنل فلم ایوارڈ دیا گیا۔ بہترین ہندی فلم کا ایوارڈ مرحوم سوشانت سنگھ راجپوت کی فلم 'چھچھورے' کو دیا گیا۔ نان فیچر فلم کے زمرے میں بہترین فلم کا ایوارڈ 'این انجینئرڈ ڈریم' کو ملا۔ 'اسپیشل مینشن' ایوارڈ چار فلموں بریانی، جوناکی پوربا (آسامی)، لتا بھگوان کارے (مراٹھی)، پکاسو (مراٹھی) کو ملا ہے۔ 2019 کی 'موسٹ فلم فرینڈلی اسٹیٹ' کیٹیگری میں 13 ریاستوں نے حصہ لیا تھا، یہ ایوارڈ سکم کو ملا ہے۔ بہترین سوانح عمری فلم کا ایوارڈ سواتی پانڈے کی ہدایت کاری میں بننے والی فلم 'ایلیفینٹ ڈو ریممبر' نے جیتا ہے۔ جنوبی ہند کی فلموں کے اداکار وجے سیتو پتی کو بیسٹ سپورٹنگ ایکٹر کے زمرے میں ان کی تامل فلم 'سپر ڈیلکس' کے لیے ایوارڈ دیا گیا، وہیں ہندی فلم 'دی تاشقند فائلز' میں شاندار کردار نبھانے کے لیے بیسٹ سپورٹنگ ایکٹریس کے زمرے میں پلوی جوشی کو نیشنل فلم ایوارڈ سے نوازا گیا۔ پدم وبھوشن رجنی کانت نے اپنے داماد دھنش کے ساتھ تقریب میں شرکت کی۔ ان کی اہلیہ لتا اور ان کی بیٹی ایشوریہ بھی وہاں موجود تھیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 26 اکتوبر 2021

رسم اجرا

دیوانِ غالب: بعنوان صریر خامہ

نئی دھلی: ترجمہ ایک مشکل کام ہے لیکن یہ نہ ہوتا تو دنیا کے علوم سے لوگوں کی واقفیت نہ ہوتی۔ یوں تو کسی بھی زبان کا ترجمہ کرنا ہی ایک سخت ترین عمل ہے اور اس میں بھی غزل اور غزل میں بھی غالب کی غزلوں کا ترجمہ کرنا ایک ناممکن عمل تھا جس کو سابق لیفٹیننٹ گورنر نجیب جنگ نے پورا کر دکھایا ہے۔ ان خیالات کا اظہار جامعہ ملیہ اسلامیہ شعبۂ اردو کے سابق صدر اور دہلی اردو اکادمی سابق وائس چیئرمین ڈاکٹر خالد محمود نے ریختہ فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام منعقد تقریب کے دوران کیا۔ نجیب جنگ کے ذریعے اردو اور فارسی زبان کے معروف شاعر مرزا اسداللہ خان غالب کی غزلوں کے انگریزی ترجمہ 'دیوان غالب بعنوان صریر خامہ' کی رسم اجرا کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے ڈاکٹر خالد محمود نے سابق ایل جی نجیب جنگ کی انتھک کوششوں اور غالب سے ان کی وابستگی پر مفصل روشنی ڈالی۔ ریختہ کے بانی سنجیو صراف نے کہا کہ یہ سابق ایل جی نجیب جنگ کی 12 سالہ انتھک لگن اور محنت کا نتیجہ ہے جو آج آپ کے ہاتھوں میں انگریزی زبان میں 'دیوان غالب بعنوان صریر خامہ' موجود ہے۔ اپنے ترجمہ کے تعلق سے نجیب جنگ نے مفصل گفتگو کی جس میں بتایا کہ ڈاکٹر خالد محمود کی کوششوں کے سبب انھیں غالب کو سمجھنے کا موقع حاصل ہوا۔ انھوں نے کہا کہ ان کے ساتھ غالب کے ہر شعر پر سیر حاصل گفتگو کی گئی۔ انھوں نے سنجیو صراف کا بھی شکریہ ادا کیا اور بتایا کہ کس طرح انھوں نے اس اہم ترین ترجمے کو شائع کرنے کی ذمہ داری قبول کی۔ پون کے ورما نے کہا کہ نجیب جنگ نے جو کام کیا ہے وہ اس کوشش کا ایک حصہ ہے کہ غالب کو دیگر لوگوں تک پہنچاتا ہے۔ فلم میکر اور رائٹر، داستان گو محمود فاروقی نے اپنی گفتگو نجیب جنگ کے انگریزی ترجمہ پر کی اور کتاب کے تعلق سے بہت سے حوالے پیش کیے۔ تقریب کی نظامت نوجوان شاعر اظہر اقبال نے کی۔ اس تقریب پر پدم شری پروفیسر اختر الواسع، ڈاکٹر شہزادانجم، ڈاکٹر خالد مبشر، اشوک واجپائی، سینئر صحافی شاہد صدیقی، آئی پی ایس اے جے چودھری، پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی کے علاوہ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستہ اہم علمی شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2021

خان بہادر مولوی سید زین العابدین اور علی گڑھ تحریک

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ دینیات کے اسسٹنٹ پروفیسر ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی کی کتاب 'خان

بہادر مولوی سید زین العابدین اور علی گڑھ تحریک' کا اجرا شیخ الجامعہ پروفیسر طارق منصور کے بدست انجام پایا۔ وائس چانسلر پروفیسر طارق منصور کی جانب سے صدارتی خطبہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے خزانچی پدم شری پروفیسر حکیم سید ظل الرحمٰن نے پیش کیا اور کہا کہ سر سید احمد خان سے وابستہ جو افراد ہیں ان پر بہت کام ہو چکا ہے اور ان سے متعلق مضامین بھی ہیں اور کتب بھی لیکن مولوی زین العابدین کی شخصیت پر یا علی گڑھ تحریک سے متعلق جوان کی خدمات ہیں اس پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا۔ ڈاکٹر ریحان قاسمی کا سید زین العابدین جیسی شخصیت پر کام کرنا قابل صد مبارک باد ہے۔ پروفیسر صغیر افراہیم نے اپنے خطاب میں بتایا کہ سرسید کے ایک رفیق جن سے سرسید سب سے زیادہ بے تکلف رہتے تھے، وہ سید زین العابدین ہیں، یہ سرسید احمد خان کے خاص رفقا میں تھے۔ سرسید اور زین العابدین کی بیگم ایک ہی جگہ مدفون ہیں اور سرسید احمد خان و سید زین العابدین بھی ایک ہی احاطہ میں مدفون ہیں۔ پروفیسر سعود عالم قاسمی نے کہا کہ مولوی زین العابدین کو مچھلی شہر کا حاکم کہیے یا رئیس ان کے پاس جو بھی جائیداد تھی اسے بیچ کر محمڈن اینگلو اورینٹل کالج کے نام وقف کردی۔ انھوں نے کہا کہ وہ عظیم کردار کے مالک تھے، جنھوں نے علی گڑھ تحریک کو استحکام بخشا۔ پروفیسر سید محمد ہاشم ڈائرکٹر اردو اکیڈمی وفکر و نظر کے ایڈیٹر نے کہا کہ مولوی سید زین العابدین نے سرسید احمد خان کی طرح قانون کی تعلیم حاصل کی تھی۔ آپ کے خاندان میں سے آپ کے آبا و اجداد مغلیہ خاندان کے اتالیق مقرر ہوئے تھے، آپ سرسید کی خواہش پر علی گڑھ تشریف لائے اور ہر کام میں سرسید کے مشیر خاص ہوئے۔ کتاب کے مصنف ڈاکٹر ریحان اختر قاسمی نے بتایا کہ مولوی سید زین العابدین 14 جون 1832 کو مچھلی شہر کے محلہ قاضیان میں زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سرسید کے مشن سے حد درجہ محبت رکھتے تھے۔ انھوں نے موروثی زمین فروخت کرکے ایک حصہ یونیورسٹی کو چندہ میں دے دیا اور یونیورسٹی میں ایک بنگلہ خریدا جس کا نام تار والا بنگلہ ہے۔ بعد میں اس بنگلے کو بھی یونیورسٹی کے حوالے کردیا۔ اس موقعے پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے اکثر شعبوں کے اساتذہ، طلبا و طالبات کے علاوہ ادب سے جڑی سرکردہ شخصیات نے شرکت کی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 17 اکتوبر 2021

تنویر اجمل کی نئی غزل البم

دیوبند: ادبی تنظیم جہان ادب اکیڈمی اور انڈین اسٹار کلب کے چیئرمین شاعر تنویر اجمل کی غزل کی نئی ویڈیو کیسٹ البم کا اجرا محلہ خانقاہ میں کمل دیوبندی کی رہائش

گاہ پر عمل میں آیا۔ پروگرام کی صدارت جامعہ طبیہ دیوبند کے سکریٹری ڈاکٹر انور سعید نے کی اور نظامت کمل دیوبندی نے کی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر انور سعید نے کہا کہ یہ خوشی کی بات ہے کہ دیوبند کی نوجوان نسل کے شاعر، ادیب اور کوی قومی سطح پر اپنی پہچان بنا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ شاعر تنویر اجمل کی یہ ویڈیو کیسٹ جس میں ان کی غزل کو پیش کیا گیا ہے۔ ادب کا ایک نیا باب ہے اور وہ اس کے لیے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس موقعے پر شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے کہا کہ لگاتار کوشش کرنے سے یقینی طور پر کامیابی ملتی ہے۔ تنویر اجمل گزشتہ پندرہ بیس سالوں سے اردو ہندی زبانوں میں نہ صرف ادبی ماحول کو زندہ رکھے ہوئے ہیں بلکہ انھوں نے یہاں کے ادبی ماحول کو زندہ رکھنے میں اہم کردار ادا کیا ہے، جس کے لیے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 18 اکتوبر 2021

ادبی نشیمن

لکھنؤ: رسالہ ادبی نشیمن کے خصوصی شمارہ خراج عقیدت نمبر کا اجرا اتر پردیش اردو اکادمی میں اکادمی کے چیئرمین چودھری کیف الوریٰ اور سکریٹری زہیر بن صغیر کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر مدیر رسالہ ڈاکٹر سلیم احمد اور شاہد حبیب فلاحی بھی موجود تھے۔ معلوم ہو کہ سہ ماہی ادبی نشیمن کی اشاعت کو چار سال مکمل ہو چکے ہیں۔ اس دوران کئی اہم شخصیات پر خصوصی نمبر بھی شائع ہوئے۔ بہت کم مدت میں ادبی حلقہ میں اپنی شناخت بنانے میں یہ رسالہ کامیاب رہا۔ جس آب و تاب اور جذبے کے ساتھ یہ رسالہ شائع ہو رہا ہے اس سے نہ صرف لکھنؤ بلکہ پورے ملک میں اس کی پذیرائی ہو رہی ہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اکتوبر 2021

احوال و آثار

سیتاپور: جامعہ علوم القرآن موضع ست پورہ میں ہندوستان کے مرکزی اداروں کے ذمہ داران و اکابر علما کی موجودگی میں سوانح مفتی عبدالقیوم رائپوری بنام 'احوال و آثار' کا اجرا عمل میں آیا، پروگرام کی صدارت مولانا محمد ہاشم قاسمی نے کی۔ جب کہ نظامت کے فرائض مولانا سلیم احمد قاسمی نے انجام دیے۔ اس موقعے پر جامعہ مظاہر علوم کے استاذ حدیث مولانا محمد ثار نے کہا کہ کتاب میں انمٹ نقوش ہوتے ہیں جو دائمی ہوتے ہیں۔ تقریر و خطابت سے وقتی فائدہ ہوتا ہے مگر کتاب سے دائمی فائدہ ہوتا ہے، قابل مبارکباد ہیں مولانا محمد سلیم مظاہری جنھوں نے مفتی عبدالقیوم رائپوری جیسی عظیم شخصیت کے احوال و آثار کو کتابی شکل دے کر ان کے کردار و عمل کو ہمیشہ کے لیے زندہ کردیا۔ مولانا محمد جمیل قاسمی مہتمم شمس العلوم نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ کتاب مفتی عبدالقیوم رائپوری کے حالات پر ایک بیش بہا نعمت ہے۔ دارالعلوم زکریا کے مہتمم مولانا شریف احمد خانصاحب نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ خانقاہ رائپور کا فیض واسطہ بلاواسطہ پوری دنیا میں پھیلا ہے۔ یہ اکابر آج بھی اپنی دینی و علمی خدمات اور کردار و عمل کے آئینہ میں زندہ ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 12 اکتوبر 2021

تخیلات

امروہہ: امروہہ کے استاد مرثیہ خواں سید حسن امام حسن کی کتاب 'تخیلات' کی رونمائی امروہہ کے عزاخانہ علمدار

علی خاں میں عمل میں لائی گئی جہاں ادبی شخصیات کی موجودگی میں کتاب پر تبادلہ خیال کیا گیا۔ مقررین نے کہا کہ حسن امام حسن امروہوی ایک اچھے سوز خواں تو ہیں ہی، ساتھ ہی وہ بہت ہی اچھے اور اصلاحی فکر کے شاعر بھی ہیں۔ استاد حسن امام کی غزلوں کا پہلا مجموعہ تخیلات کے نام سے منظر عام پر آیا ہے۔ گزشتہ روز محلہ گزری کے عزاخانہ علمدار علی میں تخیلات کی رونمائی کی تقریب ہوئی۔ مہاتما گاندھی ڈگری کالج سنبھل کے پرنسپل پروفیسر ڈاکٹر عابد حیدری کے ہاتھوں تخیلات کا اجرا عمل میں آیا۔ اس تقریب میں پروفیسر مصباح احمد صدیقی، پروفیسر ناشر نقوی، پروفیسر حسنین اختر، شان حیدر بے باک، لیاقت امروہوی، نوشہ امروہوی اور چندن نقوی سمیت شہر کی ممتاز ادبی اور سماجی شخصیات موجود تھیں۔ تقریب کی نظامت ڈاکٹر لاڈلے رہبر نے کی۔ ڈاکٹر مبارک امروہوی نے صاحب کتاب حسن امام کو منتخب کلام پیش کیا۔ تقریب کا اہتمام بزم نجی حسن اور بزم صادقین نے مشترکہ طور پر کیا تھا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 21 اکتوبر 2021

نقش بر سنگ

نئی دهلی: اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے زیر اہتمام 'اردو بک ریویو' کے دفتر میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں سینئر صحافی سہیل انجم کی خاکوں کی کتاب 'نقش بر سنگ'

کا اجرا عمل میں آیا۔ تقریب کی صدارت پروفیسر مشتاق احمد (قومی صدر، آل انڈیا یونانی طبی کانگریس) نے کی۔ انھوں نے اپنے خطاب میں کہا کہ سہیل انجم کی یہ کتاب خاکہ نویسی کے سلسلے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے اور یہ بڑی اچھی بات ہے کہ انھوں نے مرحومین کے علاوہ موجودین کی خدمات کو بھی سراہا ہے۔ مہمان خصوصی جناب محمد عاصم رابعہ (ایڈیٹر، ماہنامہ فکر صحت اور سابق ممبر، اترپردیش اقلیتی کمیشن) نے کتاب کی ستائش کرتے ہوئے کہا کہ زبان و ادب اور سماج کی خدمات انجام دینے والوں کی قربانیوں کو یاد کیا جانا چاہیے اور ان کی خدمات کو دنیا کے سامنے پیش کیا جانا چاہیے۔ اس سلسلے میں کتاب 'نقش بر سنگ' قابل ستائش ہے کہ اس میں دونوں باتوں کا لحاظ رکھا گیا ہے اور مرحومین کے ساتھ ساتھ باحیات افراد کی خدمات کو بھی خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے مزید کہ کہ سہیل انجم اپنے عہد کے ممتاز قلمکار ہیں۔ اردو ڈیولپمنٹ آرگنائزیشن کے قومی صدر ڈاکٹر سید احمد خاں نے کہا کہ سہیل انجم نے 'نقش بر سنگ' میں جن چنندہ ہستیوں کو شامل کیا ہے، ان میں مجھ جیسے شخص کو بھی شامل کیا، اس کے لیے میں ان کا شکر گزار ہوں۔ آخر میں حکیم عطاء الرحمٰن اجملی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 اکتوبر 2021

حرف حرف آئینہ، شخصیت اور شاعری تحسین مرادآبادی

مرادآباد: ادبی تنظیم اکھل بھارتیہ ادب پریشد کی جانب سے جشن ونے ساگر جیسوال اور سرفراز حسین فراز کی دو کتابوں 'حرف حرف آئینہ' اور 'شخصیت اور شاعری تحسین مرادآبادی' کی رسم اجرا اور اعزازی تقریب کا انعقاد ضلع کے پیپل سانہ میں کیا گیا۔ پروگرام کی صدارت معروف شاعر فاروق بجنوری نے کی اور نظامت کے فرائض سرفراز حسین فراز نے انجام دیے۔ مہمان خصوصی کے طور پر درد دہلوی اور بطور مہمان ذی وقار ایم ایل گرگ نے شرکت کی۔ اس دوران اعظم براق پیپل سانوی، شاعر مرادآبادی، رضوانہ نرگس، شبنم کشیپ کو ونے ساگر جیسوال اعزاز سے نوازا گیا۔ اس کے علاوہ 17 دیگر ادیبوں کو بھی اعزاز سے نوازا گیا۔ پروگرام کا آغاز سرفراز حسین فراز کی نعت پاک سے ہوا۔ تقریب میں تمام شعرا نے اپنا کلام پیش کیا۔ آخر میں تنظیم کے جنرل سکریٹری سرفراز حسین فراز نے کلمات تشکر کہے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 25 اکتوبر 2021

تحریک آزادی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ

نئی دهلی: جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبۂ اردو کے استاد ڈاکٹر سرور الہدیٰ کی کتاب 'تحریک آزادی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ: شفیق الرحمٰن قدوائی کے خطوط اور مضامین' کا اجرا پروفیسر نجمہ اختر، وائس چانسلر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے ہاتھوں ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری میں ہوا۔ اس پروگرام کی صدارت جناب شاہد مہدی، سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ اسلامیہ نے کی جب کہ پروگرام میں پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر ناظم حسین جعفری، رجسٹرار جامعہ، پروفیسر مہتاب حسین، پروفیسر وسیم احمد، پروفیسر صبیحہ انجم زیدی اور بڑی تعداد میں جامعہ کے اساتذہ نے شرکت کی۔ اس موقعے پر صدر شعبہ پروفیسر شہزاد انجم نے خوشی کا اظہار کیا اور کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ میں بھی اس یادگار پروگرام میں شامل رہا۔ میں ڈاکٹر سرور الہدیٰ کو اس وقیع، علمی و تحقیقی کام کے لیے بہت بہت مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 اکتوبر 2021

حسن الوصایا

دیوبند: دارالعلوم دیوبند کے سابق صدر القراء اور رکن رابطہ عالم اسلامی قاری ابوالحسن اعظمی کی نئی کتاب 'حسن الوصایا' کا اجرا عیدگاہ روڈ پر واقع معہد العلمی الاسلامی میں منعقدہ پروگرام میں کیا گیا۔ اس موقعے پر دارالعلوم وقف کے استاذ اور معروف ادیب مولانا نسیم اختر شاہ قیصر نے اپنے خطاب میں کہا کہ مولانا قاری ابوالحسن اعظمی متعدد کتابوں کے مصنف ہیں۔ انھوں نے دیگر موضوعات کے علاوہ فن تجوید کے واقعات پر جتنی کتابیں لکھی ہیں، ان کا شمار بھی مشکل ہے۔ آج ان کی نئی کتاب 'حسن الوصایا' کا اجرا ہوا۔ یہ کتاب گوکہ چند صفحات پر مشتمل ہے مگر بے حد کارآمد ہے۔ اس موقعے پر قاری ارشاد، مولانا مقیم الدین حافظ عمر الٰہی، عبدالرحمٰن سیف، مولانا عبدالسلام قاسمی وغیرہ موجود رہے۔ پروگرام کا اختتام قاری ابوالحسن اعظمی کی دعا پر ہوا۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 2 نومبر 2021

الکتاب فی تشریح بطن

دیوبند: جامعہ طبیہ دیوبند کے سابق پرنسپل اور اسٹیٹ یونانی میڈیکل کالج پریاگ راج کے شعبۂ تشریح کے صدر و پروفیسر انیس احمد انصاری کی چھٹی کتاب 'الکتاب فی تشریح بطن' کا اجرا کالج کے آڈیٹوریم میں ڈائرکٹر یونانی طبی خدمات اترپردیش ڈاکٹر سکندر حیات صدیقی کے ہاتھوں عمل میں آیا۔ اس موقعے پر ڈاکٹر سکندر حیات صدیقی نے اپنے خطاب میں کہا کہ پروفیسر انیس احمد انصاری مضمون تشریح پر وسیع مطالعہ اور گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے طویل تدریسی، تجربہ اور مطالعہ کا نچوڑ اپنی اس کتاب میں پیش کیا ہے جو نہایت واضح اور جامع ہے۔ ڈاکٹر انیس نے تالیف و تصنیف کا محققانہ انداز تحریر اردو، انگریزی، مترادف اصطلاحات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ پروگرام کے مہمان خصوصی پروفیسر ڈی سی لال نے اپنے خطاب میں کہا کہ میں نے کتاب میں دیے گئے خاکوں اور تمام عنوانات کو بغور دیکھا، تشریح کی اطلاقی اور سطحی تشریح جو اکثر کتابوں میں ناپید ہے، اس کتاب کا اہم حصہ ہے۔ کالج کے پرنسپل پروفیسر انوار احمد نے کہا کہ یقیناً یہ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ثابت ہوگی۔ آخر میں کتاب کے مصنف پروفیسر انیس احمد انصاری نے سبھی مہمانوں کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ انھیں خوشی ہے کہ آج میری اس کتاب کی رسم اجرا ہوئی ہے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 4 نومبر 2021

’کامیابی کی منزلیں‘ اور ’اڑان‘

مالیگاؤں: انٹرنیشنل افسانچہ فاؤنڈیشن، مالیگاؤں اور دی چلڈرنس بک ورلڈ انڈیا کے زیر اہتمام شہر مالیگاؤں

میں، 17 اکتوبر 2021 بروز اتوار صبح 11 بجے ڈاکٹر مخشب مسعود کے بنگلے پر ڈاکٹر عبدالعزیز عرفان صاحب اورنگ آباد کے اعزاز میں محفل افسانچہ اور دو اہم کتابیں کامیابی کی منزلیں اور بزم اطفال اور تبسم شیخ صاحبہ کی کتاب ’اڑان‘ کا اجرا عمل میں آیا۔ اس تقریب کی نظامت کے فرائض جناب احمد ایوبی نے انجام دیے اور صدارت محترم جناب خیال انصاری صاحب نے کی۔

چیئرمین انٹرنیشنل افسانچہ فاؤنڈیشن ڈاکٹر مخشب نے مہمانان اور صاحب اعزاز کا منفرد اور دلکش لہجے میں خوبصورت انداز میں تعارف پیش کیا۔ اس موقعے پر جناب سلیم رحمانی، جناب یعقوب ابن مرتضیٰ، جناب اشفاق عمر، جناب سعید پرویز، ڈاکٹر پروفیسر ذاکر خان ذاکر، شمس الضحیٰ اسرائیل، احمد نعیم، ارشد مجوی اور عبدالوہاب نے اظہار خیال کیا۔

حاجی رئیس ستارہ صاحب، ڈاکٹر رفیق شاہ، آصف اقبال مرزا صاحب، احمد نعیم، خالد قریشی صاحب اور ڈاکٹر مخشب مسعود نے افسانچے سنا کر محفل سے خوب داد و تحسین وصول کی۔ آخر میں عبدالعزیز عرفان صاحب نے بھی اپنے چند تازہ افسانچے پیش کیے۔ صدر مجلس جناب خیال انصاری نے خطبۂ صدارت پیش کرتے ہوئے اپنے زریں خیالات کا اظہار کیا۔ صاحب اعزاز کی خدمت میں شال ٹوپی اور گلدستہ پیش کیا گیا۔

رپورٹ: عبدالعزیز عرفان، اورنگ آباد، 24 اکتوبر 2021

عجیب و غریب سچے افسانے

کُرلا: بزم اقبال، قریش نگر، کُرلا (مشرق) ممبئی کے زیر اہتمام 10 اکتوبر 2021 ایک یادگار تقریب اجرا منعقد ہوئی جس میں حمید ادیبی ناندوری کی نئی تخلیق ’عجیب و غریب سچے افسانے‘ کی رسم اجرا بدست جناب سرفراز آرزو صاحب، مالک و مدیر روزنامہ ہندوستان ممبئی انجام پائی۔ مذکورہ نشست کی صدارت جناب محمد سلیم قریشی جنرل سکریٹری بزم اقبال نے فرمائی۔ اس نشست میں مہمانِ خصوصی کی حیثیت سے جناب قاسم امام صاحب نے شرکت کی۔ نظامت کے فرائض مشہور و معروف ادیب جناب اشتیاق سعید نے بحسن وخوبی انجام دیے۔

نشست کی کارروائی جناب جعفر بھائی کی نعت گوئی سے شروع ہوئی، سب سے پہلے بزم اقبال کی طرف سے بطور عزت افزائی جناب سرفراز آرزو، جناب قاسم امام اور حمید ادیبی ناندوری کی گلپوشی کی گئی اور تینوں صاحبان کو ایک ایک قیمتی شال سے نوازا گیا۔ اس نشست میں جناب حمید ادیبی ناندوروی، جناب سرفراز آرزو، جناب جعفر بھائی، جناب عارف اعظمی، جناب حنیف قمر، جناب اشتیاق سعید، جناب عبدالباری اور اراکین بزم اقبال موجود تھے۔ یہ پرسکون اور یادگار نشست شکریہ کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی۔

رپورٹ: حمید ادیبی ناندوروی، کرلا، ممبئی، 13 اکتوبر 2021

وفیات

پروفیسر ڈاکٹر احسان الرحمٰن

نئی دہلی: جواہر لال نہرو یونیورسٹی میں مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات کے سابق صدر، کئی کتابوں کے

مصنف اور مشہور مترجم پروفیسر ڈاکٹر احسان الرحمٰن کا حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے 17 اکتوبر کو پارک اسپتال، گروگرام میں انتقال ہوگیا۔ انتقال کی خبر سنتے ہی ملک بھر کی یونیورسٹیوں و کالجوں میں پھیلے ہوئے ان کے سیکڑوں شاگردوں میں غم کی لہر دوڑ گئی اور ہندوستان کا عربی حلقہ سوگوار ہوگیا، پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو صاحب زادیاں اور نواسے و نواسیاں ہیں۔ ان کی نماز جنازہ دہلی گیٹ قبرستان میں ادا کی گئی اور وہیں اپنی والدہ کے جوار میں مدفون ہوئے۔ وہ جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے مرکز برائے عربی و افریقی مطالعات میں بطور لیکچرر مقرر ہوئے۔ ہمہ جہت عربی خدمات کے اعتراف میں ان کو صدر جمہوریہ ایوارڈ بھی دیا گیا۔ ان کے شاگرد شعبہ عربی جے این یو کے سابق صدر پروفیسر ڈاکٹر مجیب الرحمٰن نے کہا کہ وہ ایک مثالی استاد تھے، تدریس کے علاوہ دیگر کاموں کو وہ ثانوی درجہ دیتے تھے، مدرسہ بیک گراؤنڈ کے نہ ہوتے ہوئے بھی انھوں نے عربی زبان میں اپنی منفرد شناخت بنائی تھی، ان کے شاگرد پروفیسر رضوان الرحمٰن صدر شعبہ عربی جے این یو نے کہا کہ آپ ایک اعلیٰ کردار و اخلاق کے حامل انسان تھے۔ ان کے شاگرد شعبہ عربی، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے سابق صدر پروفیسر حبیب اللہ خاں نے کہا کہ آپ نہایت سنجیدہ اور سلجھے ہوئے انسان تھے، اپنے موضوع کے تئیں بہت ایمانداری، اور مخلص تھے۔ نماز جنازہ میں دہلی یونیورسٹی کے سابق پروفیسر ڈاکٹر نعمان خان، جامعہ ملیہ اسلامیہ، شعبہ عربی کے استاد ڈاکٹر نسیم اختر ندوی، محفوظ الرحمٰن، جے این یو کے اساتذہ ڈاکٹر محمد قطب الدین، ڈاکٹر عبیدالرحمٰن طیب، ڈاکٹر محمد اجمل، ڈاکٹر اکرم نواز، ڈاکٹر محمد اختر کے علاوہ کثیر تعداد میں اساتذہ، طلبہ اور ریسرچ اسکالرس شامل تھے۔

روزنامہ ’انقلاب‘ دہلی، 18 اکتوبر 2021

سلطان محمد خاں

رامپور: محمد علی جوہر یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ادبی شخصیت سلطان محمد خاں کا دہلی میں زیر علاج رہتے ہوئے 27 اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ کچھ ماہ سے مرحوم سخت علیل تھے

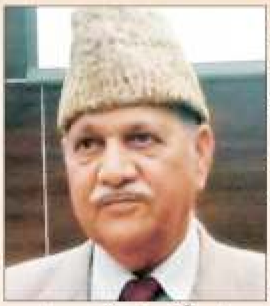

اور کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔ گزشتہ دن ان کا دہلی میں آپریشن ہوا تھا مگر 27 اکتوبر کو روح اچانک پرواز کرگئی۔ محمد علی جوہر یونیورسٹی کے صدر شعبۂ انگریزی ڈاکٹر عبدالوہاب سخن نے وائس چانسلر سلطان محمد خاں کے سانحہ ارتحال پر تعزیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ نہایت متحرک اور فعال شخصیت تھے اور بے پناہ انتظامی صلاحیتوں کے حامل تھے۔

روزنامہ ’ہمارا سماج‘ دہلی، 28 اکتوبر 2021

حافظ جلیل احمد

سہارنپور: قصبہ بہٹ کی معروف علمی شخصیت اور ماہر اقبالیات حافظ جلیل احمد کو سیکڑوں افراد نے نم آنکھوں سے سپرد خاک کیا۔ وہ اپنے وقت کے مشہور بزرگ اور مجاہد آزادی حافظ رفیق احمد کے فرزند تھے۔ 18 اکتوبر کو ان کے جسد خاکی کو ان کے والد کی قبر کے پاس ہی دفن کردیا گیا۔ خراب موسم اور مسلسل بارش کے باوجود ان کی نماز جنازہ میں سیکڑوں افراد نے شرکت کی۔ ان کی عمر 82 سال تھی۔ ان کے صاحب زادے راشد احمد نے بتایا کہ وہ ایک طویل عرصے سے علیل تھے اور ان کے پھیپھڑوں

نے کام کرنا بند کر دیا تھا۔ انھیں دل کا بھی عارضہ لاحق تھا۔ مرحوم روزنامہ 'انقلاب' کے ایڈیٹر (نارتھ) وودود ساجد کے حقیقی ماموں تھے۔ اسلامی تاریخ کا گہرا مطالعہ رکھتے تھے۔ علالت کے باوجود انھوں نے اپنا علمی مشغلہ اور مطالعہ جاری رکھا۔ ان کے علم اور تاریخی مطالعہ سے ایک خلق فیضیاب ہوئی۔ وہ ماہر اقبالیات بھی تھے اور انھوں نے درجنوں شاگردوں کو اقبال کے کلام کے بہت سے رموز سمجھائے۔ وہ ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار تھے۔ قصبہ بہٹ کے علمی حلقوں میں بھی انھیں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہ انتہائی سادہ، منکسر المزاج اور اصولوں کے پابند انسان تھے۔ قصبہ بہٹ کے سابق چیئرمین شاہ محمود حسن سمیت بہت سی ممتاز شخصیات نے ان کی رحلت پر گہرے دکھ کا اظہار کیا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 19 اکتوبر 2021

مولانا حفظ الرحمٰن ندوی

نئی دهلی: دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے مایہ ناز استاد اور کئی زبانوں پر یکساں مہارت رکھنے والے مولانا حفظ الرحمٰن ندوی کا 15 اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ مولانا مرحوم بہت دنوں سے بیمار تھے۔ وہ الشفا ابوالفضل میں زیر علاج تھے۔ ان کے سانحہ ارتحال پر علمی دنیا سوگوار ہے۔ مسلم پرسنل بورڈ کے صدر اور دارالعلوم ندوۃ العلما لکھنؤ کے ناظم مولانا سید رابع حسنی ندوی نے اپنے ایک مکتوب میں کہا کہ مرحوم کی زندگی بڑی زاہدانہ تھی۔ ان کی استعداد ایسی تھی کہ وہ بڑی سے بڑی ملازمت کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے دنیا نہیں دیکھی، دین دیکھا اور دین کے لیے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ ان کے تربیت یافتہ بہت سے علما و فضلا علم دین کی خدمت میں مصروف ہیں۔ مولانا ساجد حسین ندوی، اسسٹنٹ

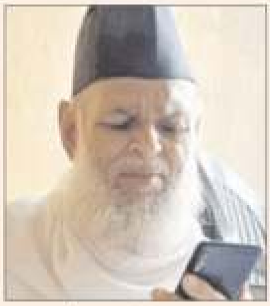

پروفیسر دی نیو کالج چنئی اور انٹرنیشنل انسٹی ٹیوٹ آف تھیالوجی ہریانہ کے ممبر نے کہا کہ مولانا مرحوم ایک باکمال استاد اور مختلف علوم وفنون کے ماہر تھے۔ آپ کو تقریباً پانچ زبانوں اردو، عربی، انگریزی، سنسکرت، فرانسیسی وغیرہ پر مہارت حاصل تھی۔ متعدد طلبا نے آپ کی تربیت میں ان زبانوں میں استعداد پیدا کی اور ترجمہ نگاری کے میدان میں مہارت حاصل کی۔ ان کے علاوہ تسخیر فاؤنڈیشن دہلی کے جنرل سکریٹری مسٹر گلاب ربانی نے کہا کہ مولانا مرحوم ندوہ اور دیوبند کے فیض یافتہ تھے۔ مولانا مرحوم کی علمی حیثیت اور لسانی مہارت اپنی جگہ اہم تھی، تاہم ان کی سادگی اپنے آپ میں بے مثال تھی۔ واضح رہے کہ مولانا کا آبائی وطن سہرسہ بہار ہے۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 16 اکتوبر 2021

محمد اختر خان فلک بڑھاپوری

افضل گڑھ: بجنور ضلع کے مایہ ناز شاعر محمد اختر خان فلک بڑھاپوری کے اس دارفانی سے رخصت ہوجانے پر بڑھاپور کے ساتھ ساتھ پورے ضلع کے ادبی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ محمد اختر خاں فلک بڑھاپوری اپنے ملک کے علاوہ بیرون ملک میں بھی اپنے ضلع بجنور اور اپنے شہر بڑھاپور کا نام تازندگی روشن کرتے رہے۔ بڑھاپور کے مشہور صحافی سماجی کارکن راشد ملک نے بتایا کہ فلک بڑھاپوری جہاں مزاحیہ کلام مشاعروں میں پڑھ کر خوب داد و تحسین حاصل کرتے رہے وہیں سیاسی موضوعات پر بھی انھوں نے بہت سی مزاحیہ نظمیں لکھیں جنھیں عوام میں بہت پذیرائی حاصل ہوئی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' یوپی، 30 اکتوبر 2021

قاضی سید انور حسین میاں

دیوبند: دیوبند کے مشہور و معروف خانوادے میاں صاحب سے تعلق رکھنے والے اور دارالعلوم دیوبند کے سابق استاد قاضی سید انور حسین میاں دیوبندی کا 29 اکتوبر جمعہ سے قبل طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ ان کے انتقال کی خبر سے علمی، ادبی، سماجی اور ملی حلقوں میں غم کی لہر دوڑ گئی، کثیر تعداد میں علمائے کرام اور معززین شہر نے ان کی رہائش گاہ پر پہنچ تعزیت مسنونہ پیش کی اور قاضی سید انور حسین میاں کے انتقال کو شہر کے لیے بڑا خسارہ قرار دیا۔ مرحوم تقریباً 82 سال کے تھے اور گزشتہ تقریباً ایک سال سے علیل تھے۔ مرحوم قاضی سید انور حسین میاں دیوبندی دارالعلوم دیوبند سے سابق ناظم تعلیمات مولانا سید اختر حسین میاں دیوبندی کے صاحب زادے اور رکن شوریٰ مولانا سید انظر حسین میاں دیوبندی کے حقیقی بھائی تھے، وہ گزشتہ ایک مدت سے شہر قاضی کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ مرحوم نے دارالعلوم دیوبند کے شعبۂ حفظ میں بھی بطور استاد قرآن کریم کی خدمت انجام دی۔ ان کے انتقال پر شہر کی سرکردہ شخصیات نے گہرے رنج وغم کا اظہار کیا اور ان کے انتقال کو شہر کا بڑا نقصان قرار دیا۔ پسماندگان میں تین بیٹے اور دو بیٹیاں ہیں۔ نماز جنازہ بعد نماز عشا مدرسہ اصغریہ میں ادا کی گئی۔ آبائی قبرستان میں تدفین عمل میں آئی۔

روزنامہ 'ہمارا سماج' دہلی، 30 اکتوبر 2021

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبان علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ہمایوں نامہ

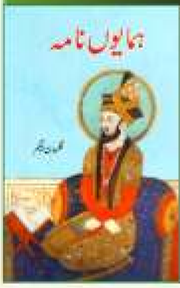

مصنف: گلبدن بیگم

چھٹی اشاعت: 2021

صفحات: 92

قیمت 55 روپے

دامان مریم

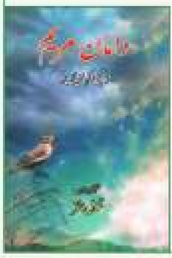

مصنف: محمد حسن، تحقیق وترتیب: جمیل اختر

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 192

قیمت: 160 روپے

اردو۔ہندی لغت

ایڈیٹر: ڈاکٹر روپ کرشن بھٹ

کوآرڈینیٹر: مسرت جہاں

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 416، قیمت: 125 روپے

اردو میں نظم معرا اور آزاد نظم (ابتدا سے 1947 تک)

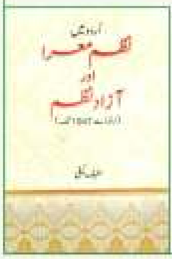

مصنف: حنیف کیفی

چوتھی اشاعت: 2021

صفحات: 580

قیمت 270 روپے

کلیات امور طبعیہ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 288

قیمت: 145 روپے

عوامی ذرائع ابلاغ ترسیل اور تعمیر وترقی

مصنف: دیوندر اسر، مترجم: شاہد پرویز

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 173

قیمت: 105 روپے

تیمارداری

مصنف: حسین فاروقی

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 262

قیمت: 135 روپے

اچھی صحت کا راز

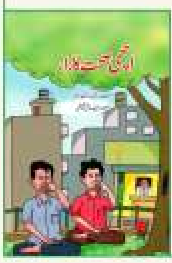

مصنف: فیروز بخت احمد

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 16

قیمت: 20 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail: books@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, दिसम्बर-२०२१,वर्ष:२३, अंक:१२

URDU DUNIYA Monthly, December-2021, Vol.23, Issue:12

National Council for Promotion of Urdu Language

Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99

DL (S) - 01/3394/2020-22

ISSN 2249 - 0639

Date of Publication:**24/11/2021**

Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

Total Pages:100

سوچھ بھارت

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326 ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail : sales@ncpul.in

شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020

And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025

LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6